خالی سیپ
محی الدین نواب

فہرست

خالی سیپ

ایک مظلوم عورت کی آنکھوں کو لہو رُلا دینے والی شرمناک کہانی۔
ایک ہوس کار مرد نے اس کی کوکھ اجاڑ دی تھی۔
وہ ماں بننا چاہتی تھی لیکن دنیا کا کوئی مرد اب اسے ماں نہیں بنا سکتا تھا۔

"میں نے تمہیں طلاق دی۔"

اس کی آواز میں ایسی درشتی تھی جیسے اس نے کچھ کہا نہ ہو' بلکہ منہ بھر کر اس کے منہ پر تھوک دیا ہو۔ نصیبہ ہڑبڑا کر اپنا منہ پونچھنے لگی۔ تھوک نہیں تھا' پسینہ تھا۔ وہ پسینہ پونچھنے کے بعد اپنے شوہر کا منہ دیکھنے لگی۔

وہ طلاقِ رجعی تھی۔ یعنی اس طلاق کے بعد بھی اس کا شوہر اس سے رجوع کر سکتا تھا۔ گویا ابھی رشتے کی زنجیر نہیں ٹوٹی تھی۔ ابھی وہ ایک مرد کی مہربانیوں اور نامہربانیوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے کسی کھائی میں بھی دھکیل سکتا تھا اور اپنی آغوش میں بھی بلا سکتا تھا اور اسے گلے لگا کر اپنے غلط فیصلے پر پچھتا سکتا تھا۔

فیصلہ یہ تھا کہ وہ باپ بننا چاہتا تھا لیکن وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ دونوں طرف سے کوششیں جاری رہیں تو امیدیں پنپتی رہتی ہیں۔ انسان برسوں بنجر زمین پر ہل چلاتا ہے' تب کہیں جا کر امید کی فصل پکتی ہے لیکن وہ سات برس میں ہی تھک ہار کر کہہ چکا تھا۔

"نصیبہ! تم بالکل بنجر ہو۔ انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ شادی کے دوسرے سال سے ہی تم بہلاوے دیتی آرہی ہو۔ آخر کب تک جھوٹی تسلیاں دیتی رہو گی۔ میں اب دوسری شادی کروں گا۔"

اس کی آواز میں ارادے کی پختگی تھی' جسے محسوس کر کے نصیبہ کانپ گئی۔ اس نے احتجاجاً پوچھا۔

"اگر دوسری بھی بنجر نکلی تو؟"

"میں تیسری لے آؤں گا۔"

اور یہ سن کر وہ غصے سے اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ مرد جب فاتح بننے پر آتا ہے تو

دوسری تیسری فتح کرنے کے منصوبے بناتا چلا جاتا ہے۔ اس کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اولاد نہیں ہورہی ہے۔ وہ یہ اعتراض نہیں کرنا چاہتا کہ ہوس کے دسترخوان پر جوانی کی ڈشیں بدلنا چاہتا ہے۔

وہ سرخ چہرے کے ساتھ جھنجلا کر بولی۔ "آپ درجنوں شادیاں کریں' میری بلا سے مگر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنا بھی طبی معائنہ کرائیں۔ کیا بعض مرد بانجھ نہیں ہوتے؟"

وہ کرخت لہجے میں بولا۔ "طبی معائنے کے لئے مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی ماں کو بلاؤ' میں انہیں اپنا فیصلہ سنانا چاہتا ہوں۔"

اس کے چہرے پر چٹانی پہاڑوں کی سی سختی تھی وہ اس پہاڑ کے سامنے ایک دم سے حقیر چیونٹی بن گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات میاں بیوی کی تنہائی سے نکل کر رشتے داروں تک پہنچے۔ اس نے ایک بار بڑی سنجیدگی سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہوئی بولی۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میری خاموشی کی تہہ میں میری ممتا ایک بچے کے لئے نہیں مچلتی ہے۔ میں بہت کوششیں کرتی ہوں۔ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہوں۔ تعویذ گنڈے کرتی ہوں۔ جو میرے اختیار میں ہے' وہ میں کرتی ہوں' جو تمہارے اختیار میں ہے' وہ تم کرتے ہو' میں اپنے وجود کا ایک ایک حصہ تمہارے آگے بچھا دیتی ہوں۔ میں اب بھی تمہارے آگے ہوں تم اتنی جلدی کوئی غلط فیصلہ نہ کرو۔ مجھے تھوڑی مہلت اور دے دو۔ اس بار میرا دل کہتا ہے کہ تمہارا پیار میری کوکھ میں ضرور پھلے گا۔"

وہ ایک نئی اور تازہ بہ تازہ امید کے ساتھ التجا کررہی تھی۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی مایوسی دور کرنا چاہتی تھی اور خود مایوس نہیں تھی' کیونکہ زمین اپنی زرخیزی کو سمجھتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ آج نہیں تو کل اس کی گود میں ایک ننھا سا پھول کھلے گا۔ اس تصور سے ہی اس کے چہرے پر گلاب کھل جاتے اور آنکھوں میں ننھے منے سپنے جھلملانے لگتے تھے۔

اس وقت نصیبہ نے اسے کسی طرح راضی کرلیا کہ وہ طلاق کا خیال دل سے نکال دے۔ اس کے مجازی خدا شاہد نے سرہلا کر ذرا تلخی سے کہا۔

"اچھی بات ہے میں اگلے تین ماہ تک انتظار کروں گا۔ اگر اس دوران تم نے کوئی خوشخبری نہیں سنائی تو پھر اس گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ تم جانتی ہو کہ میری آمدنی محدود ہے۔ میں دو بیویوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکوں گا اور نہ ہی تمہاری مہر کی رقم ادا کرسکوں گا۔ بہتر ہے کہ تم یہ رقم معاف کردو۔ میں بارہا اعتراف کرچکا ہوں کہ تم بہت حسین ہو۔ انسان ہر خوبصورت چیز کو ایک ڈیکوریشن پیس بنا کر اپنے گھر میں رکھتا ہے اور تم تو ایک جیتی جاگتی قیامت جگانے والی ڈیکوریشن پیس ہو۔ جب طلاق کی نوبت آئے گی تو بہت مجبور ہوکر مجھے تمہارا ساتھ چھوڑنا ہوگا۔"

یہ سن کر اس کی راکھ اڑاتی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے بعد وہ حواس باختہ سی رہنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے؟ کس طرح اپنا سہاگ بچائے؟ طلاق کے بعد تو عورت میں ہزار طرح کے عیب لگ جاتے ہیں۔ جو برائیاں اس میں نہیں ہوتیں' وہ بھی اس سے منسوب کردی جاتی ہیں۔ پہلے اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ وہ مہر کی رقم معاف نہیں کرے گی تو اس کے لئے طلاق دینا مشکل ہوجائے گا لیکن طلاق دینا ناممکن تو نہیں ہوگا؟ اس کے جی میں آرہا تھا کہ بعد میں بدنامیاں اٹھانے سے بہتر ہے کہ ابھی کوئی گناہ کرلے اور کہیں سے ایک بچہ اپنی کوکھ میں بھر کرلے آئے اور اس طلاق دینے والے سے فخریہ کہے اور اس سے پوچھے۔

"یہ لو اب تمہارا نام لیوا آرہا ہے۔ یہ تمہارا ہی بچہ ہے۔ اب کیسے طلاق دو گے؟"

مگر ابھی وہ شاہد سے بے ایمانی نہیں کرنا چاہتی تھی اسے سمجھانا چاہتی تھی کہ اس کی ممتا حقیقتاً پیاسی ہے۔ ایک بچے کو سینے سے لگانے کے لئے اس کا دل مچلتا رہتا ہے لیکن زندگی میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں جب ممتا اور پدرانہ محبت خود غرض بن جاتی ہے۔ شاہد اس لئے اولاد چاہتا تھا کہ اس کے بعد کوئی اس کا نام لیوا ہو عام طور سے عورت ممتا کی تسکین کے لئے اور روح کی تشنگی مٹانے کے لئے اولاد کی تمنا کرتی ہے لیکن وہاں بات کچھ اور ہی تھی۔ نصیبہ اپنے سہاگ کو بچانے کے لئے ایک بچے کی آرزو میں تڑپ رہی تھی اور کبھی کبھی شاہد کی تلون مزاجی پر کڑھتی تھی کہ وہ سالن کی طرح جوانی کا ذائقہ بدلنا چاہتا ہے اور اس کے لئے اولاد کو حربہ بنا رہا ہے۔

جب تین ماہ گزر گئے اور وہ بے ثمر رہی تو شاہد کا مزاج ایک دم سے بدل گیا۔

پہلے تو وہ اسے گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکالا کرتا تھا۔ اب بات بات پر مارنے بھی لگا۔ وہ کسی طرح ظلم و تشدد سے اسے مجبور کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے لیکن وہ اس کے ساتھ رہنے کے لئے ایسا ظلم برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئی جسے کوئی عورت کبھی برداشت نہیں کرتی۔ اس نے شاہد کے قدموں پر گر کر کہا۔

"اگر آپ مجھ سے اکتا گئے ہیں' اگر آپ کی نظر میں کوئی مجھ سے اچھی ہے تو آپ اس کے ساتھ وقت گذاریں۔ اسے یہاں لے آیا کریں۔ میں ایک عارضی سوکن کو برداشت کرلوں گی لیکن سوکن کے نام پر مستقل روگ نہیں پالوں گی۔ میں آپ کی خوشی کے لئے یہ کرسکتی ہوں مگر طلاق کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی۔"

اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ رہی تھی۔ اب ایسی کون سی ہوگی' جو جان بوجھ کر اپنے شوہر کو کھلی چھٹی دے دے گی کہ جاؤ میاں دوسری عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤ۔ وہ اپنے سہاگ کا تحفظ کرتی ہوئی ہر صورت سے سمجھوتے پر آمادہ تھی لیکن وہ آمادہ نہ ہوا۔

"تم مجھے دوسری عورتوں سے منہ کالا کرنے اور گناہ گار بننے کا مشورہ دے رہی ہو۔ بہت خوب' اگر میں نے تمہاری بات مان بھی لی تو اولاد کی کمی کیسے پوری ہوگی؟"

"میں رشتے داروں میں سے کسی کا بچہ گود لے لوں گی۔ بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ کسی کا بچہ گود لینے سے اپنی گود بھی ہری ہو جاتی ہے۔"

وہ بڑی بوڑھیوں کا حوالہ دے کر پُرامید نظروں سے اسے تکنے لگی۔ اس نے کہا۔

"پرایا بچہ آخر پرایا ہی ہوگا۔ میری وہ آرزو کہاں سے پوری ہوگی کہ ایک عورت میرے تمام پیار کو سمیٹ کر اپنے بدن میں چھالے اور اس پیار کو ایک ننھے سے وجود میں منتقل کردے۔ دراصل عورت جب ہمارے پیار کا بوجھ اٹھائے چلتی ہے تو وہ بوجھ ہماری مشترکہ محبت کا ایک فخریہ اشتہار ہوتا ہے اور وہ اشتہار دنیا والوں کو بتاتا ہے کہ وہاں جو کچھ ہے' صرف ہمارا ہے کہیں سے مانگ کر لایا نہیں گیا ہے۔"

ایسے وقت میں وہ لاجواب ہو کر اس کا منہ تکتی رہ جاتی تھی۔ پھر دماغ میں سو طرح کے باغیانہ خیالات ابھرنے لگتے تھے۔ وہ چڑ کر سوچتی کہ شاہد میں ہی اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ مجھے ایک بچے کی ماں بنا سکے۔ یہ مرد ہمیشہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے

ہیں کہ وہ عورت سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ کبھی سنجیدگی سے یہ نہیں سوچتے کہ عورت چالاکی پر اتر آئے تو اپنی جھوٹی پارسائی جتا کر بڑی آسانی سے مرد کو بے وقوف بنا سکتی ہے۔ شاہد ساری زندگی اس خوش فہمی میں مبتلا رہے گا کہ میں نے جس بچے کو جنم دیا ہے' وہ اس کا اپنا خون ہے۔

کچھ روز بعد نصیبہ کو حقیقت معلوم ہوئی کہ شاہد کے لئے دوسری شادی کیوں لازمی ہے؟ ایک رات اس نے اپنے ساس سسر کو رازدارانہ انداز میں باتیں کرتے سن لیا۔ اس کی ساس کہہ رہی تھی۔

"لڑکی تو بہت حسین ہے اور بے انتہا دولت مند ہے۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا کہ شاہد کو اپنا داماد بنانے کے بعد پانچ سو روپے کی حقیر سی ملازمت کرنے نہیں دے گا' اسے کاروبار کے لئے پچیس ہزار روپے دے گا۔"

شاہد کے باپ نے کہا۔ "ہم یہ خواب دیکھتے ہی رہ جائیں گے تمہاری یہ بہو تو جونک کی طرح شاہد سے چمٹ گئی ہے' پیچھا چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی۔"

ان کی باتیں سن کر نصیبہ سناٹے میں آگئی۔ چند لمحوں کے لئے وہ اپنے اندر ایک دم سے ویران ہوگئی۔ پھر اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ اولاد کا محض بہانہ ہے' ورنہ دولت کے لئے ایک کو چھوڑ کر دوسری لائی جا رہی ہے۔ اس کے خیالوں میں جہنم دہکنے لگا۔ وہ زہریلے انداز میں بہت کچھ سوچتی رہی کہ سب ہی اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکنے کے لئے بے غیرتی اور بے مروتی سے اس کے خلاف منصوبے بنا رہے ہیں۔ پھر وہ خلافِ تہذیب ایک بچے کی ماں بن کر ان کے منصوبوں کو توڑ کیوں نہیں سکتی؟

کوئی غلط قدم اٹھانے سے پہلے اس نے پھر ایک بار سمجھوتے کی کوشش کی۔ شاہد کو جی بھر کر طعنے دیتے ہوئے اس کے گھر والوں کی سازش کا پول کھول دیا کہ وہ محض ایک دولت مند لڑکی کو بیاہ کر لانے کے لئے اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ عورت کی منہ زوری بھلا کون برداشت کرسکتا ہے۔ شاہد نے اسے بے تحاشہ پیٹنا شروع کردیا۔ ایسے ایسے ہاتھ جمائے کہ اس کی ناک سے اور باچھوں سے خون بہنے لگا۔ بدن کی ہڈیاں یوں چٹخنے لگیں جیسے اب تب میں ٹوٹنے والی ہوں۔

پھر روز کا یہی دستور ہوگیا۔ رات کو سونے سے پہلے اور صبح جاگنے کے بعد وہ

پوچھتا تھا کہ مہر کی رقم معاف کرے گی یا نہیں؟ اس کی ہر نہیں پر اس کے کرارے ہاتھ پڑتے۔ وہ مار مار کر اس کا بھرتہ بنا دیتا کئی بار اس کا منہ سوج گیا' صورت بگڑ کر رہ گئی۔ وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی تو کانپ کر رہ جاتی اسے شادی سے پہلے کے دن یاد آتے' جب کالج کے لڑکے اس کے حسن و جمال کو موضوعِ سخن بنا لیتے تھے اور اس کی ہر ادا پر شعروں کے پھول نچھاور کرتے تھے۔

ایسے وقت ایک رات شاہد تیزاب کی بوتل لے کر آیا اور اس بوتل کو اس کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

"بول' مہر کی رقم معاف کرے گی یا ہمیشہ کے لئے تیرا چہرہ بگاڑ دوں؟ یہ تیزاب ہے۔ اس کے چھینٹے تجھ پر پڑیں گے تو تو میرے بعد کسی دوسرے کے کام کی بھی نہیں رہے گی۔ اپنے حسن اور اپنے شباب کو یہاں سے بچا کر لے جائے گی تو تجھے دوسرے چاہنے والے مل جائیں گے مجھ سے اب رحمدلی کی توقع نہ رکھ............"

وہ تیزاب کی بوتل اور شاہد کا بے رحم چہرہ دیکھ کر تھرا گئی۔ دہشت کے مارے سفید پڑ گئی۔ سات برس کی ازدواجی زندگی میں وہ اپنا بہت کچھ بگاڑ چکی تھی اب ایسے ظالم کے ہاتھوں اپنی صورت بگاڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ جو اس کے حسن اور حسنِ وفاداری کی قدر کرتا ہو' اس سے اب وفاداری کیا کرے گی۔ وہ خوف سے کانپتی ہوئی بولی۔

"ہمارے خاندان کے بزرگ جو فیصلہ کریں گے' میں اسے مان لوں گی۔"

خاندان کے تمام افراد جانتے تھے کہ برسوں سے ان میاں بیوی کے درمیان طلاق کا جھگڑا چل رہا ہے۔ انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ روز روز کی لڑائی سے بہتر ہے کہ طلاق ہو جائے۔ شاہد حق بجانب ہے' اس لئے کہ مرد اولاد کے لئے شادی کرتا ہے۔ جو عورت نسل کو آگے نہ بڑھا سکے' وہ ایک خالی بوتل کی طرح ہے' جو گھر کی چار دیواری سے نکل کر اس سوسائٹی کے کباڑ خانے میں چلی جاتی ہے۔

اس پنچائت میں نصیبہ نے اپنی ماں سے کہلوایا کہ اگر جھگڑا صرف اولاد کے لئے ہے تو اسے ابھی بیک وقت تین طلاقیں نہ دی جائیں۔ ہمارے مذہب میں سمجھوتے کی گنجائش رکھنے کے لئے ایک ماہ کے وقفے سے طلاقیں دی جاتی ہیں۔ ان وقفوں کے دوران کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا

ہوتا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی میں جو کمی ہوتی ہے' وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اس طرح شوہر آخری فیصلہ کن طلاق دینے سے پہلے اپنی بیوی سے رجوع کرتا ہے اور اسے قبول کر لیتا ہے۔

نصیبہ نے اپنی ماں کے ذریعے بڑی معقول بات کہلوائی تھی پنچائت نے یہ فیصلہ کیا کہ دستور کے مطابق ایک ایک ماہ کے وقفے سے طلاقیں دینے کے بجائے تین ماہ کے بعد ایک ہی بار فیصلہ کن طلاق دی جائے گی۔ اس وقت تک وہ بدستور شاہد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے گی۔ اگر اس دوران اس کے ماں بننے کے آثار ظاہر ہوئے تو شاہد اسے پہلے کی طرح باعزت طور پر اپنی بیوی بنا کر رکھے گا اور دوسری شادی کے خیال سے باز آئے گا۔

شاہد نے یہ فیصلہ منظور کر لیا۔ اس نے سوچا' صرف تین ماہ کی بات ہے۔ گھر کی چار دیواری میں کون دیکھنے آتا ہے کہ میں نصیبہ کے ساتھ سوتا ہوں یا نہیں؟ وہ میرے پاس آئے گی تو میں ہر ممکن طریقے سے کترانے کی کوشش کروں گا۔ اگر کبھی اس کے ساتھ رات گزار بھی لی تو کیا فرق پڑے گا۔ وہ بانجھ ہے' بانجھ ہی رہے گی۔

دوسری جانب نصیبہ اسے اپنے ساتھ رات گزارنے پر مجبور کرتی رہی' شاہد انکار کرتا تو وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر ہنگامہ مچا دیتی۔ کھل کر کسی کے سامنے کچھ نہ کہتی' وہ ہنگامے سے ہی دوسروں کو سمجھا دیتی کہ شاہد پنچائت کے فیصلے پر عمل نہیں کر رہا ہے' لہٰذا وہ مجبور ہو جاتا۔

☆======☆======☆

میں اپنی ڈسپنسری میں بیٹھا ہوا مکھیاں مار رہا تھا۔ محلے کے مریض جب سے ادھر کا راستہ بھول گئے تھے تب سے میں ہر آہٹ پر چونکتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مریض یا کوئی ضرورت مند آ جائے۔ ضرورت مند سے میری مراد یہ ہے کہ جو لوگ جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کرنا چاہتے تھے' وہ میری خدمات حاصل کرنے چلے آتے تھے۔ یہ ڈسپنسری میں ایسے ہی لوگوں کے انتظار میں کھلی رکھتا تھا۔

میں ایک مڈل پاس ڈاکٹر ہوں۔ اسکول کا سبق مجھے کبھی یاد نہیں رہتا تھا۔ ماں باپ نے عاجز آ کر مجھے سکول سے اٹھایا اور کوئی دھندہ سیکھنے کے لئے کہا۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے ایک اسپتال میں وارڈ بوائے کی ملازمت مل گئی۔ بیس سال کی عمر تک

میں وارڈ بوائے کی حیثیت سے غیرشعوری طور پر مریضوں کی نفسیات کو سمجھتا رہا۔ پھر اچانک ہی ترقی کرکے کمپاؤڈر بن گیا۔ وہاں میں دو برس تک مختلف دواؤں کی آمیزش کو اور ان کی ترکیب و تحلیل کو سمجھتا رہا۔ دو سال کے بعد مجھے الہام ہوا کہ میں ڈاکٹر بن چکا ہوں۔ تب میں نے اپنے محلے میں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری کھول لی اور دیکھتے ہی دیکھتے فخرو سے ڈاکٹر فخرالدین ایل ایم ایف بن گیا۔ ایک چھوٹی سی ڈسپنسری کھولنے کے لئے بھی ہزاروں روپوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن میرا کام سو دو سو روپے سے ہی چل گیا تھا۔ میں نے کباڑیے سے ضروری فرنیچر خریدا اور باقی دوائیں اور میڈیکل کا دوسرا سامان روزانہ صبح شام اسپتال سے لاتا رہا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ جو نایاب دوائیں اسپتال میں آتی تھیں' وہ اسپتال کے مریضوں کو نصیب نہیں ہوتی تھیں۔ میرے ماتحت رہنے والے وارڈ بوائے مریضوں کو میری ڈسپنسری کا پتہ بتاتے تھے اور میں منہ مانگے داموں انہیں فروخت کرتا تھا۔ پھر یہ کہ مجھے مریضوں کی اور وقت کی نبض دیکھنے کا سلیقہ آگیا تھا۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی مجھ پر خاص رحمت تھی جو مریض میرے پاس آتے تھے' وہ میری دی ہوئی دو چار خوراکوں میں ہی صحت یاب ہوجاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا کاروبار چمک گیا۔ میں نے ناظم آباد میں چار بیڈ روم اور ایک ڈائننگ روم کی کوٹھی بنوالی۔ اس کے ایک سال بعد میں نے نئے ماڈل کی ایک کار خریدی۔ چھ ماہ بعد ایک دولت مند گھرانے کی لڑکی کو بیاہ لایا۔ دولت' دولت کو کھینچتی ہے' میری اور میری بیوی کی مشترکہ دولت سے میں نے ایک پرائیویٹ اسپتال کھول لیا۔ پچیس برس کی عمر تک میں عروج پر رہا' پھر مجھ پر زوال آنے لگا۔ دولت کی فراوانی نے مجھے جواری بنادیا تھا۔ میں انسانوں کو تاش کے پتوں کی طرح پھینٹ کر دولت حاصل کرتا تھا۔ تاش کے پتے مجھے پھینٹ کر کنگال بناتے گئے۔ میری بیوی مرچکی تھی۔ وہ چھوٹا سا اسپتال میں ایک بڑے سیٹھ کے ہاتھوں جوئے میں ہار گیا تھا۔ اس کے بعد میں ذرا سنبھل گیا۔ میں نے تاش کے پتے جلادیئے کیونکہ اس کے بعد میری کوٹھی داؤ پر لگنے والی تھی۔ پھر میں نے ایک بچی کھچی رقم سے یہ چھوٹی سی ڈسپنسری کھول لی۔ اتنے عرصے سے میں اپنے پیشے سے غفلت برت رہا تھا۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں سے شفا چھین لی تھی۔ مریض ایک بار آتے تھے' پھر ادھر کا راستہ بھول جاتے تھے۔ زندہ رہنے کے لئے اور اپنی امارت کا بھرم رکھنے کے لئے الٹا

سیدھا دھندا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے میں جعلی سرٹیفکیٹ بنوانے اور کنواریوں کے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی خدمات انجام دینے لگا۔

اب میں باسٹھ برس کا ایک تجربہ کار نوجوان ہوں۔ لوگ تو تیس برس میں ہی خود کو بوڑھا سمجھنے لگتے ہیں۔ بڑھاپے کا احساس طاری کیا جائے تو انسان جوان ہوتے ہی بوڑھا ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ چونکہ بڑھاپا موت کو قریب لاتا ہے اس لئے میں خود پر بڑھاپے کے احساس کو غالب نہیں آنے دیتا۔ بات بے بات پر قہقہے لگاتا ہوں۔ نوجوانوں کی طرح رنگین لباس پہنتا ہوں اور جوان لڑکیوں کو دیکھ کر خالص عاشقانہ انداز میں آہیں بھرتا ہوں۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ حسن' جوانی' رنگ و روپ اور شگفتگی اگر انسان سے چھین لی جائے تو اس کے پاس صرف بڑھاپا رہ جاتا ہے۔ اسی لئے میں زندگی کی تمام مسرتیں کسی نہ کسی طرح حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

میں اس وقت ایک بھی مکھی نہ مار سکا۔ کم بخت جوانی کی طرح پر لگا کر اڑ جاتی تھی۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ادھ کھلے دروازے پر نصیبہ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ پھول سے چہرے پر ایسی سختی اور بے رحمی کے آثار تھے' جیسے ابھی ابھی زندگی کے بے شمار طمانچے کھا کر آرہی ہو۔ میں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"ڈاکٹر میں ڈوب رہی ہوں مجھے بچالو۔"

وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ ہچکیوں کو ہرتال پر اس کے زرخیز بدن کی بوٹی بوٹی میرے جسم پر دستک دے رہی تھی۔ جب ظلم کی انتہا ہوجائے اور مظلوم عورت بلک بلک کر روتی ہو تو شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس وقت اس کی جوانی کے متعلق نہ سوچا جائے' جو لوگ ایسا کہتے ہیں' وہ یا تو مجھ سے زیادہ بوڑھے ہوتے ہیں یا پھر جان بوجھ کر فطری تقاضوں کو جھٹلاتے ہیں۔ کوئی مجھے دیکھے میری اس وقت کی پوزیشن کو سمجھے کہ ایک بھرپور جوان عورت شراب کی بھری بوتل کی طرح میرے سینے سے لگی تھی اور ہچکیوں کی ہرتال پر شراب کی طرح چھلک چھلک کر مجھ میں جذب ہو رہی تھی تو پھر ایسی باتیں کیوں نہ سوچتا جو مجھ جیسے باسٹھ سال کے نوجوان کو بھی سوچنا چاہئے۔

دراصل بات یہ ہے کہ میری اور اس کی پرانی جان پہچان تھی اور اس وقت میں دس سال پہلے کی نصیبہ کے متعلق سوچتا رہا۔ میری سوچ مجھے ایک دم سے ماضی کی طرف لے گئی۔ ماضی کے اس کرم خوردہ البم کو الٹ کر دیکھا تو اس میں پندرہ برس کی نصیبہ کی تصویر نظر آنے لگی جب وہ ایک شوخ تتلی کی طرح قوس و قزح کے رنگ بکھیرا کرتی تھی۔ اس کی مدھ بھری ہنسی مجھے باون سال کی عمر میں بھی زندگی کی رعنائیوں کا احساس دلاتی تھی۔ ایک روز میں ڈسپنسری کھولنے آیا تو وہ مریضوں کی بھیڑ میں مجھے نظر آئی۔ اس کی ماں نے آگے بڑھ کر مجھے مخاطب کیا۔

"ارے فخرو، تُو نے مجھے نہیں پہچانا؟"

میں اپنے چیمبر میں داخل ہونے سے پہلے ٹھٹک گیا۔ میں اتنا بڑا ڈاکٹر بن چکا تھا، ایک عورت نے فخرو کہا تو مجھے سخت ناگوار گزرا لیکن نرسوں اور ڈاکٹروں کو ناگواری کے باوجود جبراً مسکرانا پڑتا ہے پھر یہ کہ مجھے فخرو کہنے والی کوئی میری پرانی واقف کار ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنے کمپاؤنڈر سے کہا کہ وہ پہلے اس عورت کو اندر بھیج دے۔

وہ اندر آئی تو میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ اس ادھیڑ عمر کی عورت نے مسکرا کر کہا۔

"ارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے، میں وہی زیتون ہوں جس پر تُو کبھی عاشق ہو گیا تھا۔"

مجھے اچانک ہی یاد آ گیا۔ میں اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے کئی برس چھوٹی تھی لیکن غربت نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا اور دولت نے مجھے وقت کے بعد بھی جوان رکھا تھا۔ یہ درست ہے کہ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ ایک بار جی بھر کر اسے سینے سے لگایا بھی تھا لیکن اس وقت اس کے شانہ بہ شانہ ایک بہت ہی کم عمر لڑکی کھڑی تھی۔ بلوریں مجسمے کی مانند نازک اور سبک سی۔ اسے دیکھ کر اسے چھونے کو جی چاہتا تھا۔ اس دھان پان سے بدن والی لڑکی کو میں جوان تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس کے مقابل زیتون بہت زیادہ بوڑھی نظر آ رہی تھی اس لئے میں نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا۔

"زیتون! میں نے تمہیں تو پہچان لیا ہے مگر یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ میری بیٹی نصیبہ ہے۔ جب تم بہت بڑے ڈاکٹر بن کر محلہ چھوڑ گئے تھے، اس

وقت یہ پیدا ہوئی تھی۔"

میں نصیبہ کو دیکھ کر سوچنے لگا، وقت کتنی تیز رفتاری سے گزرتا ہے یا پھر یہ لڑکیاں وقت سے زیادہ تیز رفتار ہوتی ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ماں کے برابر ہو جاتی ہیں۔ اگر نصیبہ بھرے بھرے بدن کی لڑکی ہوتی تو قیامت جگا دیتی۔ اس بلوریں مجسمے میں بس ایک جوانی کی کمی کھٹک رہی تھی۔ اس وقت اس کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں۔ نیلی فراک، سفید شلوار اور وی کی شکل کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر پھولوں کی معصومیت، شگفتگی اور رعنائی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ اسکول پڑھتی ہے؟"

زیتون نے کہا۔ "ہاں دسویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ کبھی کبھی اس کے پیٹ میں یا کلیجے کے پاس درد اٹھتا ہے۔ یہ ٹھیک سے بتا بھی نہیں سکتی کہ آخر درد کس جگہ ہوتا ہے۔ دیکھنے میں اتنی اونچی پوری ہو گئی ہے مگر چڑیا کے برابر خوراک کھاتی ہے۔ تم کوئی ایسی دوا دو کہ اس کی تکلیف بھی دور ہو جائے اور بھوک بھی بڑھ جائے۔"

میں نے نصیبہ کو قریب آنے کے لئے کہا۔ وہ میرے پاس ایک اسٹول پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے آگے کی طرف جھک کر ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اِس کے پیٹ کو اِدھر سے اُدھر سے دبا کر دیکھنے لگا۔

"کیا یہاں درد ہوتا ہے؟"

"نہیں۔"

"اچھا یہاں درد ہوتا ہے؟"

"ہاں کبھی کبھی یہاں درد محسوس ہوتا ہے۔"

میرا ہاتھ پیٹ سے اوپر سرکتا ہوا وی شکل کے دوپٹے کے نیچے آ گیا۔

"کیا یہاں درد ہوتا ہے؟"

یہ پوچھتے وقت میری زبان لڑکھڑا گئی۔ میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس وقت یہ انکشاف ہوا کہ وہ چور بدن کی لڑکی ہے۔ اسکول کا لباس ذرا ڈھیلا ڈھالا تھا، اس پر تہہ در تہہ وی دوپٹہ پڑا ہوا تھا۔ اسی لئے وہ دور سے سیدھی اور سپاٹ نظر آ رہی تھی لیکن معائنے کے دوران میرا بھٹکتا ہوا ہاتھ اس کے بدن کے چور دل تک پہنچ گیا۔ وہ ذرا سا کسمسائی لیکن میں پرانا کھلاڑی تھا، میں نے وہیں پر ہاتھ

کو دباؤ دیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہاں درد ہوتا ہے؟"

وہ شرم سے گلنار ہوگئی۔ میں اپنے تجربات کی بنا پر کہہ سکتا تھا کہ اس کا حلق خشک ہوگیا تھا۔ اسی لئے وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی صرف اپنے سر کو سرخ چہرے کے ساتھ ذرا سا اقرار میں ہلادیا۔ میں اس سے ہٹ کر بیٹھ رہا۔ زیتون کے سامنے میں اس کا معائنہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم نصیبہ کو اسکول چھوڑنے جایا کرتی ہو؟"

"نہیں۔ مجھے اتنا وقت کہاں ملتا ہے صبح سے شام تک کپڑے سیا کرتی ہوں تاکہ اس کی تعلیم کا بوجھ اٹھاسکوں۔ ماشاء اللہ نصیبہ سمجھ دار ہے' اچھے برے کی تمیز ہے۔ یہ سیدھی سکول جاتی ہے اور وہاں سے سیدھی گھر واپس آتی ہے۔ آج مجھے خیال آیا کہ تُو بہت بڑا ڈاکٹر بن گیا ہے تو تجھی سے اس کا علاج کراؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "تُو نے اچھا کیا کہ اسے یہاں لے آئی لیکن ابھی تو میں بہت مصروف ہوں' دوسرے مریضوں کی طرح میں صرف نصیبہ کا حال پوچھ کر دوا نہیں دینا چاہتا۔ تجھ سے پرانے تعلقات ہیں اس لئے میں اس کا اچھی طرح معائنہ کروں گا۔ کیا یہ دو گھنٹے کے بعد یہاں آسکتی ہے؟ اس وقت مریضوں کی بھیڑ کم ہوجائے گی۔"

زیتون خوش ہو کر بولی۔

"میں اسی لئے تو آئی ہوں کہ تُو اچھی طرح دیکھ سمجھ کر اس کا علاج کرے گا۔ میں تو دو گھنٹے بعد نہیں آسکتی اس لئے کہ عید قریب ہے اور سلائی کا کام بہت زیادہ ہے۔ میں اسے یہاں چھوڑ جاتی ہوں یہ دوائیں لے کر گھر آجائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نصیبہ؟ آج تُو اسکول کا ناغہ کردے۔"

نصیبہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ سر جھکائے پلکیں جھپکتی رہی۔ شاید پہلی بار دوپٹے کے سائے میں کسی مرد کا ہاتھ پہنچا تھا اس لئے اسے چپ لگ گئی تھی۔ میں نے پارٹیشن کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس پارٹیشن کے پیچھے ایک بیڈ ہے' اس پر جاکر بیٹھ جاؤ' میں مریضوں سے نمٹنے کے بعد تمہیں بلاؤں گا۔"

زیتون نے بھی میری تائید میں اس سے کہا کہ وہ پارٹیشن میں چلی جائے۔ وہ

چپ چاپ اسٹول سے اٹھ کر وہاں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد زیتون نے مجھ سے فیس کے متعلق بات کرنی چاہی۔ میں نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

"زیتون! تُو اپنی ہو کر غیروں کی طرح باتیں کررہی ہے۔ چل جا یہاں سے اور آئندہ پیسوں کی باتیں نہ کرنا۔"

اس نے مجھے احسان مندی سے دیکھا اور سلام کرکے چلی گئی۔ پھر میں نے دوسرے مریضوں کو کس طرح دیکھا اور کس طرح پیچھا چھڑایا' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بہت دیر کے بعد جب میں پارٹیشن کے پیچھے گیا تو وہ انتظار کی طوالت سے تھک کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھنے لگی تو میں نے اس کا بازو تھام کر اسے لیٹنے پر مجبور کرتے ہوئے کہا۔

"اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسی طرح لیٹی رہو۔"

ایک ڈاکٹر کی ہدایت سے مجبور ہو کر وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر لیٹ گئی۔

میں نے کہا۔ "اس طرح لیٹو گی تو میں معائنہ کیسے کروں گا۔ کیا تم مجھ سے ڈر رہی ہو؟"

"جی.......... جی نہیں.........." وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

"تو پھر شرما رہی ہو؟"

وہ چپ رہی۔ اس کی جھکی ہوئی گھنی پلکوں کو دیکھ کر میں نے کہا۔

"ڈاکٹر سے شرماؤ گی تو علاج نہیں ہوسکے گا۔ تمہیں اس طرح لیٹنا چاہئے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر چت کرکے لٹادیا اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم ایک پڑھنے لکھنے والی لڑکی ہو' اتنا تو تمہیں سمجھنا چاہئے کہ عورت دائی سے پیٹ نہیں چھپا سکتی اور ڈاکٹر سے بدن نہیں چرا سکتی۔ تم اس طرح گٹھری بن جاؤ گی تو میں تمہارے مرض تک کیسے پہنچوں گا۔ میں جہاں تک پہنچنا چاہتا ہوں مجھے وہاں تک پہنچنے دو۔"

میں نے اس کے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان لے کر کہا۔

"آنکھیں اچھی طرح کھولو' آنکھوں میں جھانکنے سے شاید تمہاری بیماری کا پتہ چل جائے۔"

وہ ہچکچانے لگی۔ پلکیں جو جھکی ہوئی تھیں' انہیں اٹھاتے ہوئے وہ شرما رہی تھی۔ جب تک وہ شرماتی رہی' میں اسے سمجھانے کے بہانے اس کے چہرے پر انگلیاں پھیرتا رہا چہرے کی شفاف جلد ایسی تھی کہ انگلیاں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ میں نے بہت پہلے ہی وی دوپٹے کے نیچے ہاتھ رکھ کر اسے محتاط کر دیا تھا۔ وہ بظاہر خاموش تھی لیکن اندر ہی اندر سمجھ رہی تھی کہ کسی مرد کا ہاتھ بھٹکتا ہوا دوپٹے کے سائے میں تھم جائے اور جم جائے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ دسویں جماعت میں پڑھنے والی لڑکی اتنی نادان نہیں ہو سکتی۔ وہ خاموش طبع ہی سہی لیکن خاموش طبع سمندر کی تہہ میں کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں' یہ مجھ جیسا تجربہ کار آدمی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسی لئے اپنی بے چین انگلیوں سے ان طوفانوں کو ٹٹول رہا تھا' ڈھونڈ رہا تھا اور انہیں اس کے وجود سے باہر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے کسمسا رہی تھی۔ پھر اس نے مجبور ہو کر میری ہدایت کے مطابق آنکھیں کھول دیں۔ کٹورا سی آنکھیں یوں کھل گئیں جیسے خوش آمدید کے لئے باہیں کھل جاتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر کسی کا بھی دل بے اختیار دھڑکنے لگتا جیسے ہی مجھ سے نظریں ٹکرائیں' میں نے کہا۔

"تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں' ان کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔"

تعریف سنتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اس نے نہ جانے کتنے چور جذبوں کو چھپا لیا تھا لیکن چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ یوں سرخ ہو گئی تھی جیسے صاف اور چکنی جلد کے پیچھے انگارے دہک رہے ہوں۔

میں اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی خاموشی نے حوصلہ دیا تو ذرا اور جھک گیا اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر کہا۔

"نصیبہ! تمہاری جیسی حسین لڑکی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یقین نہ ہو تو ذرا اٹھ کر آئینہ دیکھو۔ تم شرمائی ہوئی اتنی حسین لگ رہی ہو کہ میں ڈاکٹر کے بجائے شاعر بن جانا چاہتا ہوں۔"

میری عمر اور میرے تجربے نے مجھے سکھایا تھا کہ کم عمر لڑکیاں جو تازہ بہ تازہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں' وہ دوسروں کی توجہ کی محتاج رہتی ہیں۔ وہ زبان سے یہ تو نہیں کہتیں کہ ہماری طرف دیکھو مگر جی چاہتا ہے کہ دنیا انہیں دیکھتی رہے۔ شاید یہ

سمجھنے کے لئے کہ ان کے اندر جو چور تبدیلیاں ہو رہی ہیں انہیں دوسرے بھی دیکھتے ہیں یا نہیں؟ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اس عمر سے ہی لڑکیاں تعریف و توجہ کی محتاج بن جاتی ہیں۔ اس کی کسمساہٹ بتا رہی تھی کہ وہ رسمی طور پر میری تعریف سے انکار کر رہی ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ انکار ہوتا تو وہ وہاں سے اٹھ جاتی یا غصے کا اظہار کرتی لیکن پہلے تجربے کی پہلی کسوٹی پر اپنے حسن کو پرکھنے اور اپنی اہمیت کو سمجھنے کا وہ پہلا مرحلہ تھا اس لئے وہ چپ تھی۔ بیمار جذبوں کا معائنہ کرانے کے لئے اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ میں شاعر کی زبان سے اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے لگا اور ڈاکٹر کے تجربے سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے کئی بار میری بیباکیوں پر اعتراض کیا لیکن اعتراض زبان سے نہیں بلکہ خاموش اداؤں سے تھا۔

میں نے اسٹیتھسکوپ ایک جگہ رکھ دیا تھا۔ یہ آلہ صرف دل کی دھڑکنیں سنتا ہے اور میری انگلیاں تمام بدن کی دھڑکیں سن رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ پگھلنے لگی۔ سمٹنا اور سکڑنا بھول گئی۔ یک بیک میرے سینے سے لگ کر یوں تھر تھر کانپنے لگی جیسے بھیگی ہوئی کبوتری سردی سے ٹھٹھر کر کانپ رہی ہو۔

میں اسے مزید خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پہلی بار کسی کے مرض کو سمجھنے کے لئے جس قدر معائنے کی ضرورت ہوتی ہے' اس حد تک میں نے معائنہ کیا۔ بالکل ہی نئے اور کچے مریض کا آپریشن کر دیا جائے تو وہ گھبرا کر ادھر کا راستہ بھول جاتا ہے۔ میرے محبت بھرے رویے سے اور میرے تعریفی جملوں سے وہ متاثر ہوتی رہی۔ اس کی زلفیں بکھر گئی تھیں' آنکھیں ایسی خمار آلود ہو گئی تھیں کہ پلکیں جذبات کے بوجھ سے جھکی جاتی تھیں۔ اس کے کچے بدن کی تھرتھری مجھے آج تک یاد ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ عورت مرد کو ظالم سمجھ کر کانپتی بھی ہو اور پناہ لینے کے لئے اسی کی آغوش میں سمٹتی بھی ہو تو اس کی یہ متضاد ادائیں دیوانہ بنا دیتی ہیں۔

رخصت ہونے سے پہلے وہ بہت دیر تک میرے سینے سے لگی کھڑی رہی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"پھر آؤ گی؟"

اس کا سر میرے سینے پر تھا' جواب میں وہ اپنے رخسار کو میرے سینے پر رگڑنے لگی۔ پالتو بلی کی ادائیں بتا دیتی ہیں کہ وہ اپنے مالک کی آغوش کی گرمی سے آشنا ہو گئی

ہے اب وہ بار بار اسی طرف آئے گی۔ اس نے اپنے بالوں کو سمیٹ کر باندھا' اپنی الجھی ہوئی سانسوں کو درست کیا پھر کتابیں اٹھا کر وہاں سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر سر جھکائے اس کی دل نشین اداؤں کو یاد کرتا رہا۔ جو کچھ عملی طور پر گذر جاتا ہے اس کے بعد ذہن کی اسکرین پر وہی فلم بار بار چلتی ہے' بار بار ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ نصیبہ کے دماغ میں بھی وہی فلم چل رہی ہوگی اور وہ بار بار مجھے یاد کئے جا رہی ہوگی کیونکہ میں اس کی زندگی کا پہلا مرد تھا جس نے اسے چھوا تھا چکھا تھا اور اسے اس کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ آج کل کی لڑکیوں کے متعلق میرا تجربہ ہے کہ وہ نوجوانوں کے مقابلے میں مجھ جیسے عمر رسیدہ مردوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہوتا ہے۔

دوسرے دن وہ اسکول کے وقت پر آگئی۔ جمعہ کے دن اس کا اسکول بند ہوتا تھا اور اتوار کے دن میری ڈسپنسری بند ہوتی تھی۔ وہ اتوار کا دن تھا اور میں بند ڈسپنسری کے آگے اپنی کار میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ جھجکتی ہوئی آکر بیٹھ گئی۔ میں نے کار اسٹارٹ کی پھر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا ہاکس بے کی طرف چلا گیا۔ تمام راستے میں اس سے لگاوٹ کی باتیں کرتا رہا اور بار بار اس کا ہاتھ اس طرح تھامتا رہا جیسے میں ایک لمحے بھی اس سے دور رہنا گوارہ نہیں کرسکتا ہوں۔ آہستہ آہستہ وہ مجھ سے کھل کر باتیں کرنے لگی۔ پہلے اسکول کی باتیں پھر گھر کی باتیں اس کے بعد اپنی باتیں کرتی رہی۔ عورت کے دل میں جگہ بنانے کے لئے ایک اہم نسخہ یہ بھی ہے کہ اس کی باتیں دلچسپی سے سنی جائیں اور بات بات پر اس کی حمایت کی جائے تو وہ خوش ہو جاتی ہے کہ کوئی اسے سمجھنے والا تو ہے۔

وہ تمام دن ہم نے ہاکس بے کے ایک ہٹ میں گذارا۔ اس روز اس نے اپنا تن من سب کچھ میرے حوالے کر دیا اور میری آغوش میں کلی سے پھول بن گئی۔ شام تک ہم ہٹ سے باہر نہیں نکلے۔ میں نے اس سے کہا۔

"شام ہو چکی ہے زیتون تمہارے لئے پریشان ہوگی۔"

اس نے جواب دیا۔

"فیکٹری میں سلائی کا کام بہت ہے۔ وہ رات سات آٹھ بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گی۔ اگر آ بھی گئیں تو مجھ پر شبہ نہیں کریں گی کیونکہ میں گرلز گائیڈ کے پروگراموں میں حصہ لیتی ہوں اس لئے کبھی کبھی اسکول سے واپسی میں شام ہو جاتی ہے۔"

وہ پندرہ برس کی ایک نادان لڑکی تھی لیکن ہم انسانوں کی دنیا میں گناہ ایسی چیز ہے جو مرد اور عورت کو ان کی عمر سے بہت پہلے ذہین اور چالاک بنا دیتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ مرد اور عورت کے درمیان کسی طرح کی پابندی نہ ہوتی اور آزاد میل جول کی قانونی اجازت ہوتی تو اس وقت بھی یہی ہوتا جو اب ہو رہا ہے۔ تہذیب کی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں اس کی ایک یہ برائی بھی ہے کہ وہ پندرہ برس کی لڑکیوں کو بھی چالاک بنا دیتی ہے۔

میں جب بھی اس سے ملتا تھا مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ عورت اپنی عمر کی منزلیں اتنی تیزی سے طے کرلیتی ہے۔ سال بھر میں وہ دبلی پتلی دھان پان سی لڑکی ایسی صحت مند ہوگئی کہ اس کے مقابلے میں پچھلی نصیبہ یاد کرنے کے باوجود یاد نہیں آتی تھی۔ جب وہ بہترین لباس پہن کر میرے ساتھ تفریح کے لئے نکلتی تو میں دل ہی دل میں پریشان ہو کر اپنی عمر کا حساب کرتا رہتا کہ میں کب تک اس منہ زور جوانی کا ساتھ دیتا رہوں گا۔ دو برس یا چار برس' اس کے بعد میرا بڑھاپا اس کی جوانی کے سیلاب میں بہہ جائے گا اور میں اس کے زرخیز بدن کو صرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کروں گا۔ کاش کہ ایک بار پھر سے جوانی مل جاتی۔

وہ میرے چور احساسات سے بے خبر تھی۔ میری آغوش میں بہت کچھ سیکھنے کے باوجود اس نے کبھی عمر کا حساب کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں کتنی دیر تک اور کتنی دور تک اس کا ساتھ دے سکوں گا۔ وہ نادان تھی اسی لئے بار بار شادی کی ضد کر رہی تھی اور میں اس کی اس خواہش کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا کرتا تھا۔ اس بات پر وہ کئی بار مجھ سے ناراض ہوئی' کئی روز تک مجھ سے ملنے نہیں آئی لیکن اس کے بے لگام جذبات اسے میری طرف آنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

ایک دن وہ گھبرائی ہوئی سی میرے پاس آئی۔ میں مریضوں میں مصروف تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور بار بار کہنے لگی۔ "مجھے آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی

ہیں آپ جلدی ڈسپنسری بند کردیں۔" میں نے تمام مریضوں کو نمٹانے کے بعد ہی ڈسپنسری کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کیا۔ پھر اس کے قریب آکر پوچھا۔

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو' اس قدر پریشان کیوں ہو؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی' میرے قریب آکر میرے بازو کو تھام کر بولی۔

"میں بار بار آپ سے کہتی ہوں کہ شادی کرلیں مگر آپ ٹال دیتے ہیں۔ اب میرا کیا بنے گا' میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں؟"

اس کی بات سن کر میں چند لمحوں تک اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ بے یقینی اس لئے تھی کہ مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں تھا کہ میں اس بڑھاپے میں باپ بن سکتا ہوں۔ اللہ میاں جب دینے پر آتے ہیں تو پرانی اور بوسیدہ چھتیں بھی پھاڑ کر دیتے ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر ناز تھا لیکن نصیبہ اب میرے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تمام باتیں پوچھنے لگا کہ اس کی یہ حالت کب سے ہے اور اب تک کتنے ماہ گذر چکے ہیں۔ اس نے بتایا کہ تیسرا مہینہ ہے۔

میں نے اسے تسلی دی۔ "گھبرانے کی بات نہیں ہے' بچہ بڑی آسانی سے ضائع ہوجائے گا۔"

یہ بات سنتے ہی وہ حیرت سے اور نفرت سے مجھے دیکھنے لگی پھر جوشیلے انداز میں تھرتھراتی ہوئی بولی۔

"یہ ہماری محبت کی نشانی ہے میں اسے ضائع نہیں کرنے دوں گی۔"

"یہ محبت کی نہیں گناہ کی نشانی ہے تم نادان نہ بنو جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کرو۔"

"میں اب تک آپ کی تمام باتیں مانتی رہی مگر اب نہیں مانوں گی۔"

وہ ایسے ضدی لہجے میں کہہ رہی تھی کہ مجھے خطرہ محسوس ہوا' میں نے بھی سخت لہجے میں پوچھا۔

"تم مجھ سے تعلقات رکھنا چاہتی ہو یا بگاڑنا چاہتی ہو؟ یاد رکھو میں مرد ہوں بدنام ہوکر بھی نیک نام رہوں گا لیکن تم ساری عمر ایک بدکار عورت کہلاؤ گی۔ تم محبت کے نشے میں یہاں آتی ہو اور میرے دماغ سے گناہ کا نشہ ڈھل گیا ہے' اسی لئے میں عقل کی باتیں سمجھا رہا ہوں۔ اگر میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہیں تو تم یہاں سے جاؤ

اور اپنی ماں کو یہاں بھیج دو۔ ایک ماں سے زیادہ کوئی اور نہیں سمجھتا کہ بیٹی کے گناہوں کو کس طرح چھپانا چاہئے۔"

واقعی ایک ماں سمجھتی ہے کہ بیٹی کو سہاگن بنانے کے لئے اس کے پچھلے گناہوں پر کس طرح پردہ ڈالنا چاہیے۔ زیتون آئی تو وہ بھی غصہ دکھاتی رہی لیکن جلد ہی دھیمی پڑ گئی۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا۔

"مجھے بدنام کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ میری بدنامی وقتی ہوگی لیکن یہ گناہ نصیبہ کی آخری سانس تک اس کے ساتھ جائے گا مجھے دھمکی دینے سے پہلے تجھے یہ بھی سوچ لینا چاہئے کہ تو نصیبہ کو عزت آبرو سے کہیں بیاہنا چاہتی ہے یا نہیں؟ اگر چاہتی ہے تو اپنے ہونٹوں کو سی لے اور میرے مشورے پر عمل کرے گی تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی اور تیری بیٹی کے دامن سے گناہ کا داغ ڈھل جائے گا۔"

زیتون بہت دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی پھر وہ میری باتوں سے قائل ہوگئی میں نے اس سے کہا۔

"پرسوں اتوار ہے' میری ڈسپنسری بند ہوگی میں صبح ہی تیرے گھر آؤں گا اور نصیبہ کو اس بوجھ سے نجات دلادوں گا۔"

وہ خاموشی سے اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر واپس چلی گئی۔ جاتے جاتے نصیبہ نے مجھے نفرت سے دیکھا۔ اس کی نفرت بھری نگاہوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا کہ اب اپنا کام نکلنے کے بعد وہ مجھ سے کبھی نہیں ملے گی اور وہ ایسی حسین اور دل نشین تھی کہ اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کس طرح اسے ہمیشہ اپنی مٹھی میں رکھا جاسکتا ہے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ میں اس کے اس گناہ سے واقف تھا' اس گناہ میں شریک تھا اور اس کا ہم راز تھا میں جب چاہتا اسے دھمکیاں دے کر اپنے پاس آنے پر مجبور کرسکتا تھا۔

شام کو میں بہت دیر تک سمندر کے کنارے ٹہلتا رہا نصیبہ میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی' اس بات کا یقین مجھے تھا کہ اس کی ناراضگی کے باوجود میں جب چاہوں اسے حاصل کرسکتا ہوں لیکن ایک بات کھٹک رہی تھی وہ یہ کہ وہ ایک زرخیز زمین کی طرح تھی۔ اس بار بچے کو ضائع کرنے کے بعد وہ دوسری بار اور تیسری بار پھر ماں بن سکتی تھی۔ میں آئندہ اس مصیبت سے بچنا چاہتا تھا اس سلسلے میں احتیاطی تدابیر کے کتنے ہی

طریقے تھے لیکن میں بہت حساس واقع ہوا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں جو مشورے دیئے جاتے ہیں' ان سے میں مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ میں سمندر کے ساحل پر کھڑا اسی مسئلے پر غور کررہا تھا۔ ساحل پر رہنے والے غوطہ خور تمام دن سمندر میں گذارنے کے بعد اپنی کشتیوں میں واپس آچکے تھے اور سمندر کی تہہ سے نکالی جڑی بوٹیوں اور سیپیوں کو الگ الگ تھیلوں میں جمع کررہے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچ کر ان کی مصروفیت کو دلچسپی سے دیکھنے لگا کیونکہ ان جڑی بوٹیوں کا تعلق طب سے تھا میں.......... کشتی پر جھک کر ایک خوبصورت سی سیپ کو اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر میں نے ایک غوطہ خور سے پوچھا۔

"کیا اسے سمندر کی تہہ سے نکال کرلائے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "جی ہاں ہم زیادہ گہرائی تک نہیں جاتے۔ ہم غریب ہیں۔اگر حکومت ہمارے لئے آکسیجن ماسک مہیا کرے تو ہم زیادہ گہرائی میں جاکر ایسی سیپیاں نکال کرلاسکتے ہیں جن کی کوکھ میں بیش قیمت موتی چمکتے ہیں۔"

میں نے اپنے ہاتھ کی سیپ دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"اس سیپ میں موتی کیوں نہیں بنتا؟"

اس نے میرے ہاتھ سے سیپ لے کراس کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"اس میں بھی بن سکتا ہے۔ آپ ذرا جھانک کر غور سے دیکھیں اس کے اندر کنارے کنارے پھپھوندی سی جمی ہوئی ہے۔ یہ کسی قسم کا قدرتی مسالا ہے۔ ہمارے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ جس سیپ میں یہ خاصیت ہو اس میں برسوں کے بعد ایک موتی بنتا ہے۔ نہ جانے کتنے برسوں کے بنتا ہے۔ اب ہم اس انتظار میں اسے دوبارہ سمندر میں پھینک نہیں سکتے۔ پھینکنے کے بعد پتہ نہیں اور کتنی گہرائی میں چلا جائے۔ پھینکنے کے بعد ہم آکسیجن ماسک کے بغیر اتنی گہرائی میں نہیں جاسکیں گے اس لئے اب ہمارے بچے اس سے کھیلیں گے اور اس سیپ کے اندر قدرتی طور پر موتی بننے کا جو جوہر ہے بچے اسے کھرچ کر پھینک دیں گے پھر یہ سیپ ہمیشہ کے لئے موتی سے خالی ہوجائے گا۔"

اس کی باتیں سنتے ہی میرا دماغ روشن ہوگیا۔ انسان بوڑھا ہونے کے بعد بھی بچہ ہی رہتا ہے۔ میں بھی بچے کی طرح ایسی سیپ سے کھیلتے رہنا چاہتا تھا جس میں کبھی موتی

نہ بنے۔

زیتون ایک جاہل عورت تھی' نصیبہ ناتجربہ کار لڑکی تھی۔ وہ میرے عمل کو اتنی گہرائی سے نہیں سمجھ سکتی تھی کہ میں اس کے بدن کی تجوری کو کتنے اہم خزانے سے خالی کررہا ہوں۔

اتوار کی صبح پورے انتظامات کے ساتھ میں اس کے یہاں گیا اور اسے ہمیشہ کے لئے خالی کردیا۔

☆------☆------☆

نصیبہ میرے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی' اور ایک ننھی بچی کی طرح ہچکیاں لے لے کر مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"مجھے کیا ہوگیا ہے ڈاکٹر' میں ماں کیوں نہیں بنتی؟ میں نے تعویذ گنڈے کئے' پیروں فقیروں کے پاس گئی۔ ایک شریف عورت جس حد تک کوششیں کر سکتی ہے میں اس حد تک کوششیں کر چکی ہوں۔

آہ! اپنے آپ کو ایک شریف عورت کہتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ شادی سے پہلے میں نے کتنا بڑا گناہ کیا تھا۔ جب آپ نے بچے کو ضائع کیا تو اس وقت میں نے قسم کھائی تھی کہ اب ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گی۔ سنا ہے اس دنیا میں عورت کی توبہ کبھی قبول نہیں ہوتی لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اس کے بعد میں نے آپ کو پھر کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ آپ نے کئی بار مجھے دھمکیاں دیں لیکن میں نے عہد کیا تھا کہ ساری عمر یونہی بیٹھی رہوں گی لیکن دوبارہ وہی غلطی نہیں کروں گی' خواہ آپ مجھے لاکھ بدنام کرتے رہیں۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ آپ اندر سے اتنے مردہ نہیں حالانکہ آپ بار بار مجھے بلاتے رہے میرے انکار پر بار بار مجھے دھمکیاں دیتے رہے۔ آخر ایک دن میری توبہ کی سچائی کے قائل ہوگئے۔ میں آپ کی احسان مند ہوں کہ آپ نے یہ بات شاہد تک نہیں پہنچائی۔ خدا شاہد ہے کہ شاہد کی شریکِ حیات بننے کے بعد میں نے اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی اور اب تک دیانتداری سے یہی سوچتی رہی کہ میں اپنے شاہد کے بچے کی ماں بن جاؤں گی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ماں کیوں نہیں بن رہی ہوں۔ آپ ڈاکٹر ہیں آپ مجھے بتائیں کیا پہلا بچہ ضائع کرنے کے بعد دوسری بار عورت ماں نہیں بن سکتی؟"

وہ میرے سینے پر سر رکھے رو رہی تھی اس لئے یہ نہ دیکھ سکی کہ اس کے سوال پر میں ایک مجرم کی طرح ہچکچا رہا تھا۔ میں نے اپنی عیاشی کے لئے اس پر جو ظلم کیا تھا'

اس کا اعتراف نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنی اس غلطی کی تلافی کر سکتا تھا۔ اس کے آنسوؤں سے میرے سینے پر کی قمیض بھیگ رہی تھی۔ ایک بار میرے جی میں آیا کہ دل سے نادم ہو کر اسے یہ حقیقت بتا دوں کہ میں نے ہمیشہ کے لئے اس کی کوکھ اجاڑ دی ہے اور اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ وہ مرجائے گی یا پاگل ہو جائے گی یا پھر ایک زخمی ناگن کی طرح میری عزت اور میری شہرت کو ڈس لے گی۔ ایسے وقت مجھے بڑی سمجھداری سے کام لینا تھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کے چہرے کو اپنی طرف اٹھایا پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے تمہارے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ تم ہمت نہ ہارو اطمینان رکھو' ایک دن ضرور ماں بنو گی۔"

"وہ دن آنے سے پہلے میں کہیں کی بھی نہیں رہوں گی۔ شاہد میرے بانجھ ہونے کے جرم میں مجھے طلاق دینے والے ہیں۔ میں سات برس تک انہیں بہلاتی رہی اب مجھے تین ماہ کا وقت دیا گیا ہے۔ ایک ماہ گزر چکا ہے۔ ابھی دو ماہ کا وقت ہے اگر دو ماہ کے دوران مجھ میں ماں بننے کے آثار پیدا نہ ہوئے تو میں سہاگن کی بجائے ایک مطلقہ عورت بن جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ تم پر ظلم ہو رہا ہے' شاہد کا فرض ہے کہ وہ بھی اپنا طبی معائنہ کرائے۔"

یہ بات میں نے اس کی تسلی کے لئے کہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔

"میں طبی معائنے کے لئے کئی بار شاہد سے کہہ چکی ہوں لیکن بات کچھ اور ہی ہے۔ وہ ایک دولت مند لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے بہانہ تراشا ہے کہ میں بنجر ہوں لیکن میں بنجر نہیں ہوں۔ زمین اپنی زرخیزی کو پہچانتی ہے اور اس حقیقت کو آپ بھی سمجھتے ہیں' کہئے کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟"

اف اس کا یہ یقین نشتر کی طرح میرے دل میں چبھ رہا تھا۔ میں اس کی باتوں کا جواب دینے سے پہلے اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے طور پر درست کہا تھا کہ وہ اندر سے بالکل بنجر نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا درد مجھے تڑپا رہا تھا۔ میں صدق دل سے چاہتا تھا کہ اس کے کام آؤں لیکن کسی کام آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں اس حقیقت کو سمجھتا ہوں تم ایک بار ماں بن چکی ہو دوسری بار بھی بن سکتی ہو۔ چونکہ شاہد بانجھ ہے اور وہ اپنے نقص کو تسلیم نہیں کر رہا ہے اس لئے تم اس کے بچے کی ماں نہیں بن سکتیں۔"

"لیکن میں شاہد کو ان کے ارادے میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ وہ ایک دولت مند لڑکی کی خاطر میری محبت کو ٹھکرا رہے ہیں اور میری وفاداری کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو پھر میں ان کے اعتماد کو ٹھیس کیوں نہ پہنچاؤں۔ میں ثابت کر کے رہوں گی کہ میں ماں بن سکتی ہوں اور میں یہی ثابت کرنے آئی ہوں۔

ڈاکٹر' میں تہذیب اور اخلاق کی تمام دیواریں توڑ کر آئی ہوں۔ میں نے اس شریف عورت کو بھی مار ڈالا ہے جس نے ایک گناہ کے بعد صدقِ دل سے توبہ کی تھی کہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے شوہر کے قدموں کی دھول بن کر رہے گی۔ میں نے پوری سچائی اور پورے ایمان سے توبہ کی تھی' اب وہ توبہ بھی توڑ ڈالی ہے اور اب آپ سے وہی پرانا رشتہ استوار کرنے آئی ہوں۔ آیئے مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیجئے۔ میں ایک بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں لیکن وہ بچہ شاہد کے نام سے جنم لے گا۔"

یہ کہہ کر وہ جوشیلے انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا جذبات سے خالی اور ممتا سے بھرا ہوا سینہ میرے سینے پر دھڑک رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے آگ کا ایک دہکتا ہوا شعلہ مجھ سے لپٹ گیا ہو۔ میں ایک دم سے گھبرا گیا۔ بڑھاپے اور کمزوری سے میرے گھٹنے کانپنے لگے۔

میں پریشان ہو کر سوچ میں پڑ گیا کہ میری بوڑھی جوانی کیسے اس کا ساتھ دے گی۔ یہ نادان عورت اتنا بھی نہیں سمجھ رہی ہے کہ اس طویل عرصے میں وقت نے مجھے اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔ میں باسٹھ سال کا بوڑھا ہوں اور اب وہ اپنی عمر کی پختگی کو پہنچی ہے' یہ بات میں اسے نہیں سمجھانا چاہتا تھا۔ بوڑھا ہوتے ہوئے بھی ایک عورت کے سامنے خود کو بوڑھا کہتے ہوئے توہین کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے وقت دین ایمان اور تہذیب کی اچھائیاں سہارا دیتی ہیں۔ میں نے بوڑھوں کے دستور کے مطابق اسے سمجھایا۔

"نصیبہ! یہ حرکت تہذیب کے خلاف ہے۔ ایک بار توبہ کرنے کے بعد قدرت نے ہمیں معاف کر دیا ہے' دوسری بار ہم پھر وہی غلطی کریں گے تو ہم پر عذاب نازل

ہو گا۔ دولت ہو یا اولاد کی خوشی ہو' یہ سب خدا کی دین ہے۔ اگر وہ تمہیں اولاد نہیں دے رہا ہے تو اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت ہو گی۔ تمہیں اس معبود کی رضا پر راضی رہنا چاہئے۔"

وہ بپھر کر الگ ہو گئی اور مٹھیاں بھینچتی ہوئی بولی۔

"آپ دین وایمان کو ہمارے درمیان نہ لائیں۔ یہ غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا سے سب کچھ ہوتا ہے۔ اب سے سات برس پہلے ہم نے جو گناہ کیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل نہیں تھی۔ اب جو شاہد کسی دولت مند لڑکی سے شادی کر رہے ہیں اور مجھے ٹھکرا رہے ہیں تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل نہیں ہے۔ یہ سب ہمارے اعمال ہیں۔ محبت' نفرت اور فریب کا جو کھیل کھیلا جاتا ہے' ان سب کے ذمہ دار ہم ہیں۔ شاہد مجھ سے فریب کر رہے ہیں۔ میں انہیں فریب دینا چاہتی ہوں۔ اگر دین وایمان کی باتیں کرتی ہیں تو کیا ان باتوں سے شاہد بھی متاثر ہو سکتے ہیں؟ کیا وہ مجھے طلاق دینے اور دوسری شادی کرنے سے باز آ سکتے ہیں؟ نہیں' ہر انسان بلندی تک پہنچنے کے لئے پہلے دوسرے کو پستی میں گراتا ہے۔ ابھی وقت کا تقاضا یہ ہے کہ میں خود کو گرنے سے بچالوں اور یہی دانش مندی ہے۔ آپ نے تو پہلے کبھی تہذیب کا واسطہ نہیں دیا۔ کبھی دین وایمان کی بات نہیں کی۔ ایسی باتیں اس وقت یاد آتی ہیں جب ہم اپنے ہی جیسے انسانوں سے شکست کھاتے ہیں یا اتنے بوڑھے ہو جاتے ہیں کہ کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے یا کسی کا بھلا نہیں کر سکتے۔ کیا آپ میرا بھلا نہیں کر سکتے؟ کیا آپ بوڑھے ہو گئے ہیں؟"

تب میں نے ایک گہری سانس لی اور شکست خوردہ انداز میں کرسی پر بیٹھ کر سر جھکا لیا۔ میرا جھکا ہوا سر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور میرے سر کے سفید بالوں کی دھوپ چمک رہی تھی۔ وہ بھی شکست خوردہ انداز میں کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"اوہ! خدایا' آپ کے سفید بالوں کو اور آپ کے چہرے کی جھریوں کو دیکھ کر اب مجھے یاد آرہا ہے کہ میں سات سال کے بعد ملنے آئی ہوں۔ آپ کا جھکا ہوا سر بتا رہا ہے کہ آپ میرے سہاگ کو نہیں بچا سکیں گے۔ میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ میں کوئی بازاری عورت تو نہیں ہوں۔"

وہ اک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا کہ وہ

یہاں میری بوڑھی لاش پر ماتم کرنے آئی ہے۔ واقعی میں بہت پہلے ہی اخلاقی موت مرچکا تھا۔

☆------☆------☆

دوسرا مہینہ گذر رہا تھا۔ نصیبہ حواس باختہ سی رہنے لگی۔ اب یہ دستور بنا لیا تھا کہ رات کو بہت دیر سے گھر آتا تھا تاکہ وہ سوجائے اور اس کے ساتھ سونے کی ضد نہ کرے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ تمام رات کے لئے غائب ہو جاتا۔ ایسا اس وقت ہوتا جب نصیبہ اسے بہت پریشان کرتی اور اس کے پاس آکر اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی رہتی۔ وہ بہت چڑچڑی ہوگئی تھی۔ بات بات پر لڑپڑتی اور آنے والی دولت مند دلہن کو کوستی رہتی تھی۔

"آپ کس خوش فہمی میں مبتلا ہیں' میری زندگی برباد کرکے آپ کو کبھی سکون نہیں ملے گا۔ دوسری شادی کے بعد بھی آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوگی۔ تب میں کسی دن آکر پوچھوں گی کہ بانجھ کون ہے؟ میں ہوں یا آپ؟"

"تم بکواس کرتی رہتی ہو' میری شادی کے ایک سال بعد ہی آکر دیکھ لینا اس وقت میں ایک بچے کا باپ بن چکا ہوں گا۔"

نصیبہ حقارت سے بولی۔ "تو پھر آپ لکھ لیجئے کہ وہ بچہ آپ کا نہیں ہوگا' تمہاری وہ دلہن کسی کالے کر آئے گی۔"

"تم جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہو۔ خدا جانے تم سے کب پیچھا چھوٹے گا۔ یہ دو ماہ گزرتے نظر نہیں آرہے ہیں۔ اسی لئے رات کو یہاں نہیں آتا ہوں میری نیند حرام کرکے رکھ دیتی ہو۔"

وہ کبھی کبھی اپنی راتوں کی نیند اپنے دوستوں کے یہاں پوری کرنے لگا۔ ایک رات وہ اسی طرح گھر سے غائب رہا۔ اس کے ساس سسر بھی کہیں شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ وہ گھر میں تنہا پڑی ہوئی تھی کہ اتنے میں اس کا دیور شراب کے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے پر آیا اور نشے کی مستی میں زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ نصیبہ نے آگے بڑھ کر جیسے ہی دروازہ کھولا' وہ دہلیز پار کرتے وقت ٹھوکر کھاتا ہوا پھر گرتے گرتے سنبھلتا ہوا اپنی بھابی پر لد گیا۔ اس نے سہارا لیا تھا۔ نصیبہ اسے سنبھالے چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اب تک تم مجھ سے لپٹے

کیوں کھڑے ہو؟

وہ اپنے آوارہ مزاج دیور کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ جب وہ پی کر آتا ہے تو گھر والوں کی نظریں بچا بچا کر اس کی طرف کیوں گھورتا رہتا ہے۔ عورت بظاہر خاموش رہتی ہے لیکن بڑی خاموشی سے مرد کی نگاہوں کو پڑھتی رہتی ہے اور جان بوجھ کر انجان بنی رہتی ہے۔ وہ اس لئے انجان بنی رہتی ہے کہ نگاہیں اپنے مرد کی ہوں یا پرائے مرد کی وہ تعریف کی ایک ایک نظر لئے اس کے بدن کو چھوتی اور اس کے بدن کی اہمیت کا احساس دلاتی ہیں' اگر وہ کچھ نہیں ہے تو اسے بار بار دیکھا کیوں جاتا ہے؟ ان نگاہوں کے پیچھے تعریف کا یا چاہت کا کوئی جذبہ تو چھپا ہوتا ہے جو عورت کو غیر شعوری طور پر تسکین پہنچاتا ہے۔

رات اندھیری تھی۔ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ شرابی اسے شراب کی بوتل سمجھ کر چھو رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔ نصیبہ نے کہا۔

"دروازہ بند کردو محلے والوں نے اگر تمہیں اس حال میں دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔ دروازہ بند کرکے اپنے کمرے میں جاؤ میں روٹی لے کر آتی ہوں۔"

وہ روٹی لانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ دراصل اس نے اس بہکے ہوئے انسان سے ذرا دور رہنے کا بہانہ تلاش کیا تھا۔ اگرچہ وہ خود بہکنا چاہتی تھی لیکن عورتوں کے اندر اتنی قوتِ ارادی ہوتی ہے کہ بہکنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچتی سمجھتی ہیں۔ اس بات کا اچھی طرح یقین کرلیتی ہیں کہ دوسروں کے سامنے اس کی عزت اور نسوانیت تماشا نہیں بنے گی۔

وہ باورچی خانے میں آکر ایک پلیٹ میں روٹیاں اور سالن نکالتی ہوئی اپنے دیور کے متعلق سوچتی رہی اور گھبراتی رہی۔ توبہ توڑتے وقت اس کا دل بھی ٹوٹ رہا تھا کہ وہ ایک بچے کے لئے کس راستے پر چلنے والی ہے لیکن اس راستے پر چلنے کے لئے کس نے مجبور کیا؟

شاہد نے۔ اگر شاہد کسی بچے کو گود لے لیتا تو وہ کسی دوسرے کی گود میں جانے کے لئے ہرگز نہ سوچتی۔

یہ سوچتے ہی وہ اک دم سے تن کر کھڑی ہوگئی۔

"ٹھیک ہے شاہد اگر یہی چاہتے ہو تو یہی سہی۔ بعض اوقات اپنے جائز حقوق

حاصل کرنے کے لئے بہت سے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے میں بھی ایسے ہی راستے سے گذر جاؤں گی۔"

وہ سالن اور روٹی کی پلیٹیں لے کر باورچی خانے سے نکلی۔ اپنے دیور کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے جان بُوجھ کر اپنے سینے سے دوپٹہ ڈھلکا دیا۔ ان تکلفات کی قطعی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا تو وہ شرابی وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے حیرانی سے سوچا۔ "وہ کہاں چلا گیا؟" یہ سوچتے ہی پلٹ کر دیکھا تو وہ پیچھے کھڑا تھا اور دروازے کو اندر سے بند کر چکا تھا۔

صبح جب وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو اس کے بال بکھرے ہوئے تھے چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ کمرے میں آتے ہی بستر پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی اور روتے روتے سوچنے لگی۔

"یہ میں نے کیا کیا؟ آج مجھ میں اور ایک بازاری عورت میں کیا فرق رہ گیا؟ میں نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی تو مصلحت اندیشی ہوگی؟ انسان جب جان بُوجھ کر ٹھوکر کھاتا ہے اور گرتا ہے تو اپنا برا بھلا سوچ کر ہی گرتا ہے۔

میں بازاری عورت نہیں ہوں اس لئے کہ میں نے چند سکوں کی خاطر اپنے جسم کو فروخت نہیں کیا ہے۔ میں محبت کی ماری اور سستے جذبات کی بھوکی عورت نہیں ہوں۔ میں نے جذبات کی تسکین کے لئے منہ کالا نہیں کیا کتنی ہی عورتیں اپنے باپ کے اپنے شوہر کے ظلم سے تنگ آکر اور انہیں شراب کا ایک ادھا پلانے کے لئے اپنے جسم کا کاروبار کرتی ہیں' میں نے تو ایک بچے کو دودھ پلانے کے لئے ایسا کیا ہے۔

وہ بچہ کس کا ہوگا؟ کسی کا بھی ہو لیکن وہ ایک بے غیرت باپ کے نام کے اشتہار سے پہچانا جائے گا۔ اگر تمہارے گندے سماج کی تاریخ میں یہ واقعہ رونما نہیں ہوا ہے تو آج اسے لکھ لو کہ عورت تمہاری نسل کو آگے بڑھانے کے لئے بھی جسم کا کاروبار کرتی ہے۔

میں گناہ گار نہیں ہوں۔ اگر ہوں تو میرے ساتھ ڈاکٹر اور شاہد کو بھی سنگسار کرو' ان کا ضمیر مردہ کیوں ہے؟ میرا ضمیر مجھے کیوں مار ڈالتا ہے؟ عورت کو اس قدر کمزور کیوں بنا دیا گیا ہے کہ ایک گناہ کرتے ہی وہ خوف سے مرنے لگتی ہے۔ میں مر رہی ہوں۔ خدایا! مجھ بے غیرت کو تھوڑی سی زندگی دے دے۔ جب میں ایک

ننھی سی زندگی کو جنم دوں تو تُو مجھے اس دنیا سے اٹھا لینا۔ میں اس گھر والوں پر اور ان کے بچوں پر بلکہ ساری دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میں بانجھ نہیں ہوں خدا کی قسم بانجھ نہیں ہوں........."

☆======☆======☆

دوسرا مہینہ بھی رینگتے رینگتے گذر گیا۔ نصیبہ اور شاہد کے احساسات میں فرق تھا۔ شاہد کو یہ وقت گذرتا نظر نہیں آرہا تھا اور نصیبہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے پلک جھپکتے ہی یہ دو ماہ نکل گئے ہیں۔

وہ اندر ہی اندر تلملا رہی تھی۔ طلاق دینے والے ظالم کی طرح وقت بھی بے رحم ہو گیا تھا۔ بڑی تیزی سے اور بڑی بے مروتی سے گذرتا جا رہا تھا لیکن اس کے وجود کے اندر امید کی کوئی کرن روشن نہیں کر رہا تھا۔ جب تیسرا مہینہ بھی گذرنے لگا تو اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اس نے اپنے دیور کا سہارا لے کر غلطی کی ہے۔

"آخر وہ بھی شاہد کا بھائی ہے۔ دونوں بھائی ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں اور دونوں ہی بے ثمر ہیں پھر میری گود میں کوئی امید کیسے پھل پھول سکتی ہے۔ اف! میں کتنا وقت ضائع کر چکی ہوں۔ مجھے انتقام لینا ہی تھا تو میں اس گھر سے باہر کسی چاہنے والے سے ایک اولاد کی آرزو پوری کر سکتی تھی لیکن اب وقت کہاں رہا ہے؟ مجھے یاد نہیں ہے کہ کتنے دنوں میں ماں بننے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ جب پہلی بار میں ماں بننے والی تھی تو مجھ پر کیا بیتی تھی اور کس طرح آثار نمایاں ہوئے تھے' یہ سب کچھ مجھے اس لئے یاد نہیں ہے کہ ان دنوں میں اپنی بدنامی کے خیال سے گھبرائی ہوئی تھی۔"

وہ اب بھی گھبرائی ہوئی تھی کوئی راستہ اسے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں بھٹک رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کے پاس آکر پوچھا۔

"ماں تجھے تو اس بات کا تجربہ ہے کہ عورت میں ماں بننے کے آثار کتنے دنوں میں ظاہر ہوتے ہیں؟"

ماں نے دکھ بھری نظروں سے اپنی نامراد بیٹی کو دیکھا پھر جواب دیا۔

"بیٹی یہ اپنی اپنی کاٹھی پر ہے۔ جیسا بدن ہوتا ہے جیسی برداشت ہوتی ہے ویسے ہی آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ بعض عورتیں اتنی نازک مزاج ہوتی ہیں کہ رات کو میاں کے پاس سوتی ہیں صبح ہوتے ہی انہیں متلی ہونے لگتی ہے۔ بعض ایسی پتھر ہوتی ہیں کہ

ماہ دو ماہ تک انہیں اپنے اندر کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا۔"

"ماں جی مگر میں پتھر یا فولاد تو نہیں ہوں۔ ان سات برسوں میں میرے اندر کوئی تبدیلی ہونی چاہئے تھی؟"

اس کی ماں نے اپنی معلومات کے مطابق جواب دیا۔

"کبھی کبھی گناہوں کی سزا برسوں کے بعد بھی ملتی ہے۔ بیٹی نماز پڑھا کرو اور توبہ کرتی رہو۔ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اس کے بعد ہی تمہاری گود بھرے گی اور تیرا نصیبہ جاگے گا۔"

"ماں جی ڈاکٹر نے تو کبھی نماز نہیں پڑھی کبھی توبہ نہیں کی' میرے بعد بھی اس نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کی ہے پھر اسے ان گناہوں کی سزا کیوں نہیں ملتی؟ ماں جی آپ کیسی بوڑھی اور فرسودہ باتیں کر رہی ہیں' اگر نماز سے گود بھر جاتی تو آپ کی بیٹی گود بھرنے کے لئے اپنے دیور کے پاس نہ جاتی۔"

"ارے تیرا منہ سڑے۔ رنڈی چھنال بن گئی ہے کیسی بے حیائی کی باتیں کر رہی ہے اگر کسی نے سن لیا تو کھڑے کھڑے آخری طلاق ہو جائے گی۔ سچ بتا نصیبہ کیا تُو نے سچ مچ بے حیائی کی ہے؟"

"ہاں تیری نظروں میں بے حیائی ہے لیکن میرے ضمیر پر کسی طرح کا بوجھ نہیں ہے۔ شاہد جیسا سلوک میرے ساتھ کر رہے ہیں میں ویسا ہی سلوک ان کے ساتھ کروں گی۔ وہ اپنے اس نقص کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ خود بانجھ ہیں۔ وہ محض اپنے مطلب کے لئے مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کر رہے ہیں پھر میں یہ ثابت کیوں نہ کروں کہ مجھ میں کوئی نقص نہیں ہے میں ماں بن سکتی ہوں۔ ماں جی تو بھی اس بات کی گواہ ہے ہم دونوں ماں بیٹی مجبور ہیں کہ دنیا والوں کو اپنے ماضی کا حساب نہیں دے سکتیں۔ اگر لوگوں کے دل اتنے بڑے ہوتے کہ وہ سچائی کو تسلیم کر سکتے۔ اگر شاہد جیسا مرد اتنا فراخدل ہوتا کہ وہ اپنی بیوی کے کنوارپنے کے ایک گناہ کو معاف کر دیتا تو میں ابھی میڈیکل سرٹیفکیٹ لا کر شاہد کے منہ پر مار دیتی کہ لو دیکھو تمہاری میڈیکل سائنس اس بات کی گواہ ہے اور جو میڈیکل سرٹیفکیٹ دے رہا ہے وہی ایک بار میرے نادیدہ بچے کا باپ بن چکا ہے۔ اگر سچائی کے زہر کو پی کر فراخدلی سے مسکرا سکتے ہو اور مجھے معاف کر سکتے ہو تو خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں نے ایک گناہ کیا ہے مجھے بار بار گناہ

کرنے پر مجبور نہ کرو بس اتنا تسلیم کر لو کہ تم باپ نہیں بن سکتے لیکن میں ماں بن سکتی ہوں اور ضرور بن سکتی ہوں۔"

"اتنی لمبی لمبی باتیں کیوں کرتی ہے۔ بھلا عورت کا گناہ کسی نے معاف کیا ہے پگلی کہیں کی' ماں بننے کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا چاہتی ہے۔ جو رہی سہی عزت ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی۔"

"اب تو میں خاک میں مل جاؤں گی لیکن شاہد کو دکھا کر رہوں گی کہ نصیبہ کی گود میں کس طرح ایک ننھا سا بچہ کھیلتا ہے۔ طلاق ہوتی ہے ہو جائے وہ مجھے چھوڑتا ہے چھوڑ دے لیکن اس کے بعد بھی شاہد سے میرا جھگڑا رہے گا۔ دوسری شادی کے بعد بھی وہ باپ نہیں بن سکے گا لیکن ایک نہ ایک دن میں اپنا پیٹ لے کر اس کے پاس جاؤں گی' اس کا سر ندامت سے جھکاؤں گی تبھی میرا انتقام پورا ہوگا۔"

"نصیبہ تُو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ کوئی بازاری عورت بھی ایسی باتیں نہیں کرتی جیسی تُو کر رہی ہے کیا ارادہ ہے تیرا؟"

"صرف ماں بننے کا ارادہ ہے' اگر تیرا بڑھاپا اور تیرا تجربہ ماں بننے کا کوئی سیدھا سا آسان راستہ جانتا ہے تو بتا دے؟"

"بالکل سیدھا سا راستہ ہے بیٹی! طلاق ہو جانے دے۔ عدت کے دن گذارنے کے بعد دوسری شادی کر لینا۔"

"شاہد بھی اسی خوش فہمی میں دوسری شادی کر رہا ہے کہ باپ بن جائے گا لیکن میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی۔ اگر دوسرا شوہر بھی بانجھ نکلا تو کیا ہوگا۔ نہیں ماں جی میں ایسا نہیں کروں گی۔"

اس کی ماں نے غصے سے پوچھا۔

"تو پھر کیا کرے گی؟"

وہ جواب دینے سے پہلے اپنی جگہ سے اٹھی' آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے تک گئی پھر وہاں سے پلٹ کر بڑے عزم واستقلال سے بولی۔

"اب تک لڑکیوں کو بیاہنے سے پہلے ٹھونک بجا کر دیکھا جاتا رہا ہے اب میں ٹھونک بجا کر دیکھوں گی۔ جو میری گود میں ایک بچہ دے گا میں اسی سے شادی کروں گی۔ صرف ایک بچے کی شرط ہے۔ پہلے یہ شرط پوری ہوگی پھر اس سے شادی کروں

گی۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی اور ماں کا جواب سننے سے پہلے وہاں سے چلی گئی۔

☆======☆======☆

دلال بہت برا لفظ ہے مگر میں تو مکان کا دلال ہوں۔ میں نے سوسائٹی میں ایک اسٹیٹ ایجنسی کھول رکھی ہے۔ اس کاروبار میں اڑتی ہوئی آمدنی ہے۔ لگی تو روزی نہیں تو روزہ ہو جاتا ہے مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے اب سوسائٹی میں میرا کاروبار چمک گیا ہے۔ ہفتے میں ایک دو گاہک پھنس ہی جاتے ہیں اور میری جیب میں کمیشن کے چار پانچ ہزار رکھ جاتے ہیں۔

میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے مگر بال بال کنوارا ہونے کی قسم نہیں کھا سکتا۔ جب دفتر بند ہونے کا وقت ہوتا ہے تو میں صرف دروازے کو اندر سے بند کرتا ہوں' ایک بڑی سی کھڑکی شاہراہ کی طرف کھلی رہتی ہے اور اس کھڑکی کے پاس میں کوئی دیسی سستی سی شراب کی بوتل کھول کر بیٹھ جاتا ہوں' لیکن جب کوئی لڑکی میرے سامنے ہوتی ہے تو میں اپنی امارت کا بھرم قائم رکھنے کے لئے ولائتی وہسکی پیتا ہوں۔ اس روز میں تنہا تھا کیونکہ میری سیکرٹری ناراض ہو کر ملازمت چھوڑ گئی تھی کم بخت کو اتنی شاپنگ کرائی تھی پھر بھی ہتھے نہیں چڑھی۔ مجھے اس کے جانے کا افسوس نہیں تھا۔ شاپنگ میں پیسے ضائع کرنے کا افسوس تھا ورنہ ایسی تو کتنی آتی جاتی رہتی ہیں۔ میں اکثر اخباروں میں اشتہارات دیتا رہتا ہوں کہ ایک نوجوان اور اسمارٹ لڑکی کی ضرورت ہے جو سیکرٹری کے فرائض انجام دے سکے۔ رابطہ قائم کرنے کے لئے میں اپنا فون نمبر دیتا ہوں پہلے فون پر کتنی ہی ضرورت مند لڑکیاں مجھ سے ملاقات کا وقت پوچھتی ہیں۔ میں انہیں شام کو ایسے وقت بلاتا ہوں جب کہ تمام دفاتر بند ہو جاتے ہیں۔ ان کی آمد سے پہلے ہی میں ایک گلاس میں وہسکی انڈیل کر میز پر رکھ دیتا ہوں۔ جو لڑکیاں شراب کی بُو برداشت کر لیتی ہیں اور شرابی سمجھ کر بھی مجھ سے خوفزدہ نہیں ہوتیں انٹرویو کے لئے بیٹھ جاتی ہیں تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ وہ میرے پہلو میں بھی بیٹھ جایا کریں گی' ورنہ ناراض ہونے والی لڑکیاں وہسکی کا گلاس دیکھتے ہی الٹے پاؤں لوٹ جاتی ہیں لیکن جب

سے منگائی بڑھی ہے واپس جانے والی لڑکیوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔

اس روز بھی شام کے وقت میں نے وہسکی سے بھرا ہوا گلاس میز پر رکھ دیا تھا اور ٹھہر ٹھہر کر اس میں سے ایک چسکی لے رہا تھا اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آگئی ہے جس نے مجھ سے فون پر ملاقات کا وقت لیا ہے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی میری آنکھیں بھی کھل گئیں۔ مائی گاڈ ایسی حسین اور ایسی جوان لڑکی تھی کہ چند لمحوں تک میں دروازے سے ہٹ کر اسے راستہ دینا بھول گیا۔ اس نے ململ کی ایک ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ساڑھی باندھنے کا انداز اتنا دلکش تھا کہ بدن کے پیچ وخم بغاوت کے انداز میں ابھر آئے تھے۔

"کیا یہی جمشید صاحب کا آفس ہے؟"

میں نے چونک کر کہا۔ "جی ہاں۔ جی ہاں میں ہی جمشید قادری ہوں آیئے تشریف لایئے۔"

میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے راستہ دیا۔ وہ اک اندازِ بے نیازی سے بل کھاتی ہوئی اور اپنے لچکیلے بدن کا جادو جگاتی ہوئی ایک کرسی پر جاکر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گی؟"

"جی کچھ نہیں۔ میں صرف ملازمت کے لئے آئی ہوں۔"

اس کا جواب سن کر مجھے اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا۔ میں اس حسن وشباب کے مجسمے کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوگیا تھا کہ اپنے باس ہونے کی برتری کو بھول گیا تھا میں اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا پھر وہسکی کا گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔

"شراب پینا بری بات ہے لیکن میں عمدہ کوالٹی کی ولائتی وہسکی پیتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ یہ آپ کا اپنا فعل ہے' میں بھلا کیسے اعتراض کرسکتی ہوں یہاں میری حیثیت ایک ملازمہ کی ہوگی۔"

"اوہ نو نو۔ میں اپنے پاس کام کرنے والی لڑکی کو کبھی ملازمہ نہیں سمجھتا۔ دوست سمجھتا ہوں کیا تم دوست بن کر رہنا پسند کروگی؟"

"ملازمہ کی تنخواہ کیا ہوگی اور دوست کی تنخواہ کیا ہوگی؟"

"ملازمہ کی تنخواہ چار سو روپے اور دوست کی تنخواہ میں چار سو روپے کے ساتھ مہینے میں دوبار شاپنگ بھی شامل ہے۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟ صبح تم نے فون پر بتایا تھا میں بھول رہا ہوں۔"

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری سنجیدگی سے کہا۔

"میرا نام نصیبہ ہے۔"

"کہاں رہتی ہو؟"

"میں جہاں بھی رہتی ہوں آپ اس کی فکر نہ کریں' آپ مجھے جہاں بلائیں گے' میں وہاں چلی آیا کروں گی۔"

اس نے اتنی بیباکی اور بے حیائی سے جواب دیا کہ میں حیران رہ گیا۔ میں نے بے شمار لڑکیوں کے ساتھ زندگی گذاری ہے ایسی لڑکیاں جو بے حیا ہوتی ہیں اس کے باوجود وہ آخر وقت تک تھوڑا بہت ہی سہی شرم وحیا کا اظہار کرتی ہیں۔ نصیبہ پہلی عورت تھی جس نے بڑی بے حیائی سے کہہ دیا تھا کہ میں جہاں بلاؤں گا وہاں چلی آئے گی۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

"تم انٹرویو میں کامیاب ہوچکی ہو تمہاری ملازمت پکی ہے۔"

نصیبہ نے میز پر جھک کر کہا۔

"آپ مجھ سے کیا انٹرویو لیں گے' انٹرویو تو میں لینے آئی ہوں۔"

میں کچھ اس طرح چونک گیا کہ میرے گلاس سے شراب چھلک گئی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟ تم میرا انٹرویو لینا چاہتی ہو' اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"انٹرویو کا مطلب ہے صلاحیتوں کو پرکھنا۔ میں یہ پرکھنا چاہتی ہوں کہ تم میرے باس' میرے دوست اور میری تنہائی کے رازدار بننے کے قابل ہو یا نہیں؟ میں آپ کو تم اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تم نے دوستی کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اب تم میرے پہلے سوال کا جواب دو کیا تمہاری شادی ہوچکی ہے؟"

"نہیں!"

"تم پہلے ہی سوال میں ناکام ہوگئے ہو۔ میں ایسے شخص سے دوستی کرسکتی ہوں جو شادی کرچکا ہو اور بچوں کا باپ بن چکا ہو۔"

"اگر میں کسی عورت کا شوہر بن جاؤں یا کسی بچے کا باپ بن جاؤں تو تمہارا کیا بھلا ہو گا؟"

"اسی کے ساتھ میرا بھلا ہو گا۔ میں صرف ایسے شخص سے دوستی کر سکتی ہوں جس میں باپ بننے کی صلاحیت ہو۔ میں ماں بننا چاہتی ہوں کیا تم مجھے ماں بنا سکتے ہو؟"

"ایں یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تم جوان عورت ہو اور میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ تمہیں اپنی ماں کیسے بنا سکتا ہوں۔ یہ کس قسم کا انٹرویو ہے۔ کہیں تمہارا دماغی توازن بگڑا ہوا تو نہیں ہے؟"

"تمہارا دماغی توازن بگڑ رہا ہے۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ مجھے اپنی ماں بناؤ مجھے صرف ایک بچے کی آرزو ہے۔"

میں نے رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"جوان لڑکیاں تو ماں بننے سے گھبراتی ہیں۔ ہزاروں روپے خرچ کر کے بچے ضائع کراتی ہیں اور تم ہو کہ بے خوف و خطر ایک بچے کی آرزو کر رہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم شادی شدہ ہو اور تمہارے شوہر نے تمہاری یہ آرزو پوری نہیں کی ہے۔"

"کبھی میں ایک سہاگن تھی' آج ایک مطلقہ عورت ہوں۔ جس نے مجھے بانجھ ہونے کا الزام لگا کر طلاق دی ہے' میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں بانجھ نہیں ہوں' وہ خود بانجھ ہے مگر یہ باتیں تمہیں بتانے سے کیا فائدہ؟ شاید تم نے بھی ابھی تک اسی لئے شادی نہیں کی ہے کہ تم باپ نہیں بن سکتے ہو۔"

"ارے تم تو اک دم مردوں کے انداز میں کھل کر باتیں کرتی ہو۔ معلوم ہوتا ہے زندگی نے بہت بری طرح رگیدا ہے ورنہ عورت کبھی خم ٹھونک کر اس طرح مرد کے آگے نہیں آتی۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر میں یہ کہتے ہوئے کیوں شرماؤں کہ شادی کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے میں اب تک نہ جانے کتنے ناجائز بچوں کا باپ بن چکا ہوں میں تمہارے بچے کا باپ بھی بن سکتا ہوں۔"

نصیبہ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس کی خوشی دیکھ کر صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوئی پاگل عورت ہے اور ایسی پاگل آرزو لے کر آئی ہے جس کی آرزو کرتے ہوئے سارے جہاں کی لڑکیاں سہم جاتی ہیں۔ جب میں نے ایک بچے کا باپ بننے کا دعویٰ کیا تو وہ خوش ہو کر کہنے لگی۔

"جب میں سہاگن تھی تو اس بات سے بے خبر تھی کہ غربت اور بھوک کیا ہوتی ہے۔ میرا شاہد کماتا تھا اور میں کھاتی تھی۔ طلاق کے بعد میں بے سہارا ہو گئی۔ شوہر بھی چھوٹ گیا۔ تین وقت کی روٹیاں بھی چھوٹ گئیں۔ میری ماں بہت بوڑھی ہو گئی ہے اسے آنکھوں سے اچھی طرح نظر نہیں آتا۔ سلائی کے کام میں گڑبڑ کر دیتی ہے۔ اس لئے فیکٹری والے اسے کام نہیں دیتے۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے یہ ملازمت مل رہی ہے جبکہ فاقوں کی نوبت آ چکی ہو اور آپ جیسے مہربان کی ملازمت مل جائے تو مجھے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہئے۔

لیکن میں شاکر نہیں ہوں۔ تمہاری احسان مند بھی نہیں ہوں! اس وقت اللہ کا شکر ادا کروں گی اور تمہارا احسان مانوں گی جب تم مجھے ایک بچے کی ماں بنا دو گے۔ میں اب بہت غریب عورت ہوں میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے لیکن جس دن ماں بننے کے آثار پیدا ہوں گے' میں تمہیں ایک ماہ کی تنخواہ معاف کر دوں گی۔ یعنی تنخواہ کے چار سو روپے تمہیں انعام میں دوں گی۔ کوئی اتنا سخی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی کل پونجی انعام میں دے دے۔ تم اسی بات سے اندازہ کر سکتے ہو کہ میری آرزو کتنی اہم ہے اور کتنی مقدس ہے کہ میں انسان کے ایک بچے کو صرف دودھ پلانے کی خاطر بک رہی ہوں۔ اوہ خدایا تیری دنیا میں سچائی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

اس نے تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب جانے لگا۔ میں نے صرف ایک ہی پیگ پیا تھا لیکن میرے قدم اسے دیکھ کر لڑکھڑا رہے تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اندھیرا بڑھ چکا ہے۔ رات آ گئی ہے۔ آؤ میرے ساتھ چلو ہو سکتا ہے کہ اس رات کی صبح تمہارے لئے کوئی روشنی کا پیغام لے کر آئے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا اور بڑی خاموشی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

☆======☆======☆

میں ایک لیڈی ڈاکٹر ہوں۔ میرے شوہر ایک تجربہ کار اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔ ہم

میاں بیوی نے اپنی صلاحیتوں سے ایک میٹرنٹی ہوم کھول رکھا ہے۔ ہمارے زچہ خانے میں بیاہتا عورتیں ماں بننے کی آرزو لے کر آتی ہیں اور پھول جیسے بچوں کو گود میں لے کر واپس جاتی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے ہمارے یہاں آیائیں موجود ہیں لیکن ان میں سے ایک آیا ہمارے لئے دردِ سر بنی رہتی ہے۔ اس کا نام نصیبہ ہے۔

پہلے تو میں نصیبہ کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ زچہ اور بچہ کو سنبھالنے کا کوئی تجربہ اس کے پاس نہیں تھا۔ پہلے تو اس نے یہی بتایا کہ وہ کبھی ماں نہیں بنی' البتہ ماں بننے کی شدید آرزو ہے۔ وہ زبان سے نہ کہتی تب بھی میں سمجھ لیتی' کیونکہ وہ دوسری عورتوں کے بچوں کو یوں کلیجے سے لگائے رکھتی تھی جیسے ان سب کو اس نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہو۔ ہمارے یہاں زچگی کے لئے آنے والی عورتیں اس سے بہت خوش رہتی تھیں کیونکہ وہ راتیں جاگ کر ان بچوں کی دیکھ بھال کرتی رہتی تھی۔

وہ خود تو کبھی ماں نہیں بنی تھی لیکن ماں بننے والی عورتوں کے پاس بیٹھ کر پیش گوئی کرتی تھی کہ انہیں لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ ایک بار میں نے خود اپنے کانوں سے سنا وہ ایک عورت کے پاس بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔ اس عورت کی زچگی کا وقت قریب آچکا تھا۔ وہ رہ رہ کر تکلیف میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ جب اسے ذرا آرام آتا تو وہ بڑے اشتیاق سے نصیبہ سے کہنے لگتی۔

"پتہ نہیں لڑکا ہوگا یا لڑکی؟"

نصیبہ نے جواب دیا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں پتہ چل جائے گا۔ آپ کا بچہ آپ کے سامنے آجائے گا۔"

اس عورت نے کہا۔ "پیدا ہوتے ہی اپنے بچے کو دیکھنے کا موقع کہاں ملتا ہے اسے تو آیائیں نہلانے اور وزن کرنے کے لئے اٹھا کر لے جاتی ہیں گھنٹوں نتیجے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

"انتظار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آیا بچے کو لے جاتی ہے تو لے جاتی رہے' آپ اپنے بچے کے رونے کی آواز تو سن سکتی ہیں۔ بچہ روتے وقت خود بتا دیتا ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔"

اس عورت نے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"وہ کیسے؟"

نصیبہ نے جواب دیا۔ "وہ ایسے کہ بچہ روتے وقت "واں واں" کی آواز نکالے تو وہ لڑکی ہے اور "یاں یاں" کی آواز نکالے تو وہ لڑکا ہے۔ یعنی واں واں کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں یعنی وہ لڑکی ہے اپنے سسرال جانے کے لئے واں واں کرتی ہے چونکہ لڑکا ماں باپ کے پاس ہی رہتا ہے اس لئے یاں یاں کرتا ہے یعنی یہیں رہنا ہے۔"

میں کمرے کے باہر کھڑی ہوئی اس آدھی ماں کی باتیں سن رہی تھی' جو آدھی پاگل بھی تھی۔ میں ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اسے کان سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بے تکے لطیفے تم کہاں سے سن کر آتی ہو؟"

اس عورت نے حیرانی سے پوچھا۔

"اچھا تو یہ کوئی لطیفہ تھا؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ یہ کوئی بہت ہی گہرے تجربے کی باتیں کر رہی ہے۔"

"یہ کیا خاک تجربے کی باتیں کرے گی کبھی خود ایک بچے کی ماں نہ بن سکی۔"

یہ کہتے وقت میں یہ نہیں جانتی تھی کہ ماں نہ بننا اس کے لئے ایک بہت بڑی گالی ہے۔ وہ اچانک ہی ایک دم سے بپھر گئی ایک جھٹکے سے اس نے اپنا کان میرے ہاتھ سے چھڑایا پھر جیسے للکارنے کے انداز میں بولی۔

"کون کہتا ہے کہ میں ماں نہیں بن سکتی۔ آپ عورت ہو کر ایک عورت کی توہین کر رہی ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ دنیا میں کوئی ایسا مرد ہی نہیں ہے جو مجھے ماں بنا سکے۔"

ہم سب ہکابکا سی ہو کر اس کا منہ تکنے لگیں۔ چونکہ میں اس کے ماضی کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی اس لئے اس کی یہ باتیں بے تکی اور بے مقصد لگیں۔ اس سے قبل بھی آیاؤں نے اس کی شکایت کی تھی کہ وہ مردوں کے متعلق گندی باتیں کرتی ہے۔ جو مرد میٹرنٹی ہوم میں اپنی بیوی اور بچے کو دیکھنے آتے ہیں نصیبہ ان مردوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے اور کچھ ایسی باتیں کرتی ہے جیسے وہ ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ بھگا کر لے جائے گی۔

لیکن یہ سب محض شکایتیں تھیں۔ میں نے نصیبہ کے چال چلن میں ایسی کوئی خرابی نہیں دیکھی تھی البتہ اس کی بے تکی باتیں سن کر میں اسے آدھی پاگل کہا کرتی

تھی مگر اس وقت اس نے کچھ اس طرح للکارنے کے انداز میں ماں بننے کا دعویٰ کیا کہ بعد میں، میں سنجیدگی سے اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ یوں بھی اس وقت میں ایک زچگی کے کیس میں مصروف تھی۔ رات کو سوتے وقت آپ ہی آپ نصیبہ میرے خیال میں چلی آئی۔ اس نے ملازمت حاصل کرتے وقت مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت غریب ہے۔ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی ہے اور مستقل آمدنی نہ ہونے کے باعث کئی وقت کے فاقے کرتی ہے۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے ملازمت دینے سے پہلے چند ضروری باتیں اس سے پوچھیں۔ عورتوں کے سلسلے میں سب سے ضروری سوال یہی ہوتا ہے کہ اس کی شادی ہو گئی ہے یا نہیں؟

اس نے صاف گوئی سے کام لے کر بتایا کہ وہ ایک مطلقہ عورت ہے۔ میں نے طلاق کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا۔

"وجہ یہ ہے کہ میرا وہ شوہر باپ نہیں بن سکتا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم الٹا جواب دے رہی ہو۔ طلاق کی وجہ یہ ہو گی کہ تم ماں نہیں بن سکتی ہو۔"

"نہیں میں ماں بن سکتی ہوں۔ اگر وہ مرد اپنا طبی معائنہ کراتا تو اسے اپنے نقص کا پتہ چل جاتا۔"

"کیا تم نے اپنا طبی معائنہ کرایا تھا؟"

میرے اس سوال پر وہ ذرا سا ہچکچائی پھر اس نے کہا۔

"ہاں میرا طبی معائنہ ہو چکا ہے میں ماں بن سکتی ہوں۔"

"تعجب ہے کہ جب تم بانجھ نہیں ہو تو اس نے تمہیں طلاق کیسے دے دی؟"

"اس لئے کہ وہ ایک دولت مند لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا بلکہ کر چکا ہے اب میں دیکھوں گی کہ وہ اُلو کا پٹھا کیسے باپ بنتا ہے؟"

"بری بات ہے نصیبہ، کسی کو پیٹھ پیچھے گالی نہیں دیتے۔"

"کسی مرد نے آپ کا دل جلایا ہوتا تو آپ بھی اسی طرح گالی دیتیں۔"

"کسی ایک دو مرد کی باتیں نہ کرو تمام مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ تم نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا ہے میں ان کے ساتھ بہت ہی خوشگوار ازدواجی زندگی گذار رہی ہوں۔ ان کی محبت نے میرے لئے اس دنیا کو بہت خوبصورت بنا دیا ہے اس لئے میں

مردذات کو برا نہیں کہہ سکتی۔ بے شک ایک مرد نے تم سے فریب کیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساری دنیا فریبی ہے۔"

نصیبہ نے جواب دیا۔ "میں آپ کی یہ بات نہیں مانتی۔ میرے ساتھ ایک نے نہیں کتنے ہی مردوں نے فریب کیا ہے۔ دراصل یہ اپنے اپنے تجربے کی باتیں ہیں۔ اب تک آپ پر پھول برس رہے ہیں اور مجھ پر پتھر برسائے جا رہے ہیں۔ میں آپ سے بحث نہیں کروں گی اس لئے کہ آپ کے پاس ملازمت کرنے آئی ہوں۔"

میں بستر پر لیٹی ہوئی نصیبہ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ میرے شوہر کروٹ بدل کر میرے قریب آ گئے۔ انہوں نے بڑے پیار سے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے خلافِ معمول ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

میں بتانا چاہتی تھی کہ نصیبہ کے متعلق سوچ رہی ہوں لیکن کچھ بتانے سے پہلے ہی نیچے میٹرنٹی ہوم سے شور سنائی دیا۔ دو چار عورتیں چیخ چیخ کر باتیں کر رہی تھیں۔ میں فوراً ہی بستر سے اٹھ گئی کھڑکی کا پردہ سرکا کر میں نے جھانک کر نیچے دیکھا تو وہاں دو تین آیائیں اور ایک بوڑھی عورت کھڑی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت نصیبہ کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے کوس رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ بوڑھی خاتون کون ہے؟"

اس بوڑھی عورت نے سر اٹھا کر کھڑکی کی جانب دیکھا پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی بولی۔

"ڈاکٹرنی صاحبہ آپ یہاں بدکار عورتوں کو آیائیں بنا کر رکھتی ہیں۔ کیا اس کلموہی کو ڈورے ڈالنے کے لئے میرا ہی داماد ملا تھا؟"

یہ سنتے ہی مجھے غصہ آ گیا کیونکہ میرے میٹرنٹی ہوم کی شہرت کو دھکا لگ رہا تھا۔ نصیبہ پر جیسا شرمناک الزام لگایا جا رہا تھا اس کے پیشِ نظر اسے شرم سے زمین میں گڑ جانا چاہئے تھا لیکن وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی اور بڑھیا کو بے وقوف اور پاگل کہہ رہی تھی۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"نصیبہ! یہ کیا بے حیائی ہے؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس بے شرمی کے بعد میں تمہیں یہاں ملازم رکھوں گی۔ چلو یہاں آؤ میں ابھی تمہارا حساب کرتی ہوں۔"

میری ڈانٹ ڈپٹ کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا وہ بدستور ہنستی رہی۔ میرے شوہر نے وہاں کھڑی ہوئی آیاؤں سے کہا کہ وہ اسے پکڑ کر اوپر لے آئیں اور بوڑھی عورت کو تسلی دی کہ ہم ابھی اسے ملازمت سے الگ کر دیں گے۔

ہم نے کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ میرے شوہر نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"خالدہ! تم دوسروں کی غریبی پر ترس کھا کر اپنے کاروبار کو نقصان پہنچاتی ہو خصوصاً عورتوں کو ملازمت دینے سے پہلے ان کے متعلق اچھی طرح چھان بین کرنی چاہئے۔"

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ واقعی میں نے نصیبہ کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ اسی وقت دو آیائیں نصیبہ کو دونوں طرف سے پکڑ کر کمرے میں لے آئیں۔ میں نے دونوں آیاؤں کو وہاں سے جانے کے لئے کہا۔ جب وہ چلی گئیں تو میرے شوہر نے نصیبہ سے کہا۔

"یہ شریفوں کی جگہ ہے اور یہاں شریف گھرانے کی عورتیں آتی ہیں اور تمہارے بیباک قہقہے بتا رہے ہیں کہ تم نے بازاری عورتوں کی سی حرکت کی ہے۔"

ان کی باتیں سن کر وہ فرش پر بیٹھ گئی پھر عاجزی سے بولی۔ "میں بازاری عورت نہیں ہوں۔ بازاری عورت کبھی ماں نہیں بننا چاہتی۔ آج میں آپ کو سچ بات بتا دوں کہ میں اس میٹرنٹی ہوم میں ماں بننے کے لئے آئی ہوں مجھے کسی ایسے مرد کی تلاش ہے جو مجھے ماں بنا سکے۔ میری شادی کو سات برس گزر گئے۔ مجھے طلاق حاصل کئے چار برس گزر گئے۔ ان گیارہ برسوں میں میں نے کتنے ہی مردوں کے آگے اپنی جوانی کا قیمتی سرمایہ لٹایا مگر سبھی بانجھ نکلے یا یوں کہئے کہ مردوں کے انتخاب میں مجھ سے غلطی ہوتی رہی۔ آخر مجھے عقل آئی کہ مجھے کسی زچہ خانے میں ملازمت کرنی چاہئے کیونکہ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کھرے مرد اپنے بیوی بچوں سے ملنے آتے ہیں اگر ان میں سے کوئی میرے ہونے والے بچے کا باپ بننے پر راضی ہو جائے تو میرا چیلنج پورا ہو جائے گا۔"

اس کی باتیں سن کر میں اپنے شوہر کا منہ تکنے لگی، اور وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔ ہم نے اپنی زندگی میں اتنی عجیب و غریب عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ کسی

مرد سے تعلقات قائم کرنے کو بے حیائی نہیں سمجھتی تھی شاید اس لئے کہ وہ تعلقات فاحشہ بننے کے لئے نہیں ماں بننے کے لئے ہوتے۔ میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"کیا ماں بننے کے لئے تمہیں یہی میٹرنٹی ہوم ملا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "میٹرنٹی ہوم کوئی بھی ہوتا وہاں عورتیں ماں ہی بننے کے لئے آتی ہیں خواہ جائز بچے کی ماں بنیں یا ناجائز بچے کی۔ دیکھئے' برا مت مانئے گا یہاں جتنی عورتیں ماں بننے کے لئے آتی ہیں آپ ان کا میرج سرٹیفکیٹ نہیں دیکھتی ہیں۔ آپ کی لاعلمی میں کوئی اپنی بہن کے یا بیٹی کے گناہ کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے انہیں شادی شدہ بنا کر لے آتا ہے۔ آپ جائز طریقے سے اپنا فرض پورا کرتی ہیں لیکن بچے ناجائز طریقوں سے آتے ہیں۔ ان شریف عورتوں میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ میں سیدھے سادے انداز میں سچ بول کر ایک ناجائز بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ یہ دنیا آخر سچائی سے اتنی ڈرتی کیوں ہے اور فریب کھا کر اس خوش فہمی میں مبتلا کیوں رہتی ہے کہ وہ فریب نہیں کھا رہی ہے؟"

وہ بول رہی تھی اور ہم سن رہے تھے۔ ہم میاں بیوی کو چپ ہی لگ گئی تھی کیونکہ اس کی زبان سے ہمارے گھناؤنے معاشرے کی زہریلی سچائی بول رہی تھی۔ ہم دونوں ڈاکٹر میاں بیوی بظاہر اس حقیقت کا اعتراف نہیں کر سکتے تھے لیکن دل ہی دل میں یہ تسلیم کرتے تھے کہ بڑے بڑے گھرانوں کے لوگ کنواری لڑکیوں کو بظاہر شادی شدہ بنا کر اور ان سے طرح طرح کے رشتے جوڑ کر میٹرنٹی ہوم میں لاتے ہیں اور انہیں ایک بچے کی ماں بنا کر لے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں ان بچوں کا کیا انجام ہوتا ہو گا مگر ان کی دولت کنواری ماؤں کے دامن سے گناہ کا داغ دھو دیتی ہے۔

نصیبہ کی سچائی ہمیں زہر لگ رہی تھی۔ چونکہ وہاں کوئی نہیں تھا اس لئے بڑی خاموشی سے ہم نے اس زہر کو پی لیا۔ میں عورت ہوں' عورت کے درد کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ جب میں نے اس کی باتوں سے محسوس کیا کہ اس کی کڑوی زبان کے پیچھے ماضی کے بہت سے کڑوے تجربے چھپے ہوئے ہیں تو مجھ میں ایک تجسس پیدا ہوا میں نے اسے کریدنے کے لئے پوچھا۔

"کیا واقعی یہ سچ ہے کہ تم کتنے ہی مردوں سے مل چکی ہو اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ جھوٹ ہے کہ تم اپنا طبی معائنہ کرا چکی ہو تم سچ مچ بانجھ ہو۔"

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

"نہیں میں بانجھ نہیں ہو۔ میں سولہ برس کی عمر میں ایک بار ماں بن چکی ہوں۔ ایک ہری بھری کھیتی کیسے اجڑ سکتی ہے؟ آپ لیڈی ڈاکٹر ہیں آپ خود بتایئے کہ میں دوسری بار اب تک ماں کیوں نہیں بن سکی؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے تمہارے اندر کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ دوبارہ چیک اپ کی ضرورت ہے۔"

"دس بار چیک اپ ہو چکا ہے کنوارے پن میں جس ڈاکٹر کے بچے کی ماں بنی تھی' اس نے کئی بار چیک کیا' میری شادی کے سات سال بعد بھی مجھے چیک کیا اور ہر بار مجھے یقین دلاتا رہا کہ میں ماں بن سکتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ ڈاکٹر کون ہے؟"

تب وہ شروع سے آخر تک اپنی زہریلی داستان سنانے لگی۔ اگر داستان تاثر انگیز ہو تو اسے بیان کرنے کا سلیقہ آتا ہو تو سننے والے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں پہلے ہماری آنکھوں کے سامنے اس کے ماضی کے ایک ایک اہم واقعہ کی فلم چلتی رہی۔

ہم نے ذہن کی اسکرین پر دیکھا کہ ایک نام نہاد ڈاکٹر کس طرح پندرہ برس کی ایک معصوم بچی کو عورت بناتا ہے۔ نصیبہ کو بے حیا کہنے والے کیا یہ سوچنا گوارہ نہیں کریں گے کہ اس کی بے حیائی کی ابتدا کیسے ہوئی؟

پھر ہم نے ذہن کی اسکرین پر دیکھا کہ وہ لڑکی جو سولہ برس کی عمر میں ماں بن گئی تھی' سہاگن بننے کے سات سال بعد بھی ماں نہ بن سکی۔ شوہر نے اس پر کیسے کیسے ظلم کئے۔ ایک دولت مند لڑکی کو بیاہ کر لانے کے لئے اسے طلاق لینے پر مجبور کیا۔ جب وہ ہر طرح کے ظلم سہنے کے بعد بھی طلاق لینے پر راضی نہ ہوئی تو وہ ظالم تیزاب کی بوتل لے کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ایک ڈاکٹر نے اس کی تقدیر بگاڑ دی تھی ایک مجازی خدا اس کا چہرہ بگاڑ رہا تھا۔

پھر منظر بدل گیا۔ ہم نے دیکھا جو معصومیت سے لٹ جایا کرتی تھی' اب وہ مکاری سے لٹنے کے لئے تیار ہو گئی کبھی کبھی ماں بننے کے لئے بھی مکاری کرنی پڑتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بار ماں بن چکی ہے پھر ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ دوسری بار ماں نہ بن سکے۔ اسی لئے وہ ناجائز طریقے سے بھی ماں بن کر شاہد کو چیلنج کرنا چاہتی تھی۔ اتفاق

سے اس کا یہ چیلنج پورا ہو گیا تھا کہ دوسری شادی کے چار سال بعد بھی وہ باپ نہ بن سکا لیکن نصیبہ اسے طعنے دینے اور لعنت ملامت کرنے اس کے پاس اس لئے نہ جا سکی کہ وہ خود ماں نہ بن کر کمزور پڑتی جا رہی تھی' وہ جن کے پاس ماں بننے کے لئے گئی تھی' ان کے نام میرے سامنے گنوا دیئے پھر میرے قدموں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں عیاش اور بدکار عورت نہیں ہوں۔ دنیا جہان کے مقاصد پورے کرنے کے لئے جھوٹ فریب اور مکاری سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن کوئی بھی عورت ماں بننے کے لئے بدکار نہیں بنتی۔ اگر یہ بدکاری ہے تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ مجھے ماں اور بچے کے مقدس رشتے تک پہنچنے کے لئے ان غلاظتوں سے گذرنا پڑ رہا ہے۔ آپ ہی انصاف سے بتائیں کیا میں بدکار ہوں؟"

اس کے اس سوال کا ہمارے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا کیونکہ وہ جو کچھ کر رہی تھی' وہ مذہب' قانون اور اخلاق کے دائرے میں بے شک بدکاری تھی لیکن اس کے باوجود وہ مظلوم تھی۔ ساری دنیا اسے جھوٹی سمجھ رہی تھی اور اس طرح اسے قدم قدم پر للکار رہی تھی کہ اگر وہ سچی ہے تو اپنی سچائی ثابت کرے اور اپنی سچائی ثابت کرنے کا اس کے سامنے یہی راستہ تھا۔ وہ دوسری تیسری شادیاں کر کے بار بار تیزاب کی بوتلوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی' بار بار طلاق کی اذیتیں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ صرف اسی سے شادی کر سکتی تھی جو اسے ایک بچے کی ماں بنا دے۔ میں نے اسے سمجھایا۔

"نصیبہ! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں مانتی ہوں کہ تم پر بہت ظلم ہوا ہے لیکن آئندہ خوشگوار زندگی گذارنے کے لئے پچھلی زندگی کی اذیتوں کو بھولنا پڑتا ہے یا پھر ایک لاش بن کر ساری عمر گھسٹنا پڑتا ہے۔ تم نے خود کو ایک لاش کیوں بنا لیا ہے؟ تم ماں بننا کیوں چاہتی ہو؟ اگر تم شاہد کو چیلنج کرنا چاہتی ہو تو مٹی ڈالو اس چیلنج پر' اگر تم ماں بن گئیں تب بھی بے غیرتوں کو غیرت نہیں آئے گی کہ ان کی وجہ سے تم نے کس طرح تہذیب پر کیچڑ اچھالی ہے۔ نصیبہ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تمہاری اچھائی کو اس دنیا نے برائی میں بدل دیا ہے۔ تم چاہو تو اس برائی کو پھر اچھائی میں بدل سکتی ہو اور تمام برائیوں کا خاتمہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ماں بننے کے خیال سے باز آجاؤ۔"

اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر مجھے تعجب سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیسے باز آجاؤں؟ آپ ایک لیڈی ڈاکٹر ہو کر خلافِ فطرت ایسی باتیں مجھے کیوں سمجھا رہی ہیں؟ آپ کے میٹرنٹی ہوم میں ایک عورت دردِ زہ میں مبتلا ہو اور ایک بچہ وجود میں آنے کے لئے ہمک رہا ہو تو کیا ایسے وقت میں آپ اس عورت سے کہیں گی کہ وہ ماں بننے کے خیال سے باز آجائے؟ آپ کیسی عورت ہیں۔ آپ نے ابھی تک میرے درد کو نہیں سمجھا کہ میں وہ عورت ہوں جو گیارہ سال سے دردِ زہ میں مبتلا ہے گیارہ سال سے ایک بچہ عالم وجود میں آنے کے لئے میری کوکھ میں تڑپ رہا ہے کیا آپ کی تمام صلاحیتیں مرگئی ہیں۔ ہزاروں عورتوں کو ماں بنانے والی صلاحیتیں میرے سامنے آکر کیوں دم توڑ چکی ہیں۔ اگر آپ سچی ہیں اور دنیا آپ کی سچائی کو تسلیم نہ کرے تو کیا آپ جھوٹی عورت بن کر اتنی لمبی عمر یہاں گذار سکیں گی؟ کیا آپ خود کو حقیر اور کمتر محسوس نہیں کریں گی؟ میں نے تو اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا لیکن پھر بھی ماں نہ بن سکی۔ آپ کہتی ہیں کہ میرے اندر کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں کہ اگر کوئی خرابی ہے تو ایک بار پھر میرا معائنہ کیجئے اور اس خرابی کو دور کیجئے۔ اگر وہ خرابی دور نہ ہوئی اگر میں ماں نہ بن سکی تو اللہ کی قسم مرجاؤں گی۔"

میں نے اپنے شوہر سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ معائنہ لازمی ہے۔ اس کا معائنہ کرنے کے بعد ہم اسے کسی دوسری جگہ ملازمت دلانے کی کوشش کریں گے۔ ہم اپنے یہاں اسے نہیں رکھ سکتے۔ اس بوڑھی عورت کے سامنے اسے یہاں سے نکال کر اپنے میٹرنٹی ہوم کو بدنامی سے بچا سکتے ہیں۔

ان کی باتیں سننے کے بعد نصیبہ کے ساتھ میں نیچے میٹرنٹی ہوم میں چلی گئی۔ میرے دفتر میں پارٹیشن کے پیچھے ایک بیڈ تھا۔ میں نے نصیبہ کو اس پر لیٹ جانے کے لئے کہا۔ وہ میری ہدایت کے مطابق لیٹ گئی۔ میں اپنے ایک ہاتھ میں ربڑ کا دستانہ پہننے لگی۔

رات کافی گذر چکی تھی۔ پارٹیشن کے پیچھے سو کینڈل پاور کا بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں کتنے ہی پوسٹر پارٹیشن کی دیواروں میں چسپاں تھے۔ وہ پوسٹر عورتوں کو بچے کم خوشحال گھرانے کی نصیحتیں کرتے تھے۔ ان میں ایک پوسٹر ایسا تھا جو بچت کا درس دیتا تھا۔ اس پوسٹر میں دو عورتیں دکھائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تعلیم یافتہ عورت بینک میں رقم جمع کر رہی تھی۔ پوسٹر کے دوسرے حصے میں ایک جاہل عورت

فرش پر بیٹھی ہوئی مٹی کی گولک کو الٹ کر پیسے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پیسے کی بجائے اس میں سے سوالیہ نشان نکل رہا تھا۔ اخراجات کے ہجوم میں عورت یہ حساب نہیں رکھ پاتی کہ اس کی گولک کب خالی ہو گئی ہے۔

ہاں گولک خالی ہو گئی تھی۔ میرے دستانے میں چھپی ہوئی انگلیاں کانپنے لگیں۔ میں نے کتنی ہی عورتوں کی گود بھری تھی۔ اس وقت اچانک ہی میری کوکھ میں انگارے بھر گئے تھے میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ دل اس طرح ڈوبا جا رہا تھا کہ کھڑے ہونے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔ میں دستانے اتارتی ہوئی پارٹیشن سے باہر جانے لگی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

"بی بی جی کیا ہوا؟"

میں اس کی طرف نہ دیکھ سکی منہ پھیر کر بولی۔

"سب ٹھیک ہے.......... سب ٹھیک ہے۔ تم یہاں آرام سے لیٹو میں ڈاکٹر صاحب سے مشورہ لے کر آتی ہوں۔"

ہزار ضبط کے باوجود ایسا کہتے وقت میرے دانت بجتے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے تیز بخار چڑھ گیا ہو۔ میں وہاں سے آگے بڑھتی ہوئی دستانے ایک طرف اتار کر پھینکتی ہوئی دفتر سے باہر نکلی' زینے تک پہنچی' زینے پر لڑکھڑاتی گئی۔ نصیبہ کے راستے میں ٹھوکریں تھیں اور میں لڑکھڑا رہی تھی۔ کیونکہ میں بھی اس کی طرح ایک عورت تھی۔ میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اپنے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچی مجھے اس حال میں دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ گئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب پہنچتے' میں بے دم سی ہو کر فرش پر گر پڑی اور گرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"خالدہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیا نصیبہ نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟"

وہ میرے قریب فرش پر دو زانو ہو گئے اور ہاتھ بڑھا کر مجھے اٹھانے لگے۔ میں اچانک ہی ان کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گئی اور چیختی ہوئی بولی۔

"مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہ مردانہ ہاتھ جو عورت کو پناہ دیتے ہیں' آج ان سے لہو ٹپکتا ہوا نظر آرہا ہے۔ تم سب ایسے بے رحم قصائی کیوں بن جاتے ہو؟ تم نے ایک لڑکی کو سولہ برس کی کچی جوانی میں مار دیا۔ کیا اس ڈاکٹر کی کوئی سولہ برس کی بیٹی نہیں

تھی۔ تم لوگ کیسے ہو کبھی تیزاب کی بوتل لے کر چہرے بگاڑتے ہو کبھی شراب کی بوتل لے کر اس کی مستی میں اس کی کوکھ اجاڑ دیتے ہو؟"

انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے خالدہ؟ میں نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے کہ تم مجھے الزام دے رہی ہو۔ ابھی تم نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مجھ پر سے تمہارا اعتماد اٹھ گیا؟ کیا تم مجھے گناہگار سمجھتی ہو؟"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میری آنکھوں کے جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے اس پار ایک ایسا مرد نظر آیا جو ہمیشہ ایک شریف انسان ہونے کی مثالیں پیش کرتا رہا ہے۔ میں تڑپ کر آگے بڑھی اور اس کی آغوش میں جا کر چھپ گئی پھر روتے روتے ہچکیوں کے درمیان کہنے لگی۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ اس دنیا میں اتنے شیطان ہیں کہ وقتی طور پر سچے انسانوں سے بھی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ ہائے نصیبہ کی کوکھ اجڑ گئی ہے۔ کسی عیاش مرد نے ہمیشہ کے لئے اسے بنجر بنا دیا ہے تاکہ وہ صرف عیاشی کے کام آتی رہے اور وہ پاگل ایسی ہے کہ اپنا سب سے اہم سرمایہ لٹا کر بھی اسے اپنے لٹنے کی خبر نہیں ہے۔ اس نے کیا کھویا ہے یہ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ عورت ماں کے رشتے تک پہنچنے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ اس سے اس کی تکمیل چھین لی گئی ہے۔ ممتا کا غرور چھین لیا گیا ہے اور اس کی نسوانیت کی حیا کو کچل دیا گیا ہے۔ اب اس میں کیا رہ گیا ہے میں کس زبان سے اسے بتاؤں کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ بتاؤں گی تو وہ صدمے سے مر جائے گی یا پاگل ہو جائے گی۔"

انہوں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اس نام نہاد ڈاکٹر فخرالدین کو پولیس کے حوالے کرنا چاہئے۔"

میں نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کیا اسے قانون کے حوالے کرنے سے نصیبہ ماں بن جائے گی۔ نہیں بلکہ بدنام ہو جائے گی جو بات چھپی ہوئی ہے وہ دنیا کی زبان پر آ جائے گی ابھی تو اس کے جھوٹے غرور نے اسے زندہ رکھا ہے کہ وہ ماں بن سکتی ہے۔ ہم ڈاکٹر ہیں ہم بعض مریضوں کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے اور انہیں کچھ عرصہ زندہ رکھنے کے لئے کیا ان سے

جھوٹ نہیں بولتے کہ ان کا مرض قابلِ علاج ہے؟ کیا ہم نصیبہ کو الٹی سیدھی باتیں سمجھا کر یہ تسلی نہیں دے سکتے کہ وہ ایک دن ماں بنے گی لیکن ابھی نہیں بنے گی اور ناجائز بچے کی ماں نہیں بنے گی کیونکہ ماں بننے کا فرض بہت ہی مقدس ہوتا ہے۔ اس تقدس کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ دوا اور دعا دونوں سے کام لے۔ دوا اسے امید دلاتی رہے گی اور دعا اسے پاکیزگی اور عبادت کی طرف مائل کرتی رہے گی۔ ہم اسی طرح اسے نیکی کے راستے پر لا سکتے ہیں اور دلاسے دے کر زندہ رکھ سکتے ہیں۔"

انہوں نے تائید کی۔ "ہاں! اس دنیا میں انسان امید کے سہارے ہی زندہ رہتا ہے۔ تقدیر اسے مایوس کرتی رہتی ہے لیکن ہماری مذہبی تعلیم صبر کرنا سکھاتی رہتی ہے۔ اس طرح انسان صبر کرتے کرتے ساری زندگی گذار دیتا ہے۔ تم ٹھیک کہتی ہو نصیبہ کے لئے جھوٹی دوا اور سچی دعا لازمی ہے۔ جھوٹی دوا ہم دیں گے، سچی دعا وہ خود کرتی رہے گی۔"

☆------☆------☆

میرا نام زاہدہ شاہد ہے۔ جب میری شادی ہوئی تو میرے باپ کے پاس کافی دولت تھی۔ میں نے دولت کے بل پر ایک خوبصورت نوجوان سے شادی کرلی۔ میرے شوہر جتنے حسین ہیں اتنے ہی ذہین بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی ذہانت سے میرے ڈیڈی کا دل اور ان کا کاروبار جیت لیا۔ ڈیڈی ان کی شرافت اور ذہانت سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی تمام دولت اور جائیداد ان کے نام لکھ دی یا انہوں نے کوئی چکر چلا کر لکھوالی۔ ایسا میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اوپر سے انسان اور اندر سے شیطان ہیں۔ دولت حاصل کرنے کے بعد اب وہ زیادہ وقت میرے ساتھ نہیں گذارتے۔ کاروباری دورے کے لئے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں کئی کئی ماہ گذار دیتے ہیں۔ پچھلے دو سالوں سے وہ مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں کہ اگر میں ماں نہ بنی تو وہ مجھے طلاق دے کر دوسری شادی کرلیں گے۔ دوسری نہیں' بلکہ تیسری شادی کریں گے کیونکہ میں وہ عورت ہوں جس نے ایک مطلقہ عورت کی لاش پر کھڑے ہو کر سہاگ کا جوڑا پہنا ہے۔ شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں شاہد کی دوسری بیوی اور اب آنے والی تیسری بیوی سے خوفزدہ ہوں۔

شاہد کی پہلی بیوی پتہ نہیں کیا کچھ یہاں سے ہار گئی ہے لیکن میں اس کی طرح اپنا سہاگ بھی ہاروں گی اور اپنے مرحوم باپ کی تمام دولت اور جائیداد سے بھی محروم ہو جاؤں گی لیکن مین شاہد کی پہلی بیوی کی طرح نادان نہیں ہوں۔ سنا ہے' اس کا نام نصیبہ تھا۔ نصیبہ نادان تھی ایک مکار کے ساتھ مکاری نہ کرسکی لیکن میرے سامنے شاہد کی پچھلی زندگی کا تمام حساب موجود ہے۔ سات سال اس نے نصیبہ کے ساتھ گذارے' پانچ سال میرے ساتھ گذار چکا ہے۔ ان بارہ برسوں میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ بانجھ ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اپنے نقص کو تسلیم نہیں کرتا۔ جو کچھ بھی ہو میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔

اور اسی لئے............ اسی لئے اب میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں ایک شریف گھرانے کی بیاہتا عورت ہوں۔ میرا خاوند موجود ہے۔ کس کی مجال ہے کہ اس بچے کا حساب لے سکے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے اور بڑے حساب کتاب کے ساتھ سیپ میں ایک موتی جمایا ہے مگر حساب کتاب میں کبھی کبھی گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے اور گڑبڑ ہو چکی ہے۔

شاہد یہ کہہ کر لاہور گئے تھے کہ چار دن کا مختصر سا دورہ ہے اس کے بعد وہ یہاں آئیں گے' میرے ساتھ پندرہ دن رہیں گے اس کے بعد دوبئی وغیرہ کے دورے پر چلے جائیں گے۔ جب وہ مجھ سے رخصت ہوئے تو میں ایسی بیمار تھی کہ اس مخصوص بیماری کے دوران عورت کبھی ماں نہیں بنتی۔ اس کے جانے کے چار دن کے بعد میں نے غسل کیا لباس بدلا اور اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ نئے پروگراموں میں حصہ لیتی رہی۔ ہمارا دن رات کا ساتھ تھا۔ کوئی ہمیں ٹوکنے والا نہ تھا صرف شاہد کا ڈر تھا کہ وہ اچانک ہی آنہ پہنچیں لیکن ایک ہفتہ گذر گیا وہ نہ آئے۔ ایک ماہ بعد بھی ان کی کوئی خبر نہ ملی دو ماہ بعد ان کا خط آیا کہ وہ بحرین میں ہیں۔ کاروبار میں منافع کے پیشِ نظر انہیں فوراً ہی لاہور سے بحرین جانا پڑا تھا اسی لئے وہ اپنے وعدے کے مطابق میرے ساتھ پندرہ دن گذارنے کے لئے یہاں نہ آسکے تھے۔ آگے انہوں نے لکھا تھا کہ واپسی کا کوئی ٹھیک پتہ نہیں ہے شاید دو تین ماہ لگ جائیں۔

یہ پڑھتے ہی وہ خط میری گرفت سے یوں نکل گیا جیسے ہاتھوں سے طوطے اڑتے ہیں۔ ان دنوں میری حالت غیر تھی میں قے کرنے بیٹھتی تھی لیکن ابکائیاں لے کر رہ جاتی تھی۔ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا تھا' صرف کھٹی چیزیں پسند آتی تھیں۔ یہ آثار بتا رہے تھے کہ میں ماں بننے والی تھی۔

جس مکاری سے میں نے کام لیا تھا' اس مکاری سے میں شاہد کے سامنے اس بچے کا حساب نہیں دے سکتی تھی کیونکہ جب وہ مجھ سے رخصت ہوئے تو یہ بات ان کے علم میں تھی کہ میں ان دنوں ماں بننے کے قابل نہیں ہوں۔ میں انہیں قائل نہیں کرسکتی تھی کہ میرے خون میں ان کا بچہ پرورش پا رہا ہے۔

تین ماہ گذر چکے ہیں چوتھا مہینہ گذرنے ہی والا ہے۔ اب یہ بچہ میرے لئے مصیبت بن گیا ہے۔ یہ ننھا سا وجود جو میرے سہاگ کی حفاظت کرسکتا تھا' اب ہماری

ازدواجی زندگی کی زنجیر کاٹنے والا ہے۔ لہٰذا میں اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے بہت پریشان ہوں۔ اس کا یہی راستہ ہے کہ اس وجود کے مکمل ہونے سے پہلے ہی میں اسے مٹا دوں۔ میری ممی اس سلسلے میں محلے کی ایک دائی کے پاس گئی تھیں لیکن وہ بڑھیا دائی یوم حساب سے ڈرتی ہے کہ آخرت میں پکڑی جائے گی۔ اس کے بعد ممی ایک نرس کے پاس گئیں جو زچگی کے کیس بھگتایا کرتی تھی۔ اس نے بھی ناجائز کیس کو ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے ممی کو سمجھایا کہ بچے کو ضائع کرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ یہ قانون کے خلاف ہے لیکن ایسے وقت قانون اور مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی' صرف اپنی عزت بچانے کا خیال ہوتا ہے۔ وہاں اپنی عزت اور سہاگ دونوں ہی کو بچانا تھا۔ ہم ماں بیٹی مایوس ہو کر بیٹھ گئیں۔ مجھے اپنے سامنے اپنی تباہی نظر آرہی تھی ایسے ہی وقت ایک دن ممی صدر سے بس میں بیٹھ کر آرہی تھیں کہ وہاں ایک عورت سے ملاقات ہوگئی۔ باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا کہ وہ دائی کے فرائض انجام دے لیتی ہے۔ ممی بھری بس میں اسے یہ نہیں بتا سکیں کہ کیس کی نوعیت کیا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ پہلے اسے گھر لے چلیں وہاں اسے بڑی سے بڑی رقم کا لالچ دے کر اسے اس ناجائز کام کے لئے راضی کر لیا جائے گا۔ وہ اسے لے کر سیدھی میرے کمرے میں چلی آئیں۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ کسی کل سے بھی دائی نظر نہ آرہی تھی کیونکہ وہ عورت میری ہم عمر تھی یا شاید مجھ سے کچھ بڑی تھی۔ وہ آتے ہی فرش پر بیٹھ گئی اور اِدھر اُدھر نظریں گھما کر میرے کمرے کی سجاوٹ کو دیکھنے لگی۔ اسے یہ رئیسانہ سجاوٹ دیکھ کر متاثر ہونا چاہئے تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ یہ سب کچھ دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ ممی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم کچھ اداس ہو رہی ہو؟"

اس نے جلدی سے پسینہ پونچھنے کے بہانے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو میں اداس تو نہیں ہوں۔ اتنی دور سے آرہی ہوں اس لئے تھکن کی وجہ سے شاید کچھ مرجھا گئی ہوں۔"

پھر اس نے ممی کی طرف سے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مینٹل پیس پر شاہد کی رکھی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"بی بی جی یہ کس کی تصویر ہے؟"

میں اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنی ممی کی طرف دیکھنے لگی۔ ممی کی خاموش نگاہوں نے کہا کہ ابھی مجھے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہئے کہ میں کسی کی بیوی ہوں کیونکہ شوہر والیاں بچے ضائع نہیں کراتیں۔ میری ممی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹی! یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں' ہمیں کام کی باتیں کرنی چاہئیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں زچگی کے کام کرانے کا کتنا تجربہ ہے؟"

"بہت پرانا تجربہ ہے۔ میں ایک سال تک ایک میٹرنٹی ہوم میں رہی۔ وہاں ایک بڑھیا نے اپنے داماد کے ساتھ مجھ پر بدکاری کا الزام لگایا۔ اس میٹرنٹی ہوم کی لیڈی ڈاکٹر بہت اچھی اور بہت رحم دل ہے۔ انہوں نے اپنے زچہ خانے کو بدنامی سے بچانے کے لئے مجھے وہاں سے نکال تو دیا لیکن دوسری جگہ ملازم رکھوا دیا۔ اب ایک سال سے میں اسپتال کے میٹرنٹی ہوم میں نرس کی ٹریننگ حاصل کر رہی ہوں۔ اب تک کتنے ہی بچے پیدا ہوتے ہی پہلے میرے ہاتھوں میں آچکے ہیں' مجھے اس کا خاصا تجربہ ہے۔"

میری ممی نے پوچھا۔ "کیا تم وقت سے پہلے ہی کسی کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہو؟"

وہ سوالیہ نظروں سے ہم ماں بیٹی کو دیکھنے لگی۔ میری ممی نے وضاحت کی اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میری بیٹی زاہدہ ہے۔ یہ ماں بننے والی ہے لیکن ماں نہیں بننا چاہتی۔ یہ چوتھا مہینہ چل رہا ہے کیا تم اس مصیبت سے اسے نجات دلا سکتی ہو؟"

اس عورت کی آنکھیں پہلے تو حیرت سے پھٹ گئیں پھر وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ اس کے دیکھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں سہم کر ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

"تم.......... تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟"

جواب میں اس کے لب ہلے پھر اس کی آواز جیسے کسی اندھے کنویں سے آنے لگی۔

"میں بارہ سال سے ایک بچے کی آرزو میں کانٹوں پر چل رہی ہوں۔ بارہ سال سے ایک بچہ میری کوکھ میں ہمک رہا ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو اس بچے کو ایک ننھے سے چمکتے ہوئے موتی کی طرح سیپ سے نکالے اور میری گود میں رکھ دے۔ اے بی بی وہ بچہ تیری کوکھ میں بھی ہے۔ جو عورت اپنے نادیدہ بچے کے لئے بارہ سال تک سفر کر سکتی

ہے' وہ ایک ہی لمحے میں تیرے بچے کی زندگی کیسے چھین سکتی ہے؟"
میں نے جھلا کر ممی سے کہا۔ "ممی تم کس عورت کو پکڑ کر لے آئی ہو' یہ میرا کام نہیں کر سکے گی۔"

"ہاں نہ میں کر سکوں گی اور نہ ہی کسی کو یہ کام کرنے دوں گی۔"

میں نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر چیخنے کے انداز میں کہا۔

"میں ابھی دھکے دے کر تجھے یہاں سے نکلوا دوں گی۔"

"بی بی آہستہ بول۔ میں اس دروازے سے باہر جاؤں گی تو تیری بدنامی بھی اس دروازے سے باہر نکلے گی۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ وہ اس بات کی راز دار بن چکی تھی کہ میں اپنے بچے کو ضائع کرنے کی فکر میں ہوں۔ میری ممی نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بیٹی تُو بھی ایک عورت ہے اور عورتوں کی مجبوریوں کو سمجھتی ہے۔ میری بیٹی کا سہاگ خطرے میں ہے۔ اگر یہ ماں بن گئی تو بیوی بن کر نہ رہ سکے گی۔"

اس نے کہا۔ "تعجب ہے کہ میں بیوی بن کر نہ رہ سکی اس لیے کہ ماں نہ بن سکتی تھی۔ کیا تیری بیٹی اس آدمی کی بیوی نہیں ہے؟"

اس نے شاہد کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ میری ممی نے کہا۔

"ہاں یہ اسی کی بیوی ہے لیکن اس آدمی کو بچوں سے نفرت ہے۔ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی ماں بنے۔"

وہ یک بیک فرش سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پاؤں پٹختی ہوئی بولی۔

"تم دونوں جھوٹی ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک بیوی کو اس لیے طلاق دے کہ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی اور دوسری کو اس لئے طلاق دے کہ وہ ماں بن رہی ہے۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

ہم دونوں ماں بیٹی سہمی ہوئی نظروں سے اسے تکنے لگیں۔ وہ ہمیں چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے مختصر سے لمحات صدیوں کی طرح گذر رہے تھے۔ پھر اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"میرا نام نصیبہ ہے۔"

اس کا نام سنتے ہی ہمارا تو جیسے خون خشک ہو گیا۔ میں نے جس عورت کا سہاگ اجاڑا تھا وہ میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور اب میں نے اپنے سہاگ کو اجاڑنے والی سب سے بڑی کمزوری اس کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مظلوم عورت مجھے چٹکیوں میں مسل دے گی۔

نصیبہ نے بڑی آہستگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کون ہوں۔ تُو نے مجھے میرے نام سے اور میں نے تجھے تیرے گناہ سے پہچان لیا ہے اور جب پہچان ہی لیا ہے تو تُو مجھ سے یہ جھوٹ نہ بول کہ شاہد کو بچے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "میری بہن میں اب تک جھوٹ بول رہی تھی پہلے تو میں اس بات کا اعتراف کر لوں کہ میں نے تیرا سہاگ چھین کر تجھ پر ظلم کیا ہے' اس جرم کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ شاہد کو واقعی بچے کی ضرورت ہے اور تُو خوب سمجھتی ہے کہ وہ باپ نہیں بن سکتا میں تیری طرح شرافت سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ میں اس کے لئے سچا موتی نہیں لا سکتی تھی اس لئے ہوس کے بازار سے جھوٹا موتی خرید کر لے آئی۔ میں سمجھی تھی کہ شاہد لاہور سے واپس آئے گا تو اس جھوٹے موتی پر سچائی کا ملمع چڑھالوں گی لیکن یہ میری بدنصیبی ہے کہ وہ کاروباری منافع کے لالچ میں لاہور سے سیدھے بحرین چلے گئے۔ ان کے پاس میرے پورے دنوں کا حساب ہے کہ جب وہ مجھ سے رخصت ہوئے تو میں ماں بننے کے قابل نہیں تھی' اب میں کیا جواب دوں گی کہ کیسے ماں بن گئی؟"

یہ کہتے ہی میں دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میری ممی اس سے کہہ رہی تھیں۔

"اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے اس کے انصاف میں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ ہم کس عبرت ناک مقام پر آپہنچے ہیں۔ میری بیٹی نے تمہارا سہاگ اجاڑا اور آج تم ہی سے اپنے سہاگ کی بھیک مانگ رہی ہے۔ بیٹی خدا کے لئے میری بیٹی کی غلطی کو معاف کر دے۔ اس کی عزت کو اور اس کے سہاگ کو تُو ہی بچا سکتی ہے۔ میں بوڑھی ہوں' تیری ماں کے برابر ہوں پھر بھی تیرے پاؤں پر گر کر معافی مانگتی ہوں۔"

ممی یہ کہہ کر اس کے قدموں میں جھک گئیں۔ نصیبہ جلدی سے پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

"میں ایسے صدمات کو سمجھتی ہوں جو ایک ماں کے دل پر گزرتے ہیں' کیونکہ میری ماں بھی ایسے ہی صدمات سہتے سہتے مرگئی۔ وہ بھی اسی طرح روتی بلکتی تھی کہ شاہد اس کی نصیبہ کو طلاق نہ دے۔ میں اپنی ماں کی روح کو خوش کرنے کے لئے تجھ سے ہمدردی کروں گی اور شاہد تک یہ بات نہیں پہنچاؤں گی کہ اسے کس طرح دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ میں یہ چیلنج کرنا چاہتی کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکے گا لیکن افسوس طلاق کا جو زخم میں نے کھایا ہے وہ زخم تیری بیٹی کے دل پر نہیں لگاؤں گی۔"

ہم دنوں ماں بیٹی خوش ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ ہماری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں وہ ایک ایسی پاکیزہ ہستی نظر آرہی تھی جو ابھی ابھی آسمان سے اتر کر زمین پر آئی ہو۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"تیرا سہاگ سلامت رہے گا لیکن میری التجا ہے کہ اس بچے کو ضائع نہ کر۔ میں ایک بچے کی ماری ہوں میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گی کہ وہ بچہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی قتل کردیا جائے۔ تو عورت ہے' تجھے ماں بن کر ایک ننھے سے وجود کو سمجھنا چاہئے۔"

میں نے بستر سے اٹھ کر اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔

"نصیبہ! اگر بچہ سلامت رہے گا تو میرے سہاگ کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ مجھے چھوڑ دے گا۔"

"نہیں چھوڑے گا۔" اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "اگر شاہد نے پورے دنوں کا حساب رکھا ہے تو رکھتا رہے۔ وہ جو وقت بے وقت کاروباری دورے کے لئے نکل جاتا ہے اس کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے کاروباری مصروفیات میں اپنی بیوی کے ایک ایک دن کا حساب رکھا ہو۔ تم ایک شریف عورت ہو' شادی شدہ ہو اور اپنے خاوند کے سائے میں ایک بچے کی ماں بن رہی ہو۔ قانون عورت کی زبان پر یقین کرتا ہے کیونکہ عورت سے زیادہ کوئی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس کے بچے کی ماں بن رہی ہے۔ عدالت میں جب بھی ایک بچے کی ولادت کی بات آتی ہے تو

وہاں صرف ماں کی بات مانی جاتی ہے۔"

میں لاجواب ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ ایسے قانونی نکتے سمجھا رہی تھی کہ ہم اس کے مشورے کو رد نہیں کرسکتے تھے۔ میں نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے سوچا کہ نصیبہ زبان کی دھنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ میری اس کمزوری کو شاہد تک کبھی نہیں پہنچائے گی۔ اسے شاہد سے نفرت ہے۔ یہ شاہد کے سامنے کبھی نہیں جائے گی۔ فی الحال مجھے اس کے مشورے کو تسلیم کرلینا چاہئے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نصیبہ! تو نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ میں یہ قانونی نکتہ بھول گئی تھی کہ بچے کی ولادت کے سلسلے میں صرف ماں کی بات کو سچ سمجھا جاتا ہے۔ میں اس بچے کو ضائع نہیں کروں گی۔ میں قانون کا سہارا لے کر شاہد کو مجبور کروں گی کہ وہ اسے اپنا بچہ تسلیم کرلے تم اطمینان رکھو' اب میں اس بچے کی پوری طرح حفاظت کروں گی۔"

میں نے اور میری ممی نے اسے اچھی طرح یقین دلایا کہ اب اس بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہم اسے چھوڑنے کے لئے باہر دروازے تک آئے پھر اسے رخصت کرنے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"اف! کیسی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ ہمارے پاس نہ تو اتنے پیسے ہیں اور نہ ہی اتنا وقت ہے کہ ہم اسے جائز بچہ تسلیم کرانے کے لئے تھانے کچہری میں بھاگتی پھریں۔ اس کم بخت کو تو ضائع کرنا ہی ہوگا۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر نصیبہ سے ملاقات ہوئی تو ہم اسے سمجھا دیں گے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی مرگیا تھا۔"

☆======☆======☆

نصیبہ کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ بیچ سڑک پر لڑکھڑاتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ اگر کوئی دروازہ بند کر کے گالیاں دے تو کیا وہ گالیاں دروازے کے پاس سنائی نہیں دیتیں؟

دروازہ بند ہونے کے باوجود نصیبہ نے وہ تمام باتیں سن لی تھیں جو زاہدہ اپنی ممی سے کہہ رہی تھی۔ اس نے ماں بیٹی سے کچھ نہیں کہا' سیدھی سڑک پر چلی آئی۔ وہ اس دنیا کی شاہراہ پر چلنے والے کتنے مسافروں کو سمجھا سکتی تھی کہ وہ جبراً باپ نہ بنیں۔ کتنی عورتوں کو سمجھا سکتی تھی کہ جبراً ماں بننے کے لئے پستی میں نہ گریں۔ اگر کوئی بچہ وجود میں آنے کے لئے ہمکتا ہو تو اسے ضائع نہ کریں۔ وہ کس کس کو سمجھاتی اور کیا کیا سمجھاتی؟ ارے سمجھانے کے لئے تو آسمان سے کتابیں اتاری گئی ہیں پھر بھی انسان نہیں

سمجھتا۔ سمجھانے کے لئے تو ماؤں نے لوریوں کا شہد ٹپکایا ہے۔ اپنے بچے کے کانوں میں کبھی زہریلی عیاشی کا گیت نہیں گایا' پھر نہ جانے کیسے اس دنیا میں ماں اور بچے کے درمیان زہریلا کاروبار ہوتا رہتا ہے؟

کاش کہ وہ بارہ سال سے بھٹکنے والا بچہ میری گود میں آجاتا۔ کتنی لوریاں مچل رہی ہیں میری زبان پر' کتنی ہی دھڑکنیں میرے دودھ میں گھل رہی ہیں۔ کہاں ہے میرے لال تو کہاں ہے؟

اس نے بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر ایک زور کی چیخ ماری دونوں ہاتھ اٹھا کر گونجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا بچہ............ دنیا والو تم میرا بچہ مجھے کیوں نہیں دیتے؟ میں نے کون سی دولت مانگی ہے ایک بچہ ہی تو مانگ رہی ہوں۔ میرا لال۔ کہاں ہے میرا لال؟"

وہ چیخ رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف گاڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ ہارن کتنے ہی سروں میں قہقہے لگا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے قیامت آگئی ہو۔ لوگ اس کی طرف دوڑتے ہوئے جا رہے تھے اور وہ ایک گاڑی کے نیچے اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

شام کو اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے تمام جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک پولیس انسپکٹر ڈاکٹر کے ساتھ وہاں بیان لینے کے لئے موجود تھا۔ انسپکٹر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے نقاہت سے کہا۔

"میں کچھ دیر کی مہمان ہوں میری آخری خواہش پوری کرو۔"

اس سے پوچھا گیا اس کی آخری خواہش کیا ہے؟

جواب میں اس نے اس اسپتال کے کوارٹر کا پتہ بتایا' جہاں وہ رہتی تھی۔ جس کمرے میں وہ رہتی تھی اس کمرے میں ایک صندوق تھا۔ اس صندوق میں ایک ڈائری تھی۔ وہ مرنے سے پہلے ڈائری کے آخری صفحات مکمل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے انسپکٹر کو یقین دلایا کہ ڈائری مکمل ہو جانے کے بعد اسے کسی طرح کا بیان دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ ڈائری ایک مکمل بیان ہو گی۔

اس کی خواہش کے مطابق ڈائری اسے لا کر دے دی گئی۔ ڈاکٹر اور انسپکٹر ایک نرس کو اس کی نگرانی کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ رات کی خاموشی میں وہ لکھتی رہی۔

لکھتی رہی اور روتی رہی۔ کبھی وہ نقاہت سے ہانپنے لگتی تھی کبھی غنودگی کی حالت میں آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ پھر جلدی ہی چونک کر آنکھیں کھول دیتی تھی۔ چہرے پر ہزار کرب لئے بہ دقت لکھنے لگتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ڈائری کے آخری صفحات تک پہنچنے کے لئے موت سے لڑ رہی ہے لیکن اب اس میں جان نہیں رہی تھی۔ وہ لڑتے لڑتے تھک گئی۔ قلم ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ دوسری طرف ڈائری کے اوراق پھڑپھڑانے لگے۔ پھر اس نے زندگی کی تمام سانسوں سے رشتہ توڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔

دوسری صبح مردہ خانے کے سامنے پولیس انسپکٹر اور چند سپاہیوں کے ساتھ ایک مجسٹریٹ کھڑا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ نے ڈائری کھول کر بلند آواز سے کہا۔

"ڈاکٹر فخرالدین!"

"حاضر جناب!"

"شاہد مرزا!"

"حاضر جناب!"

"جمشید قادری۔ مکانوں کا دلال۔"

"یس پریذنٹ۔"

"زاہدہ شاہد۔"

"حاضر جناب!"

مجسٹریٹ ڈائری دیکھ کر نام پکار رہا تھا اور نام کے مطابق وہاں تمام لوگ موجود تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کتنے ہی مرد تھے جو نصیبہ کی زندگی میں آچکے تھے۔ وہ تمام لوگ بھی بلائے گئے تھے۔ مجسٹریٹ نے ان سے کہا۔

"یہ ایک مظلوم عورت کی ڈائری ہے اور اس میں تم سب کے اصلی چہرے موجود ہیں۔ اس وقت تم سب زیر حراست ہو اور تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ یہاں سے تھانے پہنچ کر اپنے اپنے بیانات قلم بند کراؤ۔"

وہ سب پولیس والوں کی حراست میں وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ مجسٹریٹ نے ڈاکٹر خالدہ اور اس کے شوہر کے پاس آ کر کہا۔

"اس ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لاوارث عورت جو اس مردہ خانے میں پڑی ہے' وہ آپ دونوں کا بے حد احترام کرتی رہی تھی آپ لوگوں نے اسے بھٹکنے سے

بچالیا تھا۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ آخری وقت بھی آپ اس کے کام آئیں۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے' اس کی تجہیز و تکفین کی آخری رسوم آپ ادا کریں۔"

لیڈی ڈاکٹر اس فرض کی ادائیگی کے لئے بخوشی راضی ہوگئی اور اپنے شوہر کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مردہ خانے میں آئی۔ ایک اسٹریچر پر نصیبہ اپنی تمام بدنصیبیوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ اس پر ایک سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔ خالدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' آنسو شفاف تھے۔ چادر بھی صاف اور ستھری تھی۔ اس کے پیچھے جو بھی عورت تھی' وہ اللہ سے پوچھنے گئی تھی کہ اس دنیا کا کوئی مرد مجھے ماں کیوں نہیں بنا سکا؟

☆======☆======☆

اجنبی محبوب

ایک معصوم اور خوبصورت لڑکی کی پیچ در پیچ الجھی ہوئی کہانی۔ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی اسے ہر شب ایک نوجوان اپنے پاس بلاتا تھا مگر وہ اپنے محبوب کا چہرہ بھول چکی تھی۔

وہ فوم کے ملائم بستر پر گہری نیند سو رہی تھی اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی اس کے چاروں طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ آس پاس دیکھتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی اس کے کانوں میں ایک بہت ہی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کوئی اسے بلا رہا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ بلانے والا کون ہے؟ لیکن وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور آواز کی سمت بڑھنے لگی۔ وہ آواز والے کو نہیں جانتی تھی مگر آواز کو جیسے صدیوں سے پہچانتی تھی۔

جب وہ آگے بڑھی تو دھند کے بادل سمٹ سمٹ کر اس کے پیروں تلے راستے کی طرح بچھتے چلے گئے۔ اس کی آنکھیں جاگ رہی تھیں لیکن دماغ سو رہا تھا۔ وہ صدیوں کی رہگذر پر چلی جا رہی تھی ہوا کے دوش پر اس کی ریشمی زلفیں ٹھہر ٹھہر کر لہرا رہی تھیں اور ریشمی نائٹی اس کے بدن کے چیختے ہوئے نشیب و فراز سے چپکی جا رہی تھی۔ مکھڑا گلابی گلابی سا تھا آنکھوں میں ہلکی ہلکی نیلاہٹ تھی اور اس کے آس پاس رنگوں کی دھوپ چھاؤں بھی بدلتی جا رہی تھی۔ قوسِ قزح کے جتنے بھی رنگ تھے' وہ اس کے آس پاس چمکیلے غبار کی طرح اڑتے اور بکھرتے جا رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ حسینہ رنگوں اور خوشبوؤں کی دنیا میں سانس لینے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

کوئی اب تک مسلسل اسے پکار رہا تھا اور وہ اپنی چاندی جیسی باہیں پھیلا کر آواز کی سمت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا دل بھی اس آواز کو مخاطب کر رہا تھا۔

"کہاں ہے تو؟ میرے محبوب تو کہاں ہے؟ میں تجھے جانتی ہوں مگر پہچانتی نہیں تیرا چہرہ یاد کرنا چاہتی ہوں تو یاد نہیں آتا خیالوں کے کورے کاغذ پر کتنی ہی تصویریں بناتی ہوں پر تیرا چہرہ نہیں بنتا۔ تو کہاں ہے خدا کے لئے اپنی ایک جھلک دکھلا دے۔"

وہ ایک فریادی کی طرح باہیں پھیلا کر بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اس کے آس پاس کا ماحول واضح ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی بہت ہی خوبصورت سا باغیچہ تھا۔ چاروں طرف

رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور اپنی اپنی خوشبو لٹا رہے تھے پھر کہیں پھولوں کی انجمن سے اس اجنبی کی آواز سنائی دی۔

"جانِ حیات میں یہاں ہوں۔ یہ میرے لئے کتنے افسوس کی بات ہے کہ تو مجھے بھول گئی کیا تجھے ہماری محبت کا ایک لمحہ بھی یاد نہیں رہا سنا تھا کہ محبت میں عورت ساری دنیا کو بھلا دیتی ہے۔ مگر ساری دنیا تجھے یاد رہی اور محبت تیری یادداشت سے گم ہو گئی۔ تو مجھے پہچان میں تیرا ہوں تو نے کہا تھا ہماری مختصر سی ملاقات صدیوں پر بھاری ہے ہم جنم جنم سے ملتے رہے ہیں اور ملتے رہیں گے۔ دیکھ میری محبوب میں پھر تجھ سے ملنے آگیا ہوں۔"

وہ آگیا ہے۔ مگر کہاں ہے؟ اس کی نظریں پھولوں کے ہجوم میں اسے ڈھونڈنے لگیں۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر پھولوں کی زبان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے دل کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گلاب کے پودوں کے پیچھے آ گئی۔ وہاں اس کے نقشِ قدم نظر آ رہے تھے کوئی اور تو نہیں تھا وہ قدموں کے نشان اسی کے ہو سکتے تھے۔ وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی بڑی عقیدت سے نقشِ قدم پر جھک گئی پھر دونوں ہاتھ بڑھا کر وہاں کی مٹی کو اٹھایا تو سارے نشانات برابر ہو گئے۔ صرف مٹی ہی مٹی رہ گئی اور وہ پھر سپنے کی طرح اس کی دنیا سے ٹوٹ کر رہ گیا۔

محبت وقتی طور پر گم ہو سکتی ہے لیکن مر نہیں سکتی۔ وہ بہت دور ایک درخت کے سائے میں نظر آ رہا تھا۔ دھندلا دھندلا سا خاکہ تھا۔ چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی اس کی طرف جانے لگی۔ اسی وقت اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"رک جاؤ............ میرے قریب آ کر مجھے پہچاننے سے پہلے خود کو پہچانو کہ تم کون ہو۔ جب تک تم اپنے آپ کو نہیں پہچانو گی اس وقت تک میں بھی تمہیں کبھی سمجھ میں نہیں آؤں گا۔"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے اضطراب سے کہا۔

"نہیں............ میں اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتی۔ میں نہیں جانتی کہ میں کون ہوں۔ میری ممی اور ڈیڈی کہتے ہیں کہ ایک حادثے میں میری یادداشت گم ہو گئی ہے۔ میں اپنے ماں باپ کو بھی نہیں پہچانتی خود انہوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ میرے ممی اور ڈیڈی ہیں۔ تم بھی سامنے آ کر مجھے یقین دلا دو کہ تم وہی ہو جسے میرا سویا ہوا

ذہن تلاش کرتا رہتا ہے۔ انسان سو جاتا ہے مگر نیند کی حالت میں بھی اپنی گمشدہ چیز کو جو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اسے تلاش کرتا رہتا ہے۔ یہی حال میرا ہے۔ میں اپنے اندر ایک بہت بڑی کمی محسوس کرتی ہوں شاید تمہاری موجودگی اس کمی کو پورا کردے۔ تم میرے پاس آجاؤ یا مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت دو۔ تمہارے بغیر میری زندگی آدھی ہے۔ میرا وجود آدھا ہے مجھے مکمل کردو۔"

اب وہ درخت کے سائے میں نہیں تھا اور فوارے کے پیچھے نظر آرہا تھا۔ ان کے درمیان بہت تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ اس کے باوجود اس کی صورت واضح طور سے نظر نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ فوارے کے پانی کی باریک باریک چاندی جیسی جھلملاتی ہوئی دھاریں اس کے چہرے کو جھلمل کرتی ہوئی بکھیر رہی تھیں۔ صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"اس دنیا کا ہر انسان ادھورا ہے اور اپنی تکمیل کے لئے آخری سانس تک جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ اپنے ادھورے پن کو دور کرنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان دماغی طور سے صحت مند رہے۔ ذہن بیمار ہوگا تو زندگی بھی بیمار ہوتی چلی جائے گی۔ لہٰذا پہلے خود کو پہچاننے کی کوشش کرو میں اسی دنیا میں تمہیں کہیں مل جاؤں گا۔"

وہ بے چینی سے آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

"میں خود کو پہچاننے کے لئے بہت کوشش کرتی ہوں میرے ممی اور ڈیڈی اسی سلسلہ میں میری مدد کرتے ہیں۔ مجھے بتاتے ہیں کہ میرا نام فرحانہ ہے۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں اور لاکھوں روپے کی جائیداد کی تنہا مالک ہوں' میں جس نوجوان سے محبت کرتی تھی اس نوجوان کا نام شاہد تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ شاید میں اسی شاہد کی کمی محسوس کر رہی ہوں۔ وہ نہیں ملتا۔ اس کی صورت نظر نہیں آتی۔ بیتے دنوں کا کوئی لمحہ یاد نہیں آتا تب میں سوچتی ہوں کہ وہی شاہد ہے جو ایک کمی بن کر میرے دل و دماغ میں بھٹک رہا ہے اور ....اور وہ تم ہی ہو۔"

"ہاں میں شاہد ہوں۔ مگر تم جسمانی طور پر آگے بڑھ کر مجھے نہیں پاسکو گی کیونکہ دنیا والوں نے مجھے تم سے دور کردیا ہے۔ میرے قریب آنے کے لئے مجھے تلاش کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ پہلے تم مجھے یاد کرو۔ میری قربت کے کسی لمحے کو ڈھونڈو کہ کبھی میں تمہاری سانسوں کے بہت قریب تھا۔ کبھی تم میری آنکھوں میں

ڈوب جایا کرتی تھیں' اپنی مخروطی انگلیاں میرے چہرے پر ہولے ہولے پھیر کر میری خوبروئی کی تعریفیں کیا کرتی تھیں۔ کیا وہ خوبرو نوجوان' وہ تمہارا آئیڈیل اب تمہیں یاد نہیں آتا؟ اپنے دماغ کو ٹٹولو اپنے ذہن میں جھانکو اس سے پہلے میں تمہیں کبھی نہیں مل سکوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس کی آواز دور ہونے لگی وہ الٹے قدموں چلتے چلتے اس سے دور ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"میں جا رہا ہوں فرحانہ۔ زندگی کے کسی موڑ پر ہمارا سامنا ہوا تو تم مجھے پہچان لینا۔ اگر نہیں پہچانو گی تو یہ محبت کی توہین ہوگی مجھے پہچان لینا میری فرحانہ۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔"

وہ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ فرحانہ ایک دم سے آگے بڑھی' پھر چیختی ہوئی دوڑنے لگی۔

"نہیں شاہد تم نہیں جاسکتے۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے شاہد تم وہی انسان ہو جو میری ادھوری زندگی کو مکمل کرسکتا ہے خدا کے لئے رک جاؤ شاہد۔ نہ جاؤ شاہد۔ شاہد............"

وہ اندھا دھند دوڑتی چلی گئی۔ شاہد پتہ نہیں کہاں گم ہوگیا تھا مگر وہ پاگلوں کی طرح اسی سمت دوڑ رہی تھی جہاں وہ نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ لڑکھڑائی اور نشیب کی جانب لڑھکتی چلی گئی پھر ایک جگہ اس کا لڑھکتا ہوا جسم تھم گیا مگر وہ وہاں سے اٹھ نہ سکی کیونکہ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے محبوب نے اسے خود کو شناخت کرنے کے لئے کہا تھا مگر وہ اور زیادہ خود کو فراموش کرچکی تھی۔

☆======☆======☆

صبح ہوتے ہی کوٹھی میں ہلچل سی مچ گئی۔ رات کو ڈیوٹی دینے والے چوکیدار نے ہانپتے کانپتے آکر اطلاع دی کہ فرحانہ بی بی پائیں باغ کی ایک جھاڑی کے پاس پڑی ہوئی ہیں۔ اس کی ممی نے سنا تو اپنا سینہ پیٹ لیا۔ اس کے ڈیڈی ملازموں کو لے کر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے اور اسے اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں لے آئے۔ اس وقت تک اس کی ممی اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون پر اطلاع دے چکی تھیں لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی

فرحانہ ہوش میں آگئی اور وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

اسے اپنے سامنے ممی اور ڈیڈی کے چہرے نظر آرہے تھے وہ اس کے پلنگ کے اطراف کھڑے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں وہ اس کے ممی اور ڈیڈی تھے بھی یا نہیں؟ کیونکہ اسے پچھلی کوئی بات یاد نہیں آتی تھی۔ اپنے پیدا کرنے والے ماں باپ بھی یاد نہیں آتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ماں باپ کے رشتوں کا یقین دلایا تو وہ انہیں ممی اور ڈیڈی سمجھنے لگی۔

ایسے ممی اور ڈیڈی کو پانے کے بعد بھی وہ خود کو دنیا میں تنہا سمجھتی تھی۔ اکثر اس نے دیکھا تھا کہ اس کے ممی اور ڈیڈی چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں جب وہ اچانک ہی سامنے آجاتی ہے تو وہ اک دم سے خاموش ہو جاتے ہیں یا پھر جبراً مسکراتے ہوئے اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ گھر کے ملازموں کا بھی یہی حال تھا' وہ کنکھیوں سے اسے دیکھتے تھے۔ جب وہ انہیں دیکھتی تو وہ جلدی سے رخ پھیر کر کام کرنے لگتے تھے۔ عجب پُراسرار ماحول تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے سب لوگ اسے اس عالیشان کوٹھی میں لاکر کوئی بڑی سازش کر رہے ہیں۔

اس ماحول میں اس کا دل گھبرانے لگتا تو وہ کوٹھی سے باہر نکل آتی اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جہاں جانا چاہتی اس کے ممی اور ڈیڈی بخوشی اجازت دے دیتے۔ مگر اس کے ساتھ کسی ملازم کو لگا دیتے یا خود اس کے ساتھ تفریح کے لئے نکل جاتے تھے۔ وہ جھنجلا کر کہتی۔

"آپ لوگوں نے کیوں مجھ پر پہرے بٹھائے ہوئے ہیں؟ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں ہسپتال میں پڑی سوچ رہی تھی کہ کہاں جاؤں کیا کروں؟ ایسے میں آپ لوگ وہاں آکر میرے ماں باپ بن گئے۔ میں پناہ لینے کے لئے آپ لوگوں کے پاس آگئی مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ لوگ مجھے قیدی بنا کر رکھیں مجھے یہ پہرے داری بالکل پسند نہیں ہے۔ آپ لوگ کیوں میرے پیچھے آتے ہیں؟"

اس کے اعتراضات سن کر اس کے ماں باپ اسے جو کچھ سمجھاتے وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا پچھلی جو باتیں یاد دلاتے وہ یاد نہیں آتی تھیں۔ اس کوٹھی میں رہنے والوں کے مزاج الگ تھے۔ باتیں الگ تھیں۔ اسی لئے فرحانہ کہتی تھی۔

"یہ جھوٹ ہے کہ میں نے اس ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اگر یہ میرا اپنا

ماحول ہوتا تو یہ کوٹھی مجھے قید خانہ نہ لگتی۔"

وہ بستر پر پڑی ہوئی خاموشی سے اپنے سامنے والوں کو تک رہی تھی اور اپنی زندگی کے متعلق سوچ رہی تھی جس کا پہلا سرا نہیں مل رہا تھا۔ ڈاکٹر اسے کچھ دوائیں دے کر چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کی ممی نے کہا۔

"بیٹی پچھلی رات تم پھر نیند میں چل رہی تھیں۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند رکھا کرو مگر تم کھلا چھوڑ دیتی ہو اور کھلے دروازے سے نیند کی حالت میں چلتے چلتے پائیں باغ میں پہنچ جاتی ہو۔ آج سے میں دروازے کو باہر سے بند رکھا کروں گی۔"

اس کے ڈیڈی نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹے پچھلی رات کو تم نے جو خواب دیکھا ذرا اسے یاد کرکے ہمیں بتاؤ۔ میں نے ماہر نفسیات ڈاکٹر زبیری سے تمہارے متعلق مشورہ کیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم نیند میں چلتی ہو تو پھر یقیناً کسی خواب کے زیر اثر ایسا کرتی ہو' لہٰذا تم سے اس خواب کے متعلق پوچھا جائے تم یاد کرکے بتاؤ بیٹے کہ کیا دیکھا تھا؟"

وہ یاد کرنے لگی۔ ذہن پر بہت زور ڈال کر سوچنے لگی۔ سوچتے وقت اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔ ذہن پر بہت زور ڈالنے کے باوجود اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں کہ شاید بند آنکھوں میں وہ خواب ذرا سا جھلک جائے لیکن آنکھوں کے پیچھے اندھیرا رہا۔ اس اندھیرے میں صرف ممی اور ڈیڈی کے چہرے جھلکتے رہے کیونکہ وہ سامنے بیٹھے تھے۔ کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد وہ بند آنکھوں میں بھی نظر آرہے تھے۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔

"مجھے کچھ یاد نہیں ہے میں تو پچھلی رات ایک گلاس دودھ پینے کے بعد سو گئی تھی۔ اسی بستر پر سوئی تھی اور اسی بستر پر آنکھ کھلی۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے پائیں باغ سے اٹھا کر لایا گیا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے کبھی مجھے لگتا ہے کہ آپ لوگ میرے لئے بہت ہی مخلص اور ہمدرد ہیں کبھی یوں لگتا ہے کہ آپ سب مل کر میرے ساتھ کوئی بہت بڑا ناٹک کھیل رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ لوگ کچھ عرصہ کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

"بیٹی ہم تمہاری خوشی کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مگر تم تنہا اپنی حفاظت نہیں

کر سکو گی۔ نیند کی حالت میں چلتی ہوئی نہ جانے کہاں نکل جاؤ گی۔ تم ایک بار ہم سے بچھڑ گئی تھیں اب ہم دوبارہ تمہیں پا کر کھونا نہیں چاہتے۔"

اس کی ممی نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔

"فرحانہ' ہماری محبت اور خلوص کو سمجھو۔ ماں باپ ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتے ہیں لیکن اپنی اولاد سے کبھی فریب نہیں کرتے۔ ہم اس کوشش میں ہیں کہ تمہاری یادداشت بحال ہو جائے اس وقت تک ہم پر اعتماد کرو۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں تمہاری بھلائی کے لئے کر رہے ہیں۔ ابھی تم تھوڑی دیر آرام کرو ناشتہ کرنے کے بعد میں تمہیں ڈاکٹر زبیری کے پاس لے جاؤں گی۔"

تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دینے کے بعد باہر چلی گئیں۔ وہ تنہا بستر پر پڑی ہوئی اپنی خواب گاہ کو اجنبی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کی ممی نے بتایا تھا کہ جب وہ دس برس کی تھی تو یہ کوٹھی تعمیر کرائی گئی تھی۔ اب وہ بائیس برس کی ہے یعنی بارہ سال سے وہ اس خواب گاہ میں رہتی آئی ہے۔ بارہ برس کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ مگر اس خواب گاہ کی کسی چیز میں اسے انسیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بس یوں لگتا تھا کہ وہ کسی کے گھر میں مہمان بن کر ٹھہری ہوئی ہے۔

جب کوئی چیز اپنی نہ ہو گھر اپنا نہ ہو' گھر والے پرائے لگیں' گھر سے باہر کی دنیا بھی اجنبی ہو' حتیٰ کہ اپنا دماغ بھی اپنا ساتھ نہ دے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی خلا میں زندگی گذار رہے ہیں۔ اس سے اچھا تو قبر کا اندھیرا ہوتا ہے۔ وہاں بھی گھٹن ہوتی ہوگی۔ یہاں بھی اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مگر وہ کیا کرے جب تک سانس چل رہی ہے زندگی تو گزارنی ہی ہوگی خواہ وہ زندگی اندر سے کتنی ہی کھوکھلی کیوں نہ ہو۔

☆======☆======☆

ماہر نفسیات ڈاکٹر زبیری کے چیمبر میں گہری خاموشی تھی۔ فرحانہ ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھی۔ اس کے سر کے ٹھیک اوپر سیلنگ فین ہولے ہولے گردش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر زبیری اس کے ہاتھوں میں کاغذ کا ایک پیڈ اور قلم دے کر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر تک نرمی سے گفتگو کرنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

"میں ابھی ایک کام سے جا رہا ہوں۔ تم اس چیمبر میں تنہا ہو گی یہاں تمہارے ممی اور ڈیڈی بھی تمہیں پریشان کرنے نہیں آئیں گے۔ وہ باہر رہیں گے۔ تم نہایت

اطمینان سے اس پیڈ پر لکھتی جاؤ۔ جو بھی الٹی سیدھی باتیں تمہارے دماغ میں آتی ہیں اسے قلمبند کرتی رہو۔ کوئی سوچ تمہیں روکے تب بھی نہ رکو۔ ہر قسم کی بندش سے آزاد ہو کر لکھتی جاؤ میں پندرہ یا بیس منٹ کے بعد آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔ فرحانہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے لکھنا شروع کر دیا۔ جو بات اس کے دماغ میں آتی گئی وہ لکھتی چلی گئی ویسے وہ کیا لکھ سکتی تھی۔ پچھلی زندگی یاد نہیں آتی تھی۔ جو موجودہ زندگی گزار رہی تھی وہ خالی خالی نظر آتی تھی۔ اس نے کاغذ پر اپنی الجھنوں کو بیان کیا۔ اپنے والدین کی شکایت کی اپنے گھر کو جیل خانہ لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ماں باپ جس محبت کا اظہار کرتے ہیں اس میں کھوکھلا پن محسوس ہوتا ہے شاید اس کی زندگی میں محبت کی کمی ہے۔ اگر کہیں سے اسے کھوئی ہوئی زندگی اور کھوئی ہوئی محبتیں مل جائیں تو شاید وہ بھی اپنی موجودہ زندگی سے محبت کرنے لگے۔

بیس منٹ کے بعد ڈاکٹر زبیری نے وہاں آ کر اس کے لکھے ہوئے کاغذات اس سے لے لئے اور اسے پڑھنے کے لئے ایک ڈائری دی۔

"مس فرحانہ' یہ تمہاری ڈائری ہے۔ دو ماہ پہلے جب تم نارمل تھیں اور اپنی پچھلی زندگی کو سمجھتی تھیں تو اس ڈائری میں اپنے حالاتِ زندگی لکھا کرتی تھیں تم اسے پڑھو اور دیکھو کہ اپنی ہی لکھی ہوئی یادداشت تمہارے کام آتی ہے یا نہیں؟ میں پھر ۲۰ منٹ کے لئے باہر جا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے میں چند سوالات کروں گا تم ان کے جوابات کاغذ پر لکھتی جاؤ۔"

فرحانہ کاغذ سنبھال کر بیٹھ گئی ڈاکٹر نے پہلا سوال کیا۔

"تمہارا پسندیدہ رنگ کونسا ہے؟"

اس نے جواب لکھا۔ "ہلکا پیلا۔"

"تمہیں سب سے زیادہ خوبصورتی کہاں نظر آتی ہے؟"

"طلوعِ آفتاب میں۔"

"عورتوں میں سب سے خوبصورت نام کون سا ہے؟"

"فرحانہ۔"

"کسی مرد کا خوبصورت نام لکھو۔"

"شاہد۔"

"اپنی اہم خواہش لکھو۔"

"اہم خواہش یہ ہے کہ میں اپنی تکمیل چاہتی ہوں۔"

ڈاکٹر اس سے وہ صفحہ لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے ڈائری کو کھول کر ذرا اِدھر اُدھر سے پڑھا تو کچھ پلے نہ پڑا۔ داستانِ حیات کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے درمیان سے پڑھو تو کبھی کچھ پتے نہیں پڑ سکتا۔ لہٰذا وہ پہلے صفحہ سے پڑھنے لگی۔ ابتدائی چند صفحات بتا رہے تھے کہ وہ کتنی آزادی سے زندگی گذارتی تھی۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ دن رات اپنی سہیلیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے گھومنے پھرنے میں وقت گذارتی تھی۔ ایک آدھ بوائے فرینڈ بھی تھے۔ کبھی بوائے فرینڈ کے ساتھ کبھی سہیلیوں کے ساتھ وہ اکثر شبانہ کلب جایا کرتی تھی۔

اسی کلب سے اس کی ایک نئی زندگی شروع ہوئی۔ وہاں کی آرکسٹرا پارٹی میں اس نے شاہد کو دیکھا جو بہت [illegible] دل موہ لینے کے انداز میں گٹار سے کھیلا کرتا تھا۔ اس زمین دوز کلب کے چھوٹے [illegible] ہال میں دھیمی دھیمی سی روشنی ہوتی تھی۔ ہر چیز پر جیسے مدھم مدھم سے چراغ جلتے تھے۔ جن پر ہلکے نیلے رنگ کے شیڈز ہوتے تھے۔ ہال کی محدود فضا میں نوجوان جوڑوں کی دھیمی دھیمی سرگوشیوں کی طرح سگریٹوں کے دھوئیں ایک میز سے دوسری میز تک منڈلاتے رہتے تھے۔ آٹھ بجے کے بعد آرکسٹرا شروع ہو جاتا تھا۔ نوجوان جوڑے ڈانس فلور پر آکر آرکسٹرا کی دھن پر رقص کرتے تھے۔ وہ بھی ڈانس کرنے کے لئے فلور پر آئی تو اسپاٹ لائٹ سے ذرا پرے شاہد گٹار بجا رہا تھا۔

یوں تو وہاں کتنے ہی ساز بجانے والے تھے لیکن شاہد کے خوبصورت اسٹائل نے اس کا دل موہ لیا۔ ڈائری کا وہ صفحہ بتا رہا تھا کہ پہلے ہی دن وہ اس خوبرو نوجوان سے متاثر ہو گئی تھی۔ وہ ڈائری پر سے نظریں ہٹا کر سیلنگ فین کو گھورتی ہوئی سوچنے لگی۔

"اگر یہ میری ہی ڈائری ہے اور یہ سب میرے ہی ماضی کی جھلکیاں ہیں اور اگر میں نے شاہد کو دیکھا ہے تو مجھے اس کی صورت یاد آنی چاہئے۔ اس کی صورت کیسی تھی؟ ڈائری میں لکھا ہے کہ وہ بہت خوبرو تھا۔"

کتنے ہی خوبرو نوجوانوں کے چہرے چشمِ تصویر میں آنے لگے۔ ایک کے بعد

دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا۔ وہ کس چہرے کو شاہد کہہ کر پکارے؟ ڈائری کے یہ صفحات پڑھنے کے بعد وہ اور زیادہ الجھ گئی دل نے کہا کہ وہ آگے پڑھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ گمشدہ شاہد اس کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔

آگے لکھا ہوا تھا کہ اس رات کے بعد وہ بلاناغہ اس کلب میں جانے لگی۔ انسان جہاں تک نہیں پہنچتا وہاں تک نگاہوں کی حرارت پہنچ جاتی ہے' خصوصاً جوان دوشیزاؤں کی نظریں مرد ضرور تاڑ لیتے ہیں۔ شاہد بھی گٹار کے تاروں سے کھیلتے کھیلتے اس کی نظروں سے کھیلنے لگا تھا۔ چند ہی دنوں میں وہ اتنی جلدی ایک دوسرے کے قریب کس طرح آگئے یہ بات مشینی دور میں حیرت انگیز نہیں ہے۔ آج کی نسل مشینی انداز میں سوتی جاگتی کھاتی پیتی اور محبت کرتی ہے۔ کبوتروں کے ذریعے نامہ و پیام کا دور گذر چکا ہے۔

ڈائری کے ایک صفحہ میں ایک بات ایسی لکھی تھی کہ اسے پڑھتے ہی فرحانہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شاہد نے اس روز کلب سے چھٹی کی اور اسے کسی تفریح گاہ میں لے گیا وہاں کا ماحول بڑا ہی رومان پرور تھا۔ ایک گوشۂ تنہائی میں اس نے فرحانہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور بڑی محبت سے اس پر جھک کر اس کے لبوں کو چوم لیا۔

فرحانہ نے اک دم سے ڈائری بند کر دی کیونکہ سیلنگ فین کی زد میں ڈائری کے اوراق پھڑپھڑا رہے تھے اور سینے میں دل پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کی مخروطی انگلیاں بے اختیار اپنے لبوں تک پہنچ گئیں۔ دل نے پھڑک پھڑک کر پکارا۔

"ارے کہاں گم ہو گیا وہ نادیدہ بوسہ؟ ان لبوں پر بہار کا ایک جھونکا آیا اور گذر گیا مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ ہائے ری بے خبری مجھ جیسا چمن کوئی نہ ہو گا جو بہار سے آشنا ہو کر بھی نا آشنا رہ گیا۔"

جذبات کے ہجوم میں اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ کسی خیالی ہونٹوں کو یاد کر رہی تھی جو سفاک تھے' مگر بڑے مہربان تھے ایسی مہربانیاں بھلائے نہیں بھولتیں۔ مگر وہ بھول گئی تھی۔ اس نے بار بار خیالوں کی دنیا میں اپنے محبوب کو پکارا جس کا ایک نام تھا لیکن وہ بے نام بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل اب بھی یوں پھڑپھڑا رہا تھا جیسے ابھی اڑ کر اس کی تلاش میں چلا جائے گا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں اس کے باوجود آنسوؤں کے دو قطرے آنکھوں کی بند دہلیز پر آ گئے۔ یہ سوچ کر اس کا دل تڑپ رہا تھا کہ اس کا کوئی چاہنے والا تھا۔ کوئی اسے پیار کرنے والا تھا۔ وہ اب بھی اس دنیا کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر کہیں ہو گا مگر نہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور نہ ہی اس کی یادداشت کے کسی حصے میں محفوظ تھا۔ یہ تو عورت ہی جانتی ہے کہ محبت کا سرمایہ کھو کر کیسے اپنے اندر سے خالی ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا باہر سے بھی اس کے لئے خالی ہو گئی تھی۔

وہ آگے نہ پڑھ سکی اپنے آنسو پونچھتی رہ گئی۔ پھر اس نے اور طرح سے اپنے دل کو سمجھایا کہ یہ تو کسی فرحانہ کی ڈائری ہے۔ پتہ نہیں میں وہی فرحانہ ہوں یا نہیں؟ یہ جو میرے ممی اور ڈیڈی بن گئے ہیں انہوں نے میرا نام فرحانہ رکھ دیا ہو گا۔ ہاں مجھے اس پہلو پر بھی غور کرنا ہو گا کہ میں کسی دوسری فرحانہ کی داستان کو اپنی داستانِ محبت سمجھ کر فریب کھا رہی ہوں۔ مگر یہ فریب کتنا خوبصورت ہے یہ ڈائری پڑھ کر میرا دل کہتا ہے کہ مجھے بھی اپنی اس خالی خالی سی زندگی میں ایسے ہی ایک چاہنے والے کی ضرورت ہے۔ کوئی خوبرو نوجوان کوئی اپنا آئیڈیل دل پر دستک دے تو سارے خلا پُر ہو جاتے ہیں۔

اگر میں فرحانہ نہیں ہوں تو مجھے فرحانہ بن کر زندگی گزارنی چاہئے فرحانہ کی طرح زندگی کی ساری مسرتیں اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہئے۔ اگر کوئی مجھے دل و جان سے چاہنے والا شاہد مل جائے تو میں پچھلی زندگی کو تو بھول چکی ہوں ساری دنیا کو بھی بھول جاؤں گی۔ کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اس شاہد کو۔ اس نے ڈھونڈنے کے لئے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ڈاکٹر زبیری کھڑا ہوا تھا۔

آم کا تصور کرو اور املی مل جائے تو دماغ کھٹا ہو جاتا ہے اسے ناگواری کا احساس ہوا مگر وہ جبراً مسکرانے لگی۔ ڈاکٹر زبیری نے کہا۔

"تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم رو رہی تھیں۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ ماضی کی کسی یاد نے رلا دیا ہے؟"

ڈاکٹر اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ فرحانہ نے اس ڈائری کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس لئے رونا آ گیا تھا کہ میں اس ڈائری کی فرحانہ نہیں ہوں کسی دوسری

لڑکی کا ماضی ادھار لے کر میں مسکرا نہیں سکتی۔ ڈاکٹر ٹو بی ویری فرینک مجھے یہ سب ڈرامہ لگتا ہے۔"

ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے والدین کو تم سے یہی شکایت ہے کہ ان کی محبت اور ان کا خلوص تمہیں کسی ڈرامے کا ایک حصہ نظر آتا ہے۔ پہلے میں یہی ثابت کروں گا کہ یہ تمہارے اپنے والدین ہیں اور یہ ڈائری والی فرحانہ تم ہی ہو۔ میں تمہارے سامنے اس میز پر یہ ڈائری کھول کر رکھتا ہوں اور یہ وہ کاغذات ہیں جن پر تم نے ابھی بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ سامنے آؤ اور ان دونوں تحریروں کا موازنہ کرو تمہیں ذرا بھی فرق نظر نہیں آئے گا۔

فرحانہ میز پر جھک گئی پھر کبھی ڈائری کی تحریر کو اور کبھی اپنے لکھے ہوئے کاغذات کو بار بار دیکھنے لگی۔ واقعی ذرا بھی فرق نہیں تھا وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ پہلے کبھی اس نے یہ ڈائری اپنے ہاتھ سے لکھی ہے۔ ڈائری کی تحریر بلاشبہ اس کی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس ڈائری کا ایک ایک لفظ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گڈ۔ یہاں تک یہ بات تمہاری سمجھ میں آ گئی۔ اب یہ سمجھو کہ کسی بھی انسان کے دماغ سے یادداشت بالکل ہی مٹ نہیں جاتی۔ اگرچہ وہ شعور کی حد میں نہیں آتی لیکن لاشعور کے تہہ خانے میں کہیں چھپی رہتی ہے۔ کبھی کبھی نادانستگی میں پچھلی کوئی ایسی بات زبان پر آ جاتی ہے جو اسے سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ میں نے تم سے کسی مرد کا نام پوچھا تھا جو تمہیں پسند ہو تم نے جواب لکھا تھا۔ شاہد۔"

فرحانہ کے سامنے وہ کاغذ رکھا ہوا تھا جس پر اس نے جوابات لکھے تھے اس پر شاہد کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز آ رہی تھی۔

"یہی شاہد اس ڈائری میں جگہ جگہ موجود ہے۔ اسی ڈائری میں تم نے کتنی ہی جگہ ہلکے نیلے رنگ کا ذکر کیا ہے۔ جس دن پہلی بار شاہد سے ملاقات کا وقت مقرر ہوا اس روز تم بہت صبح اٹھ گئی تھیں۔ تم نے اپنے بیڈ روم کی کھلی ہوئی کھڑکی سے طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھا، تمہاری ڈائری میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اس دنیا کا سب سے زیادہ

حسن طلوعِ آفتاب کے منظر میں ہے۔"

فرحانہ تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ اب نہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ڈائری والی فرحانہ ہے۔ اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ فرحانہ ہی ہے اور اس فرحانہ کا ایک شاہد بھی ہے۔ وہ قائل ہو کر کہنے لگی۔

"ڈاکٹر یہ ماننا پڑتا ہے کہ میں واقعی فرحانہ ہوں۔ ایسی ڈائری جیسی بہت سی اہم چیزیں اور بھی ہوں گی۔ وہ سب مجھے ملنی چاہئے۔ ویسے یہ بات بہت ہی غلط ہے کہ آپ لوگوں نے میری ڈائری پڑھ لی ہے۔"

"ہمیں اس بات کا افسوس ہے لیکن میں تمہارا معالج ہوں اس ڈائری کے پڑھنے کے بعد ہی میں نے تمہیں اس حد تک قائل کیا ہے۔ تم اس ڈائری کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور پورے سکون کے ساتھ تنہائی میں اسے شروع سے آخر تک پڑھو۔ میرا خیال ہے اس طرح پچھلی یادیں تمہارے ذہن میں تازہ ہو جائیں گی۔"

فرحانہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میری دوسری چیزیں کہاں ہیں؟ وہ یہاں موجود ہوں تو آپ مجھے ابھی دے دیں۔"

"تم اطمینان رکھو، تمہیں سب کچھ مل جائے گا۔"

"مگر اور کون سی چیزیں ہیں یہ تو مجھے معلوم ہونا چاہئے۔"

"میں تم سے وعدہ کر رہا ہوں کہ تمہاری چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔ یہ میرا ایک طریقۂ علاج ہے جس طرح آج یہ ڈائری دی ہے اسی طرح علاج کے دوران دوسری چیزیں بھی دے دوں گا۔"

وہ ڈاکٹر کے چیمبر سے سرجھکا کر باہر چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں اس کے ممی اور ڈیڈی بیٹھے ہوئے تھے وہ اپنی ممی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے ڈیڈی ممتاز احمد کو بلایا۔ ممتاز احمد اندر آکر اسی ایزی چیئر پر بیٹھ گئے جہاں پہلے فرحانہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"ممتاز صاحب آپ کی بیٹی نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ وہی فرحانہ ہے اور آپ لوگ اس کے والدین ہیں لیکن اپنی ڈائری پڑھنے کے باوجود اسے اپنے ماضی کا کوئی لمحہ یاد نہیں آ رہا ہے۔ فرحانہ کا ذہن بالکل ہی بدل گیا ہے۔ بچپن سے آپ لوگوں نے اس

کی پرورش کی مگر وہ آپ لوگوں کو نہیں پہچانتی صرف ڈائری پڑھ کر تسلیم کر رہی ہے کہ آپ ہی لوگ اس کے ممی اور ڈیڈی ہیں۔"

ممتاز احمد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے ڈاکٹر۔ ہماری اولاد ہمیں ڈائری کے اوراق سے پہچانتی ہے خون کے رشتے سے نہیں پہچانتی۔"

"یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ جو خون کا رشتہ بھول چکی ہو وہ اور بھلا کسے پہچانے گی۔ بارہ برس سے جس مکان میں رہتی آئی ہے وہاں کے ماحول میں بھی اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ جوانی میں اپنے چاہنے والے سے سب سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے وہ چاہنے والے کو بھی بھول گئی ہے۔ مجھے تو کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی کہ دوبارہ اس کی یادداشت بحال ہو سکے۔"

"پھر کیا ہو گا ڈاکٹر؟ ہم اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور ایسی صورت میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اس کی شادی کرنا مناسب ہے یا نہیں؟"

"شادی ضرور کرنا چاہئے ہو سکتا ہے کہ شاہد کو پا کر اسے کچھ یاد آجائے۔"

ممتاز احمد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"سارا جھگڑا تو اسی بات کا ہے کہ یہ شاہد کو پسند کرتی تھی اور ہم ایک بہت بڑے خاندانی لڑکے سے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔"

"آپ ایسا کیوں چاہتے تھے؟ شاہد کو ناپسند کرنے کی کیا وجہ تھی؟"

"وہ ہماری برادری کا نہیں تھا۔"

ڈاکٹر نے ناگواری سے انہیں دیکھا تو وہ سنبھل کر بولے۔

"میں مانتا ہوں کہ ذات برادری کا فرق پیدا کرنا جہالت ہے مگر سماج میں عزت اور مرتبہ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ آپ نے ڈائری میں پڑھا ہو گا کہ وہ ایک گٹار نواز تھا۔ شبانہ کلب میں گٹار بجایا کرتا تھا ایسے آدمی کی سوسائٹی میں کیا عزت ہو سکتی ہے؟"

"موسیقی سے لگاؤ رکھنے والے باذوق ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ جس ائٹی کی بات کر رہے ہیں وہاں صرف دولت کے ترازو میں تول کر آدمی کی عزت کی جاتی ہے۔"

"مجبوری ہے ڈاکٹر۔ دولت نہ ہو تو انسان کی کہیں قدر نہیں ہوتی۔ سب لوگ

یہی کہتے کہ میں نے ایک میراثی کو اپنا داماد بنا لیا۔"

"میراثی؟" ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا شاہد میراثی تھا؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا.......... لیکن ہمارے زمانے میں گانے بجانے کا کام تو میراثی ہی کرتے تھے۔"

ڈاکٹر نے انہیں ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا آپ دقیانوسی خیال کے آدمی ہیں آپ کے انہی خیالات نے آپ کی بیٹی کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ یقیناً اس نے شاہد سے ہی شادی کرنے کی ضد کی ہوگی۔"

"جی ہاں۔ وہ بچپن سے ضدی ہے میں اس کی ہر بات مانتا آیا ہوں لیکن شاہد کے سلسلہ میں میں نے مخالفت کی' اسے دن رات سمجھاتا رہا کہ یہ محبت نہیں ہے نادانی ہے اگر وہ شاہد سے شادی کرے گی تو ہمارے خاندان والے ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ اس کی ماں نے بھی ہر طرح سے سمجھایا۔ وہ دن رات ہمارے سامنے چیختی چلاتی رہتی غصے میں آکر کھانا چھوڑ دیتی۔ گھر کی چیزوں کو توڑنے پھوڑنے لگتی۔ آخر میں نے سوچا مجھے شاہد سے فیصلہ کرنا چاہئے۔ میں بظاہر فرحانہ کی ضد کے آگے جھک گیا اور اس سے شاہد کا پتہ پوچھ کر خود ہی اس سے ملنے گیا۔"

یہ کہہ کر ممتاز احمد ذرا دیر کے لئے خاموش ہوگئے۔ ڈاکٹر نے ان سے پوچھا۔

"آپ نے شاہد سے کیا کہا تھا؟"

"شاہد سے میری ملاقات نہ ہوسکی۔ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کے مکان میں رہتا تھا۔ آپ ہی بتائیں جس کا اپنا کوئی مکان نہ ہو۔ کہیں رہنے کا ٹھکانہ نہ ہو اور خانہ بدوشوں کی طرح گٹار بجاتا پھرتا ہو کیا میں ایسے شخص کو اپنا داماد بنا سکتا تھا؟"

"کیا آپ نے اس کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں کہ وہ کتنا تعلیم یافتہ ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟"

"میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا کہ کوئی اوباش قسم کا نوجوان میری بیٹی کو بہکا رہا ہے۔ میری نظر میں اپنے ہی خاندان کا ایک اچھا لڑکا تھا اس لئے میں شاہد کے متعلق معلومات حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی رہائش گاہ پر پہنچتے ہی اس کے دوست کو الٹی سیدھی باتیں سنانا شروع کر دیں اور اسے شاہد تک یہ دھمکی آمیز پیغام

پہنچانے کے لئے کہا کہ وہ اونچا اڑنے کے لئے ایک نادان لڑکی کو اس طرح پھانسنے کی کوشش نہ کرے۔ لڑکی نادان ہے لیکن اس کے باپ نے دنیا دیکھی ہے۔ شاہد جو دولت حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے اس کے یہ خواب کبھی پورے نہ ہوں گے۔ میں بہت اثر رسوخ والا آدمی ہوں۔ اسے حوالات میں بند کرا سکتا ہوں۔ اگر وہ اپنی خیریت چاہتا ہے تو وہ فرحانہ کا خیال چھوڑ دے بلکہ یہ شہر چھوڑ کر چلا جائے۔ غصہ کی حالت میں جو کچھ میرے منہ میں آیا بکتا چلا گیا پھر اچھی طرح دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد وہاں سے واپس آگیا۔"

"فرحانہ کو آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے تمام دن اپنی بیٹی کا سامنا نہیں کیا۔ شام کو وہ شبانہ کلب گئی وہاں شاہد سے اس کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ کلب سے اس کے دوست کے مکان پر پہنچی وہاں پتہ چلا کہ شاہد اپنا بوریہ بستر سمیٹ کر وہاں سے جا چکا ہے۔ اس کے دوست نے فرحانہ کو تمام باتیں بتا دیں کہ میں نے کس طرح شاہد کی بے عزتی کی ہے۔ فرحانہ ٹھنٹھناتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میرے پاس آتے ہی اس نے غصے سے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"ڈیڈی آپ نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ شاہد کے پاس جاکر اس کے خاندانی حالات معلوم کریں گے لیکن آپ نے وہاں جاکر اسے گالیاں دی ہیں۔ اس کی شرافت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی گالیاں برداشت نہ کرسکا اور یہاں سے چلا گیا۔"

"بیٹے وہ تمہیں نہیں بلکہ میری دولت کو چاہتا تھا میری ایک ہی جھڑکی سن کر یہاں سے بھاگ گیا۔ ہماری بات مان لو بیٹی۔ ایک اچھی ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں شادی سے پہلے محبت کریں۔"

"یہ آپ اپنے زمانے کی باتیں کررہے ہیں۔ میں اپنے زمانے کی بات کرتی ہوں۔ جو تمام زندگی کا ساتھی ہوتا ہے اسے پہلے سے دیکھنا اور پسند کرنا ضروری ہے۔"

"تم نادان ہو ابھی شادی نہیں کی ہے اس لئے ایسا کہتی ہو شادی کے بعد عشق کا بھوت سر سے اتر جاتا ہے۔ صرف میاں بیوی والی محبت رہ جاتی ہے۔ شادی اپنی مرضی سے ہو یا اپنی مرضی کے خلاف ہو دونوں ہی صورتوں میں مشرقی لڑکیاں روایتی بیویوں کی طرح زندگی گزارتی ہیں۔"

وہ غصہ سے تلملاتی ہوئی بولی۔

"میں آپ کو قائل نہیں کر سکتی آپ مجھے قائل نہیں کر سکتے لیکن یہ بات آپ اچھی طرح یاد رکھیں کہ میں شاہد کی بے عزتی برداشت نہیں کروں گی۔ وہ یہ شہر چھوڑ کر گیا ہے' میں بھی یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

یہ دھمکی دے کر وہ غصہ سے پیچ و تاب کھاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس وقت میری سمجھ میں یہی آیا کہ ضدی لڑکی ہے بچپن سے اس کی یہی عادت ہے۔ ضد پوری نہ ہو تو ماں باپ کو الٹی سیدھی دھمکیاں دیتی ہے۔ اب بھی یہی حال ہے غصے میں پاگل ہو گئی ہے۔ جب شاہد نہیں ملے گا تو رفتہ رفتہ یہ بھی اسے بھول جائے گی۔

مگر میرا خیال غلط نکلا ہم رات کو اس کی طرف سے مطمئن ہو کر سو گئے تھے صبح اٹھ کر پتہ چلا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی اپنا ضروری سامان لے کر میری کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ میں اسے کار ڈرائیو کرنے کے لئے منع کرتا تھا کیونکہ وہ بہت تیز ڈرائیونگ کرتی تھی کئی بار چالان ہو چکا ہے۔ دوبار کار سے کار ٹکرا دی۔ اسی شام ہمیں خبر ملی کہ میری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور کار چلانے والی شہر سے دور ایک قصبے کے چھوٹے سے ہسپتال میں پڑی ہے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو فرحانہ ہسپتال کے ایک بستر پر پڑی ہوئی تھی اس کے سر پر اور ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ ہوش میں آتی ہے پھر گہری نیند سو جاتی ہے۔ اس سے کچھ پوچھا گیا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کار کے لائسنس نمبر سے اور فرحانہ کی ڈائری میں لکھے ہوئے پتہ سے معلوم ہوا کہ وہ کون ہے اسی پتہ پر ہمیں بھی اطلاع دی گئی تھی۔

دوسری صبح اسے ہوش آیا تو اس نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا پہلے تو ہم نے یہی سمجھا کہ وہ اب تک ہم سے ناراض ہے اور ہمیں ممی اور ڈیڈی کہنے کے باوجود خون کے رشتے سے ہمیں نہیں پہچان رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"ایسا کیوں ہوا ممتاز صاحب؟"

"محض ضد کی وجہ سے۔ ضد میں نے بھی کی ضد بیٹی نے بھی کی ہم سوچ بھی نہیں

سکتے تھے کہ اس کا نتیجہ اتنا پریشان کن ہو گا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے لیکن دیر سے ہوا۔ میں فرحانہ کی خاطر دوبارہ شاہد کے پاس گیا لیکن اس بار بھی اس سے ملاقات نہیں ہو سکی' اس کا دوست بھی اپنا وہ مکان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ شاہد سے کبھی میرا سامنا نہیں ہوا اگر میں اسے ایک بار بھی دیکھ لیتا تو اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر افسوس بیٹی سے چھنی ہوئی خوشی دوبارہ اسے لوٹا نہیں سکتا۔"

ڈاکٹر سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

"اب فرحانہ کی شادی ہو جائے تو بہتر ہے وہ شاہد کو بھول چکی ہے۔ ڈائری کے ذریعہ جو شاہد اس کے سامنے آیا ہے اس کی چاہت اتنی شدید نہیں ہو گی چونکہ وہ اس کا چہرہ بھول چکی ہے لہٰذا اس کی جگہ کوئی بھی شاہد آسکتا ہے۔"

ڈاکٹر یہ بات کہہ کر خود ہی چونک گیا۔ پھر اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"ایک تدبیر سوجھ رہی ہے۔ اگر فرحانہ پوری ڈائری پڑھنے کے بعد پھر شاہد سے والہانہ محبت کا اظہار کرے تو کسی بھی شاہد نام کے اچھے خاندانی لڑکے سے اس کی شادی کی جاسکتی ہے۔"

"ڈاکٹر...... یہ تدبیر میرے ذہن میں بھی آئی تھی مگر میں یہ سوچ کر ہچکچا رہا تھا کہ اس کی یادداشت اگر واپس آگئی تو وہ پھر ہنگامہ کرے گی۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ممتاز صاحب؟ شادی کے بعد لڑکی کو جب شوہر کا پیار ملتا ہے اور وہ بچوں کی ماں بن جاتی ہے' اس کے بعد یادداشت واپس آئے تو وہ خود ہی فیصلہ کرتی ہے کہ ایک شریف لڑکی نے جس مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گذاری ہے اور جس آدمی نے شوہر بن کر اسے اتنے عرصہ تک پیار کیا ہے وہ اسے کبھی نہیں چھوڑ سکے گی۔ ایسے وقت فرحانہ کا فیصلہ شاہد کے حق میں نہیں بلکہ اپنے شوہر کے حق میں ہو گا۔"

ممتاز احمد نے قائل ہو کر کہا۔

"آپ درست کہتے ہیں۔ میں نے اتنی دور تک نہیں سوچا تھا حالانکہ یہی بات میں فرحانہ کو سمجھایا کرتا تھا کہ شادی کے بعد عورت صرف اپنے شوہر کی محبت کو ہی یاد رکھتی ہے۔ پچھلی تمام محبتیں بھول جاتی ہے یہ اچھی تدبیر ہے۔"

"تدبیر اچھی ہے تو اس پر فوراً ہی عمل کرنا چاہئے۔ فرحانہ نے مجھ سے پوچھا ہے

کہ اس ڈائری کے علاوہ اس کی اور کتنی ذاتی اور اہم چیزیں ہمارے پاس ہیں۔ اس سلسلہ میں شاہد کے کچھ محبت نامے پیدا کرنے ہوں گے۔ اگرچہ یہ معیوب سی بات ہے کہ آپ بیٹی کے لئے ایسا کریں مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

ممتاز احمد نے اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت ہی ٹیڑھا کام ہے میں کیسے کر سکوں گا؟"

"آپ کرنا چاہیں تو یہ کام آسان ہو جائے گا۔ اب تک فرحانہ کے لئے جتنے رشتے آچکے ہیں ان میں سے آپ ایک ایسے نوجوان کا انتخاب کریں جو آپ کے اشاروں پر چل سکے اور جو آپ کے کہنے پر اپنا نام بدل کر خود کو شاہد کہہ سکے۔"

"فرحانہ کے لئے جتنے لڑکوں کا پیغام آیا ہے ان میں سے ایک شاہد ہے۔ اگر وہ میرے اشاروں پر چلنے کے لئے راضی ہو جائے تو پھر شاہد کے جعلی نام سے فرحانہ کا نکاح پڑھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"ہاں! یہ اچھی بات ہے۔ آپ کوشش کریں کہ جس کا نام شاہد ہے۔ وہ اتنی فراخدلی کا ثبوت دے کہ فرحانہ کے ماضی کو کرید کر اسے دوسرے شاہد کی محبت کا طعنہ نہ دے بلکہ خود ہی اس کا گمشدہ شاہد بن جائے اور فرحانہ کی تسلی کے لئے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند محبت نامے پیش کرے مگر یہ نیا زمانہ ہے آج کل خطوط کے بجائے کیسٹ کے ذریعے رازونیاز کی باتیں کی جاتی ہیں۔ آپ پہلی فرصت میں اس شاہد سے کہیں کہ وہ اپنی آواز کیسٹ میں ریکارڈ کرے اس کے بعد وہ کیسٹ ہم فرحانہ کو یہ کہہ کر دیں گے کہ وہ اس کی اہم چیزوں میں سے ایک ہے۔"

ممتاز احمد نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے ایک سگریٹ سلگایا اور اس کا کش لگاتے ہوئے بیٹی کو ایک بار پھر دھوکہ دینے کے منصوبے پر غور کرنے لگے۔

☆======☆======☆

رات کی خاموشی میں کیسٹ سے کسی شاہد کی آواز ہولے ہولے ابھر رہی تھی۔ فرحانہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی اس آواز کو بڑے انہماک سے سن رہی تھی۔ ریکارڈر اس کے کانوں کے قریب ہی تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شاہد ڈائری کے اوراق سے نکل کر اس کے بالکل قریب آگیا ہو اور اس کے کان کے قریب سرگوشیاں کر رہا ہو۔

"فرحانہ............ میں اپنی یہ آواز ریکارڈ کرنے کے بعد تمہارے پاس کسی

طرح پہنچا دوں گا۔ جب تمہیں نیند نہ آئے اور تنہائی ڈسنے لگے اور میری جدائی تمہیں کروٹیں بدلنے پر مجبور کرے تو اس کیسٹ کو ریکارڈر میں رکھ کر آن کر دینا۔ میں تمہارے پاس آجایا کروں گا اور تمہارے کانوں کے قریب میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرتا رہوں گا۔

ہم اس دور میں داخل ہو چکے ہیں جہاں جدائی کے لمحات میں بھی وصال کا مزہ آتا ہے محبوب کی صورت نظر نہیں آتی مگر اس کی آواز پیار کا جادو جگاتی رہتی ہے۔ تم مجھے اپنے قریب نہیں بلا سکتیں میں تمہاری خواب گاہ میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا ایسے وقت میری آواز تمام پابندیوں کو توڑ کر تمہارے پاس آرہی ہے۔"

فرحانہ آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی اور اس انجانے شاہد کی آواز سن رہی تھی جسے ڈائری کے اوراق سے پہچانتی تھی مگر جانتی نہیں تھی۔ اسی لئے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ اس آواز والے کو اپنے قریب محسوس کر سکے جب اس کی قربت کا احساس ہو گا تو شاید تصور میں اس کی صورت بھی جھلک جائے گی۔

ہاں وہ اس کی سماعت کے بالکل قریب تھا۔ وہ کسی شاہد کو اپنے قریب محسوس کر رہی تھی لیکن تصور میں کوئی تصویر نظر نہیں آرہی تھی اس اجنبی آواز نے اس کی بے چینی بڑھا دی۔ ایک ایسے پُراسرار محبوب کو جنم دیا جو فضا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔ صرف اپنی آواز سے اپنے جادو کا پتہ دیتا تھا۔ وہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ آواز اسے سمجھا رہی تھی کہ آواز والا بھی کہیں آس پاس موجود ہے وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر وہاں سے اٹھ کر بالکونی کی طرف یوں جانے لگی جیسے نیند کی حالت میں چل رہی ہو۔ مگر وہ نیند میں نہیں تھی۔ آنکھیں بھی جاگ رہی تھیں۔ ذہن بھی جاگ رہا تھا۔ مگر وہ جاگتا ہوا ذہن محبوب کی آواز سے دھوکہ کھا رہا تھا۔

اس کے والدین بڑی کامیابی سے اسے دھوکہ دے رہے تھے۔ پتہ نہیں کس شاہد کی آواز ریکارڈ کی گئی تھی۔ جس کی بھی آواز ہو وہ فرحانہ کے اپنے شاہد کی آواز بن گئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بالکونی میں آکر کھڑی ہو گئی۔ آخر شب کی ہوائیں اس کے لباس کو اور اس کی زلفوں کو چھیڑ رہی تھیں۔ سرمئی بدلیوں میں چاند اپنا بدن چھپا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ چھپنے والا نظر آگیا۔ اس سے نظریں ملتے ہی وہ کہنے لگا۔

"کیا اب بھی تم مجھے نہیں پہچانو گی؟ میں تمہارے خوابوں میں آتا ہوں۔ یاد کرو کیا تم نے اپنے کسی خواب میں مجھے دیکھا ہے؟"

"ہاں! ایسا لگتا ہے کہ میں نے اس چہرے کو بارہا خوابوں میں دیکھا ہے لیکن نہیں خواب میں بھی چہرہ صاف طور سے نظر نہیں آتا۔ وہاں بھی صرف اس کی آواز ہی سنائی دیتی ہے۔ اب بھی وہی آواز میری خواب گاہ سے ابھر رہی ہے اور ویسی ہی آواز اس اجنبی کی ہے جو میرے سامنے کھڑا ہے۔" اس نے اجنبی سے پوچھا۔

"کیا تم میری خواب گاہ میں اپنی آواز کو سن رہے ہو؟ اگر تم وہی آواز والے ہو تو پھر تم شاہد ہو۔ میں بہت دیر سے تمہاری آواز سن کر خیالوں میں تمہاری تصویر بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ یہاں بالکونی میں آ کر یہ تصویر مکمل ہو گئی ہے۔ اگر تم وہی شاہد ہو تو پھر مجھے بتاؤ کہ تم کہاں گم ہو گئے تھے؟"

"میں تو موجود تھا تم نے اپنے آپ کو گم کر دیا ہے میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ خود کو تلاش کرو اپنے آپ کو پہچانو تب ہی مجھے بھی پہچان سکو گی۔"

فرحانہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہرو شاہد میں تمہارے پاس آتی ہوں مجھے یاد آ رہا ہے پہلے بھی تم خوابوں میں آ کر گم ہو گئے تھے۔ میرے قریب نہیں آئے تھے۔"

"میرے قریب آؤ گی تو میں اب بھی گم ہو جاؤں گا۔ میں تمہارا ایک خیال ہوں اور خیال کو تم قریب آ کر اور چھو کر نہیں دیکھ سکتیں۔"

"نہیں، نہیں۔ تم خیالی تصویر نہیں ہو۔ میری آنکھیں جاگ رہی ہیں۔ میرا ذہن جاگ رہا ہے اور میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ تیزی سے پلٹ کر دروازے کی طرف جانے لگی اسے اپنے محبوب کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"رک جاؤ فرحانہ......... تم کبھی خیالوں میں اور کبھی خوابوں میں بھٹکنے والی لڑکی ہو تم اس طرح مجھے نہیں پا سکو گی۔"

مگر وہ اپنے اجنبی محبوب کو ایک بار دیکھ لینے کے بعد اس سے دور رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تیزی سے زینے طے کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی پھر کوٹھی کے باہر

آئی اس کے بعد اپنی خواب گاہ کی بالکونی کے نیچے پہنچے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ اسے پکارنے لگی اس کی پکار میں کسی برہن کے آنسو تھے۔ وہ اِدھر سے اُدھر بھاگتی ہوئی اسے ڈھونڈنے لگی۔ پورے باغیچے میں تتلی کی طرح یہاں سے وہاں تک اپنا ریشمی پیراہن لہراتی رہی۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا آخر وہ تھک ہار کر گر پڑی۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر پڑی تھی اور اس کی ممی اس کے قریب بیٹھی اس کا سر سہلا رہی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ یہ سب کچھ کیا تھا؟ خواب تھا یا حقیقت تھی؟ کیا وہ واقعی خیالوں میں بھٹکنے والی لڑکی ہے؟ اس کی ممی نے بڑے پیار سے کہا۔

"بیٹی ہم نے تمہاری ضد پوری نہیں کی ہم اپنی ضد پر قائم رہے جس کے نتیجے مین یہ دن دیکھنے پڑے۔ دیکھو تو تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب اسی شاہد سے تمہاری شادی ہو گی۔ جسے تم پسند کرتی ہو۔ پچھلی شام تمہارے ڈیڈی اس سے مل چکے ہیں اور صبح اسے یہاں آنے کے لئے کہا ہے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے تم تھوڑی دیر آرام کرو۔ وہ دس بجے تک یہاں آئے گا اگر تم اسے پہچان لو گی تو ہم جلد ہی شادی کی تاریخ مقرر کر دیں گے۔"

فرحانہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں یہ سنتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ جس کے لئے وہ خیالوں میں اور خوابوں میں بھٹکتی رہی تھی اور خیالوں میں جس کی تصویر بنانے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی وہ چند گھنٹوں میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ اس کے دل میں اضطراب تھا۔ بند آنکھوں میں حیا تھی اور چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ آیا تو فرحانہ کے لئے بہت سی مٹی مٹی سی یادیں لے کر آیا۔ فرحانہ نے پہلے تو پردے کی آڑ میں اسے دیکھا۔ وہ صورت شکل سے بالکل وہی تھا جو پچھلی رات نظر آیا تھا۔ کیسٹ سے ابھرنے والی آواز اور اس کی آواز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس کے ممی اور ڈیڈی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اس سے باتیں کر رہے تھے وہ ان کی باتوں کا جواب دیتا جا رہا تھا اور فرحانہ اپنے گمشدہ محبوب کی آواز سنتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں گئی۔ شاہد کے سامنے چائے رکھتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے والدین نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا

پھر چائے پینے کے دوران باتیں کرتے کرتے پہلے تو اس کے ڈیڈی وہاں سے کھسک گئے پھر اس کی ممی کام کا بہانہ کرکے وہاں سے چلی گئیں۔ تب شاہد نے اس سے کہا۔

"فرحانہ تم کتنی بدل گئی ہو۔ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک حادثے میں تم اپنی پچھلی زندگی بھول گئی ہو تب سے یہ سوچ کر میں پریشان ہو جاتا تھا کہ شاید تم مجھے بھی بھول جاؤ گی۔ میری پریشانی بجا تھی۔ تم واقعی مجھے بھول چکی ہو۔"

فرحانہ صوفے پر بے بسی سے پہلو بدلتی ہوئی بولی۔

"میں کیا جواب دوں میری سمجھ میں نہیں آتا مجھے یہ سوچ کر شرمندگی ہوتی ہے کہ تم جو میری محبت کا سرمایہ ہو تمہیں بھی میں نے بھلا دیا ہے۔ پتہ نہیں میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے؟ بار بار ذہن پر زور ڈالتی ہوں۔ مگر تمہاری کوئی بات یاد نہیں آتی لیکن پچھلی رات کیسٹ کے ذریعے تمہاری باتیں سن کر مجھے یقین آ رہا تھا کہ وہ باتیں میں پہلے بھی کبھی سن چکی ہوں۔"

"کیا شبانہ کلب کی راتیں تمہیں یاد ہیں؟ جب میں تمہارے لئے گٹار پر ایک خاص دھن بجایا کرتا تھا۔ مگر میں بھی کیا پوچھ رہا ہوں؟ جب میں یاد نہیں آتا تو میری سنائی ہوئی دھنیں تمہیں کیا یاد آئیں گی۔ تمہارے ڈیڈی کے کہنے پر جب سے میں نے یہ شہر چھوڑا ہے اس وقت سے گٹار بجانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"تمہیں گٹار بجانا چاہئے۔ میں ایک بار پھر سنوں گی کہ تم کیسی دھنیں ترتیب دیتے ہو؟"

"نہیں فرحانہ میں تمہاری پسند سے تمہیں حاصل نہیں کر سکتا۔ تمہیں حاصل کرنے کے لئے تمہارے ڈیڈی کی پسند کا خیال رکھنا ہو گا اور انہیں موسیقی پسند نہیں ہے۔ اتنے دولت مند گھرانے میں صرف سکوں کی جھنکار ہی بہترین موسیقی سمجھی جاتی ہے۔ میں نے عہد کیا ہے کہ اب کبھی گٹار کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ تم وعدہ کرو کہ تم مجھے یہ وعدہ توڑنے پر مجبور نہیں کرو گی۔"

اس کے ممی اور ڈیڈی ڈرائنگ روم کے باہر پردے کے پیچھے چھپے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ پھر ڈیڈی نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ فرحانہ نے گٹار سننے کی ضد نہیں کی ورنہ شاہد کی اصلیت کھل جاتی۔"

اس کی ممی نے مسکرا کر کہا۔

"لڑکا سمجھ دار ہے۔ کتنی خوبصورتی سے باتیں بنا رہا ہے۔"

فرحانہ کے ڈیڈی نے کہا۔

"آج کل کے بچے کیا خاک سمجھدار ہوں گے۔ تمہاری بیٹی اور وہ شاہد مجھے احمق بنا کر شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی دنیا دیکھی ہے سمجھ داری تو میری ہے کہ میں نے ایک اعلیٰ خاندان کے لڑکے کو شاہد بننے پر مجبور کر دیا۔"

"آپ نے کیا مجبور کیا ہے؟ اس کا نام ہی شاہد ہے۔"

"ہاں نام شاہد ہے مگر وہ شاہد نہیں ہے' جسے تمہاری بیٹی چاہتی تھی۔ یہ تو میں نے اسے سکھایا پڑھایا ہے۔ میں نے اسے فرحانہ کی ڈائری پڑھنے کے لئے دی تھی تاکہ وہ اس ڈائری میں لکھے ہوئے تمام واقعات اور مکالمات کو زبانی یاد کر لے۔ اب دیکھو فرحانہ کے سامنے کیسے فرفر بول رہا ہے۔"

"یہ تو میں مانتی ہوں لیکن یہ آپ نے اچھی طرح معلوم کر لیا ہے تاکہ لڑکا خاندانی ہے اور چال چلن کا برا نہیں ہے۔"

"تم اطمینان رکھو' میں نے کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے کچھ دوسروں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ لڑکے کے والدین مر چکے ہیں اور وہ ایک کوٹھی ایک کار اور لاکھوں.......... کے بینک بیلنس کا تنہا مالک ہے۔ یوں سمجھو کہ فرحانہ کے نصیب جاگ گئے ہیں۔ یہاں بھی دولت سے کھیلتی رہی۔ وہاں بھی دولت اس کے قدموں میں ہو گی۔"

وہ دبی دبی سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور وہ رہ رہ کر نقلی شاہد کی باتیں سنتے رہے۔

☆======☆======☆

وہ دلہن بنی پھولوں بھری سیج پر بیٹھی تھی۔ ایسے وقت اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اکثر وہ یہی سوچتی کہ اس کی پیدائش کو ابھی صرف چار ماہ گزرے ہیں۔ یعنی جب اس نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو خود کو ایک ہسپتال کے بیڈ پر جوانی کی عمر میں دیکھا۔ اس سے پہلے کی زندگی کیا تھی؟ وہ نہیں جانتی تھی بس ایسا لگتا تھا جیسے جوان ہی پیدا کی گئی ہو۔

اس لحاظ سے وہ چار ماہ کی تھی.......... ڈھائی مہینے تک ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک ادھیڑ عمر کا مرد دونوں اسے سمجھاتے رہے کہ وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ اسی ڈھائی مہینے کے دوران ڈاکٹر زبیری اس کا نفسیاتی تجزیہ کرتا رہا۔ پھر اس نے اس کی تحریر سے اور ڈائری سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ڈھائی ماہ سے پہلے کس قسم کی زندگی گزار چکی ہے۔ کون اس کے ماں باپ ہیں اور کون اس کا محبوب ہے۔

پھر ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں اس کا محبوب اس کا شاہد دوبارہ اس کی زندگی میں آگیا۔ کوئی خوبرو ہیرو کہانی کے صفحات سے نکل کر اک دم سے سامنے چلا آئے تو آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا۔ چار ماہ کے مختصر عرصے میں یہ سب کچھ ایک فاسٹ ٹیمپو کا ڈرامہ نظر آتا تھا۔ جس میں یکے بعد دیگرے نئے نئے واقعات رُونما ہوتے جاتے ہیں درمیان میں کوئی ٹریجڈی نہیں آتی۔ ڈرامے کے اختتام پر وہ فوراً ہی دلہن بن کر بیٹھ جاتی ہے اور شہنائیوں کی گونج میں دولہا اس کا گھونگھٹ اٹھانے کے لئے آجاتا ہے۔

شاہد دولہا بن کر پھولوں کی سیج پر آگیا۔ اس نے گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے بڑے ہی محبت بھرے انداز میں کہا۔

"فرحانہ آج سے تم میری شریکِ حیات بن گئی ہو۔ ہم نے برسوں پہلے ایسی ہی سہانی رات کا سپنا دیکھا تھا۔ تمہیں یاد ہے ایک بار میں نے کہا تھا کہ ایک دن میں دولہا بن کر تمہارے پاس آؤں گا اور تمہارا گھونگھٹ اٹھاؤں گا تو یہ سن کر تم شرما گئی تھیں۔"

شاہد کی بات سنتے ہی وہ شرمانے لگی۔ اسے یاد تو نہیں آیا کہ وہ کبھی شرمائی تھی مگر اب رسمی طور پر شرما رہی تھی۔ شاہد نے گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے اسے زیورات کا ایک چھوٹا سا بکس دیا جو مخمل سے منڈھا ہوا تھا۔

"اسے کھول کر دیکھو فرحانہ' سنا ہے کہ دلہن کا چہرہ دیکھنے کے لئے دلہن جیسی خوبصورت سی رشوت دینی پڑتی ہے۔ ذرا دیکھ لو یہ رشوت تمہیں منظور ہے یا نہیں؟ مگر تم تو شرما رہی ہو۔ یہ لو میں ہی اسے کھول کر دکھاتا ہوں۔"

اس نے مخمل کے ڈبے کو کھول دیا۔ اس میں سونے کے زیورات نہیں تھے۔ فرحانہ نے گھونگھٹ کے سائے میں ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس ڈبے میں چھوٹا

سا سونے کا ایک گٹار رکھا ہوا تھا۔ اسے شاہد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ایک گٹار کی آواز سے ہماری محبت کی ابتدا ہوئی تھی۔ جب میں اس کے تاروں کو چھیڑتا تھا تو تمہارے دل کے تار لرزنے لگ جاتے تھے۔ دونوں کی ہم آہنگی نے ہمیں ایک دوسرے سے ملا دیا۔ مگر اس گٹار کے سُر کھو گئے ہیں فرحانہ جب سے تم کھو گئی ہو۔"

فرحانہ کا دل تڑپ گیا۔ وہ کہنا چاہتی تھی میں گم شدہ ہوں مگر تمہارے سامنے ہوں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کہ یہ گٹار تمہارے سامنے ہے۔ مگر یہ اپنی آواز کھو چکا ہے۔ کبھی کبھی آواز کے بغیر ساز کو خوشبو کے بغیر پھول کو اور پچھلی محبتوں کے بغیر ایک عورت کو گلے لگانا پڑتا ہے۔

شاہد نے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"میری جان! میں تمہیں تمہارا ماضی یاد دلاؤں گا۔ جس دم تم خود کو پہچان لو گی اس روز گٹار اٹھاؤں گا اور تمہارے زانو پر سر رکھ کر محبت کی میٹھی میٹھی دھنیں ترتیب دوں گا۔"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ میں گٹار کی آواز سنوں۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہارے اندر کی فرحانہ کو پالوں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے میں کوشش کرتے کرتے تھک گئی ہوں مگر خود کو نہ پا سکی۔"

"یہی حال میرا ہے فرحانہ۔ اس گٹار کی وجہ سے تمہارے ڈیڈی نے ہمیں جدا کر دیا تھا۔ اب تم ملی ہو تو پھر بھی اجنبی سی لگتی ہو۔ میں نے یہ تحفہ تمہیں اسی لئے دیا ہے کہ تم اکثر اسے دیکھتی رہو گی اور یاد کرتی رہو گی کہ میں نے تمہیں کھو دینے کے بعد اس خالی گٹار کی طرح پایا ہے۔"

وہ روتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ایسی باتیں نہ کرو شاہد۔ میں اپنی ہی نظروں سے گر جاتی ہوں۔ وہ عورت ہی کیا جو خود کو مکمل کر کے اپنے مرد کے سامنے اپنے آپ کو پیش نہ کر سکے۔ میں کوشش کروں گی۔ ضرور کوشش کروں گی کہ میں اس سونے کی گٹار کی طرح خالی نہ رہوں۔"

شاہد نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر اس کے پھول جیسے شگفتہ چہرے کو دیکھا تو آنکھوں کے کنول پر شبنم کے قطرے منڈلا رہے تھے۔ وہ نین کنول پر جھک گیا اور اپنے لبوں سے ان قطروں کو چننے لگا۔

محبت کی کنواری کلیاں چٹکنے لگیں۔ وقت پیار کی خوشبو سے معطر ہو کر گزرنے لگا۔ اب فرحانہ کی ساری سوچیں شاہد کے لئے مخصوص ہو گئیں۔ رات ہوتی تو وہ اس کے بازوؤں میں سو جاتی' صبح آنکھیں کھولتی تو وہ شاہد ہی کا چہرہ دیکھتی۔ اس کے ممی اور ڈیڈی نے شاہد کو مجبور کیا تھا کہ وہ اپنی تمام جائیداد حیدر آباد سے منتقل کر کے یہاں لے آئے۔ انہوں نے اپنی کوٹھی فرحانہ کے نام کر دی تھی۔ اس لئے شاہد نے بھی ان کے مشوروں پر عمل کیا اور اسی کوٹھی میں آ کر رہنے لگا۔ تمام دن وہ کاروباری مصروفیات کے باعث فرحانہ سے دور رہتا تھا اور فرحانہ تنہا بیٹھی اپنے موجودہ شاہد کے تسلسل سے گم کردہ شاہد کا سلسلہ ملانے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر تھک ہار کر جھنجلا جاتی۔

ایسے وقت اس کی ہری بھری زندگی کچھ اجاڑ اجاڑ سی نظر آنے لگتی۔ اس کی زندگی میں بہار ہی بہار تھی مگر اس کے بیچ خزاں کے گرم جھونکے سے محسوس ہوتے۔ شاہد ڈائری کے اوراق کے مطابق بڑی کامیابی سے اپنا رول نبھا رہا تھا۔ مگر کوئی بات کھٹکتی تھی جسے فرحانہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

وہ سونے کے گٹار کو اٹھا کر دیکھنے لگتی تو بس اتنا ہی پتا چلتا کہ اس کی زندگی اسی طرح ماضی کی صداؤں سے خالی ہے۔ ارے کوئی لمحہ تو ایسا ہو جو بھولے سے صدا دے کر اپنی طرف بلائے۔ کوئی کیا جانے کہ ایک عورت ماضی کا سریلہ کھو کر اپنی موجودہ زندگی کو ہارتی جا رہی ہے۔

شاہد اسے اداس دیکھ کر اکثر سمجھاتا رہتا تھا۔ اسے گزرے ہوئے دنوں کی نہ جانے کیسی کیسی باتیں سناتا تھا۔ وہ شاہد کے سامنے اقرار کر لیتی تھی کہ ہاں کبھی ایسا ہو چکا ہے مگر اس کا ذہن ایک تاریک سرنگ کی طرح خالی رہتا تھا۔ وہ اس سرنگ میں دور دور تک بھٹکتی تھی مگر شاہد کی کوئی بات روشنی کا ہلکا سا چھینٹا بھی بن کر سامنے نہیں آتی تھی۔

"جب تمہیں کوئی بات یاد نہیں آتی ہے تو پھر یاد نہ کرو۔ میں تو تمہیں مل ہی چکا ہوں۔ پھر پچھلی باتوں کو یاد کرنا کیا ضروری ہے۔ کیا تم مستقبل کو خوش گوار بنانے کے

لئے اپنے ماضی کو دفن نہیں کر سکتیں۔ جو خود ہی دفن ہو چکا ہے۔ مگر تم ہو کہ اس نامعلوم چیز کو کھودنے کی کوشش کرتی ہو۔"

فرحانہ نے بڑے کرب سے جواب دیا۔

"اگر ماضی دفن ہو جائے تو پھر انسان کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ جب دوسرے لوگ اپنے ماضی کی خوشگوار باتیں کرتے ہیں تو ان کے سامنے میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہتا۔ میں اک دم سے خالی ہو جاتی ہوں شاہد! تم میرے اس خالی پن کو نہیں سمجھ سکتے۔"

وہ شاہد اسے سمجھتا تھا۔ اس لئے سر جھکا کر خاموش ہو جاتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا' ویسے ہی ویسے فرحانہ کے خالی ذہن کا خلا وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند اڑ چکی تھی۔ جب شاہد گہری نیند سو جاتا تو وہ بڑی آہستگی سے اس کے بازوؤں سے نکل جاتی اور اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے چہرے کو تکنے لگتی۔ اس کا دل اس سے سوال کرتا تھا۔

"اگر یہ وہی شاہد ہے تو تُو اب تک ادھوری کیوں ہے؟ اپنے محبوب کا پیار پانے کے بعد عورت مکمل ہو جاتی ہے۔ تیری تکمیل کے راستے کہاں کھو گئے ہیں؟"

وہ اک دم سے گھبرا کر شاہد سے دور جاتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک ننھی سی چڑیا کی مانند آندھیوں کی زد میں بھٹک رہی ہو۔ اِدھر سے اُدھر پھڑ پھڑا رہی ہو اور پھر پرائے بازوؤں کو اپنا آشیاں سمجھ کر پناہ لینے گئی ہو۔ وہ اتنے بڑے آسمان کے نیچے کب تک بھٹکتی ہوئی پرواز میں مصروف رہے گی۔

اس رات سوچتے سوچتے اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ پیاسی چڑیا پانی کے لئے بھٹکتی ہوئی اپنی خواب گاہ سے باہر نکلی۔ پھر اپنی ممی اور ڈیڈی کی خواب گاہ کے قریب سے گزرتے وقت ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ اس کی امی اس کا نام لے کر کہہ رہی تھیں۔

"فرحانہ کو دیکھ دیکھ کر میرا دل کُڑھتا ہے۔ میں پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں رہ سکتی۔ آپ ہی بتائیں کہ آپ کا نام ممتاز احمد ہے۔ کیا ممتاز نام کا دوسرا شخص میری زندگی میں آ کر آپ کی کمی پوری کر سکتا ہے؟"

ممتاز احمد کی جھنجلائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"تم فضول سی بحث کر رہی ہو۔ ہماری بات دوسری ہے۔ تم نے ہوش وحواس میں رہ کر مجھ سے شادی کی ہے۔ مگر تمہاری بیٹی نے ماضی کو بھول کر اس نقلی شاہد کو قبول کیا ہے۔ ہم نے ڈائری اور کیسٹ وغیرہ کے ذریعے اسے پوری طرح یقین دلادیا ہے کہ یہی اس کا گم شدہ شاہد ہے۔ یقین کرنے کے بعد بھی اگر وہ اداس رہتی ہے تو اس اداسی کی کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے۔"

"میں عورت ہوں اس کی اداسی کی وجہ خوب جانتی ہوں۔ عورت خالی الذہن ہونے کے باوجود دل سے خالی نہیں ہوتی۔ اس کے دل میں بھی ایک کمی سی کھٹکتی رہتی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے دراصل دو محبتوں کا فرق ہے۔ محبوب کی محبت شوہر کی محبت سے مختلف ہوتی ہے۔ فرحانہ کو شوہر کی محبت ملی ہے لیکن جب اسے ڈائری کی باتیں یاد آتی ہیں تو اسے ایک محبوب کی محبت میں انوکھا پن نظر آتا ہے۔ چونکہ مرد شوہر بننے کے بعد محبوب بن کر نہیں رہتا۔ اسی لئے اس کے دل میں اسی محبت کی کمی کھٹکتی رہتی ہے۔ تم یہ نہ سوچو کہ ہم نے ایک دوسرے شاہد کو اس کا جیون ساتھی بنا کر اسے مزید پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔"

اس خواب گاہ سے باہر فرحانہ دیوار سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بڑے ہی ذہنی کرب میں مبتلا تھی اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اتنا بڑا فریب جو اس کی زندگی کی آخری سانس تک اسے دیمک کی طرح چاٹتا رہے گا اور فریب دینے والے اس کے اپنے ہی ماں باپ تھے۔ وہ اک دم سے پھٹ پڑی۔ دروازے کے پاس آ کر چیخنے لگی۔

"کون کہتا ہے کہ تم میرے ماں باپ ہو۔ تم دونوں سے زیادہ بدترین دشمن میرا اور کوئی نہ ہو گا۔ میرا دل پہلے ہی کہتا تھا کہ میرے ساتھ کوئی بڑا ناٹک کھیلا جا رہا ہے۔ آج آپ لوگوں کی یہ سازش کھل کر سامنے آ گئی ہے۔"

بیٹی کو اچانک ہی دروازے پر دیکھ کر دونوں بوکھلا گئے۔ ممتاز احمد تو ایک مجرم کی طرح اسے دیکھتے رہ گئے مگر ان کی بیگم آگے بڑھ کر اپنی صفائی پیش کرنے لگیں۔

"بیٹی تم ہمیں غلط نہ سمجھو۔ سچ پوچھو تو ہم نے تمہارے شاہد کو تلاش کرنے کی ہر کوشش کی تھی۔"

"مگر وہ نہیں ملا۔" فرحانہ نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنے جھوٹ اور فریب پر پردہ ڈالنے کے لئے اور کتنے جھوٹ بولیں گی۔ جس بیٹی کے لئے اپنی ممتا کی ڈینگیں مارتی ہیں اس بیٹی کو اور کتنے فریب دے کر اس کی زندگی تباہ کرتی رہیں گی۔ اور اب تباہی کے لئے کیا رہ گیا ہے۔ مجھے ایک ایسے شخص کے پلے باندھ دیا جو شوہر بن کر بھی نیت کا کھوٹا ہے اور شاہد کا جھوٹا روپ ہے۔ آپ مجھے جواب دیں میں ایسے فریبی انسان کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکتی ہوں۔"

وہ اپنی امی سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھ رہی تھی اور چیخیں مار مار کر روتی جا رہی تھی۔ اس چیخ وپکار سے شاہد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا تو فرحانہ اسے دیکھتے ہی اپنی امی کے پیچھے چلی گئی اور انگلی اٹھا اٹھا کر تنبیہہ کے انداز میں کہنے لگی۔

"خبردار میرے قریب نہ آنا۔ تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

شاہد چند لمحوں تک حیرانی سے اس کا منہ تکتا رہا اور وہ اسے جھوٹا اور فریبی کہتی رہی۔ آخر اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "مجھے جھوٹا اور فریبی کہہ رہی ہو آخر کیوں؟"

"انجان بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم ممی اور ڈیڈی کے ساتھ مل کر مجھے جو فریب دیتے آئے ہو اس کا مجھے علم ہو چکا ہے۔ کوا مور کے پنکھ لگا کر مور نہیں بن سکتا۔ اسی طرح تم میرے شاہد نہیں ہو سکتے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو فرحانہ میں ہی تمہارا شاہد ہوں۔"

"بکواس مت کرو جب سے تم میری زندگی میں آئے ہو میں اندر ہی اندر بے اطمینانی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ میرا دل مجھے کچھ سمجھاتا تھا مگر میں کچھ سمجھ نہیں پاتی تھی۔ مگر آج سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہے۔"

"تم کچھ نہیں سمجھ رہی ہو۔" شاہد نے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم میری باتوں پر میری حرکتوں پر غور کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہارے شاہد سے الگ میری کوئی ہستی نہیں ہے۔ میں شادی سے پہلے کی ایسی باتیں تمہیں بتا رہا ہوں جو صرف ہم دونوں جانتے تھے۔ کوئی تیسرا نہیں جانتا تھا۔"

وہ غصے سے چیختی ہوئی بولی۔

"میری ڈائری تھی جو سب کچھ جانتی تھی تم نے اس ڈائری کے ایک ایک ورق کو زبانی یاد کرلیا پھر میرے سامنے آنے سے پہلے کیسٹ میں اپنی آواز ریکارڈ کی تاکہ پہلے سے یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ وہ کیسٹ کی آواز والے شاہد تم ہی ہو۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنی ہیرا پھیری سے مجھے بیوقوف بنایا جائے گا۔"

بہت دیر کے بعد اس کے ڈیڈی نے کہا۔

"فرحانہ ہمیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم نے تمہیں بیوقوف نہیں بنایا ہے بلکہ تمہاری زندگی سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ تمہاری خالی خالی سی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینے کے لئے تمہارے شاہد کو تلاش کیا ہے۔ شاہد تم خاموش کیوں ہو؟ تم ہی اسے سمجھاؤ کہ ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔"

فرحانہ نے نفرت سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں مجھے سمجھاؤ۔ مجھے نکاح کے بندھن میں باندھنے کے لئے اور کتنی تدبیروں سے کام لیا گیا تھا؟"

شاہد نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں ہی تمہارا شاہد ہوں۔ یہ بات میں نے تمہارے ممی اور ڈیڈی سے بھی چھپا رکھی تھی کہ کہیں یہ پھر مجھ سے نفرت نہ کرنے لگیں۔"

اس کی ممی نے جلدی سے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں واقعی ہمیں نہیں معلوم تھا۔ ابھی شاہد کی زبان سے پتہ چل رہا ہے۔ دیکھو تو تمہارا شاہد کتنا شریر ہے۔"

فرحانہ یک بیک قہقہہ لگانے لگی۔

"ہاں، میرا نہیں آپ کا شاہد شریر ہے۔ کیوں ڈیڈی آپ کو بھی ابھی شرارت کا علم ہوا ہوگا چلئے پھر کوئی نئی چال چلئے۔ ڈائری کی باتیں زبانی یاد کرکے کام نہیں چل سکا۔ کیسٹ کے ذریعے نقلی شاہد کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اب یہ نئی بات شروع ہوئی ہے کہ آپ کے اس شاہد نے مجھے دھوکہ نہیں دیا بلکہ آپ لوگوں کو دھوکا دے کر شادی کی ہے۔ اب میں قائل ہو جاؤں گی کہ یہ ہی میرے شاہد ہیں۔ میں بیوقوف جو ہوں۔"

وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی ہوئی اِدھر سے اُدھر لڑکھڑانے لگی اور قہقہوں کے

دوران کہنے لگی۔

"ہماری شادی کو آٹھ ماہ ہو چکے ہیں۔ اس دوران تم نے کسی حد تک گٹار بجانا بھی سیکھ لیا ہوگا۔ الٹی سیدھی دھنیں سیکھنے کے لئے آٹھ ماہ کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ چلو جاؤ کہیں سے گٹار اٹھا کر لاؤ اور مجھے دو چار دھنیں سنا کر پوری طرح قائل کر دو کہ تم ہی میرے شاہد ہو۔"

"دیکھو فرحانہ، تم نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔ میں واقعی تمہیں گٹار بجا کر سنا سکتا ہوں۔"

اس کے ڈیڈی نے اپنے داماد کی حمایت میں کہا۔

"ہاں اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا۔ شاہد، ابھی گٹار بجا کر سنا سکتا ہے۔"

شاہد نے جھنجلا کر ممتاز احمد سے کہا۔

"خدا کے لئے آپ لوگ خاموش رہیں۔ آپ میری حمایت میں بولتے رہیں گے تو فرحانہ کبھی یقین نہیں کرے گی۔"

فرحانہ نے اپنے ڈیڈی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہاں آپ سچے اور ایماندار شاہد کی حمایت میں نہ بولیں۔ اس لئے کہ سچوں کو کسی کی حمایت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں اس مضحکہ خیز حقیقت پر بھی یقین کرلوں گی کہ آپ پہلے موسیقی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ آج شاہد کی گٹار نوازی کو پسند کر رہے ہیں اور میرے سامنے اس موسیقی کو سننا بھی چاہتے ہیں جو آپ کے پلے نہیں پڑتی۔"

یہ کہتے ہی اس کے تیور بدل گئے۔ قہقہہ لگاتے لگاتے وہ پھر شیرنی کی طرح بپھر گئی۔

"آپ لوگوں نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ یہ درست ہے کہ میں اب تک بیوقوف بنتی رہی ہوں۔ مگر عقل سے بالکل خالی نہیں ہوں۔ نادانستگی میں بہت بڑا دھوکہ کھا چکی ہوں۔ مگر اب آپ سب کتنے ہی چہرے بدل کر آئیں میں آپ لوگوں کے فریبی چہروں کو پہچان لوں گی۔ اور شاہد، تم یہ بات اپنے دماغ سے نکال دو کہ کبھی تم مجھے اصلی شاہد بن کر دکھا سکو گے۔ کھوٹا سکہ ہمیشہ کھوٹا ہی رہتا ہے۔ میں جا رہی ہوں خبردار میرے کمرے میں قدم نہ رکھنا۔ اب میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ تینوں اس کمرے میں گم صم سے کھڑے رہے۔ پھر فرحانہ کی خواب گاہ کی طرف سے چیزوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سب تیزی سے چلتے ہوئے اس کی خواب گاہ کے سامنے پہنچے تو فرحانہ شاہد کا سوٹ کیس اٹھا کر باہر پھینک رہی تھی۔ پھر اس کے جوتے اور چپلیں باہر آئیں۔ پھر شاہد کی تصویر جسے وہ خوبصورت سے فریم میں سجا کر سرہانے رکھتی تھی' وہ خواب گاہ سے باہر آکر شاہد کے قدموں کے قریب گری اور اس کا شیشہ کرچی کرچی ہو گیا۔

وہ تینوں خاموشی سے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ کسی نے آگے بڑھ کر اسے سمجھانے کی کوشش نہ کی۔ بے حد ضدی ہے۔ بے حد انتہا پسند۔ ایک بار اسی طرح وہ غصے کی حالت میں آندھی اور طوفان کی طرح کار ڈرائیو کرتی گئی تھی اور حادثے کا شکار ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی۔ اس لئے سب کے سب سہمے ہوئے تھے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

مگر اس کا غصہ حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ وہ غصے سے چیختے چیختے چکرا کر گر پڑی۔ تب وہ سب دوڑتے ہوئے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ شاہد نے فوراً ہی اس پر جھک کر اسے آواز دی ذرا سہمے ہوئے انداز میں اس کے بازو کو تھام لیا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی اور اس کا بدن پسینے سے بھیگ کر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر قریب ہی بستر پر لٹا دیا۔ پہلے تو اسے اپنے طور پر ہوش میں لانے کی کوشش کی پھر اس کی ممی ریسیور اٹھا کر ڈاکٹر کو فون کرنے لگیں۔

ڈاکٹر آیا۔ اس کی نبض دیکھی اسٹیتھ سکوپ کے ذریعے اسے اندر سے ٹٹولا۔ انجکشن لگا کر ہوش میں لایا۔ پھر اس کے والدین کو اور اس کے شوہر کو یہ خوشخبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

☆======☆======☆

کتنے ہی ماہ گزرتے گئے۔ فرحانہ مہینوں کو گننا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ اسے ماں بننے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ غصے سے چیخ چیخ کر یہی کہتی تھی۔

"میں کسی رشتے کو تسلیم نہیں کرتی۔ میری کوئی ممی نہیں ہے۔ کوئی ڈیڈی نہیں ہیں۔ میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔ مجھے اس بچے سے بھی نفرت ہے۔"

وہ زبان سے نفرت کا اظہار کرتی تھی۔ مگر اس بچے کو اپنے وجود سے نوچ کر الگ نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ خواہ شوہر سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو نفرت سے کاٹ کر نہیں پھینک سکتی تھی۔ شاہد اس کے کمرے میں نہیں آتا تھا کیوں کہ وہ اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کا بچہ اس کی خواب گاہ میں اس کے وجود میں اور اس کے خون میں کلبلاتا رہتا تھا۔ ایسے وقت میں وہ بڑی بے بسی سے سوچنے لگتی۔

"میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی۔ ادھر اس شاہد کو کیسے تلاش کروں؟ جس کی صورت میں نہیں پہچانتی۔ اگر پہچان بھی لوں تو کیا منہ لے کر اس کے سامنے جاؤں؟ اب میں بیاہتا ہوں اور ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ وہ محبوبیت کہاں سے لاؤں گی جس کا وہ طلب گار ہوگا۔ اب تو میں مکمل عورت بن گئی ہوں۔"

ادھر اس شاہد سے کیسے پیچھا چھڑاؤں۔ یہ درست ہے کہ وہ میرا مجازی خدا ہے۔ اگر مجازی کے معنی جھوٹا ہے تو میں اس جھوٹے خدا کے ساتھ نہیں رہ سکتی اس نے شوہر کے رشتے کی توہین کی ہے۔ مجھے شروع سے ہی فریب دیتا رہا ہے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکتی ہوں؟

آہ! میں کیا کروں؟ میں اسے کیسے چھوڑوں جب کہ اس کا بچہ میرے وجود میں پل رہا ہے۔ بچے کی طرف سے سوچتی ہوں تو اپنے شوہر سے نفرت کرنے کے باوجود

نفرت نہیں کرسکتی۔ وہ جیسا بھی ہے بچے کی خاطر اسے برداشت کرنا ہوگا۔ اف ان لوگوں نے کتنی ساری مجبوریوں میں جکڑ کر رکھ دیا ہے۔

وہ سوچتی رہتی تھی مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتی تھی۔ بچے کے باپ سے نفرت نہیں کرسکتی تھی۔ مگر اسے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔ شاہد دور ہی دور رہ کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔

"فرحانہ خدا کے لئے سب کچھ بھول جاؤ۔ اب تم ماں بننے والی ہو۔ ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں کی طرح زندگی گذارو شادی سے پہلے محبت کا کھیل بڑا ہی غیر سنجیدہ ہوتا ہے مگر شادی کے بعد میاں بیوی کے درمیان سنجیدگی آجانی چاہئے ورنہ اولاد کے سامنے ماں باپ مذاق بن جاتے ہیں۔"

"میں تمہاری کوئی نصیحت نہیں سننا چاہتی۔" وہ چیختی ہوئی اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیتی۔ اس کے باوجود شاہد کی آواز سنائی دیتی تھی۔

"میری نصیحتوں پر تمہیں غور کرنا ہی ہوگا۔ تم نہ تو میرے رشتے سے انکار کرسکتی ہو اور نہ ہی اپنے ہونے والے بچے سے اس کے باپ کا نام الگ کرسکتی ہو۔ تم وقتی طور پر انکار کردو مگر ایک دن تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوجائے گا۔"

بند دروازے کے دوسری طرف سے اس کی آواز آتی رہتی۔ مگر آواز کا کیا ہے؟ وہ جھوٹی آواز تو کیسٹ سے بھی ابھرتی تھی۔ اب وہ خوابوں اور خیالوں میں بھی وہ آواز سن کر دھوکہ نہیں کھا سکتی تھی۔

ان کے درمیان غلط منصوبوں اور فریبی رشتوں کی خلیج حائل ہوگئی تھی۔ کوئی اسے نہیں سمجھا سکتا تھا اور وہ دوسروں کو اپنی مجبوریاں نہیں سمجھا سکتی تھی۔ شاہد نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ماں باپ بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے۔ فرحانہ بھی خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ اس کا شوہر اب اس سے دور دور رہتا ہے اور کئی کئی دن تک اپنی صورت نہیں دکھاتا ہے۔

اتنی بڑی کوٹھی میں قبرستان کا سناٹا رہتا.......... کوئی کسی سے کچھ نہیں بولتا تھا بولنے کے لئے کچھ ہوتا بھی نہیں تھا۔ پھر اس سناٹے میں وقتاً فوقتاً فرحانہ کی کراہیں ابھرنے لگتیں۔ زچگی کا وقت قریب آگیا تھا۔ شاہد کا ارادہ تھا کہ اسے کسی بڑے میٹرنٹی ہوم میں پہنچایا جائے۔ مگر فرحانہ کے والدین اس مسئلے کو گھر ہی میں نمٹانا چاہتے تھے۔

ساری دولت اسی لئے تو ہوتی ہے کہ گھر کی چاردیواری میں ہی سارے مسائل حل ہوجایا کریں۔ انہوں نے ایک نرس اور ایک بہت بڑی لیڈی ڈاکٹر کو انگیج کرلیا تھا۔ جو آدھی رات کو بھی خدمت کے لئے پہنچ سکتی تھی۔

آدھی رات کے بعد وہ تکلیف کی شدت سے بے چین ہونے لگی۔ جیسے جیسے وقت گزرنے لگا ویسے ہی ویسے درد بڑھنے لگا۔ نرس اور ایک لیڈی ڈاکٹر پہنچ گئی تھیں لیکن وہ اس کے درد میں کمی نہیں کرسکتی تھیں۔ جب عورت تخلیق کے کرب سے گذرتی ہے تو وہ درد کے کیسے جہنم سے گزرتی ہے' فرحانہ کو پہلی بار اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ وہ شرم وحیا سے چیخنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کی کراہیں آپ ہی آپ چیخوں میں بدل جاتیں۔ لیڈی ڈاکٹر اسے سمجھا رہی تھی کہ وہ ضبط سے کام لے۔ مگر جسے زخم لگتے رہتے ہیں وہی سمجھتی ہے کہ ضبط کا حوصلہ نہیں رہتا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے بدن کو کاٹ رہا ہو۔ آرے سے چیر رہا ہو۔ کئی بار وہ تڑپ تڑپ کر نرس کی گرفت سے نکل گئی۔

ایک بار درد اس انتہا کو پہنچا کہ وہ آپے سے باہر ہوگئی۔ نرس بھی اسے سنبھال نہ سکی اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر بیڈ سے نیچے گر پڑی۔ گرتے ہی سرہانے کی ماربل والی مضبوط میز سے اس کا سر ٹکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ گئے۔ ایک تو پہلے ہی وہ درد کے عذاب میں مبتلا تھی دوسرے سر اتنی زور سے ٹکرایا تھا کہ وہ ہوش سے بے گانی ہوگئی۔ ڈوبتی ہوئی سماعت میں ایک نوزائیدہ بچے کی چیخ سنائی دی۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی تھی اور یہ دنیا وقتی طور پر اس کے لئے مر گئی تھی۔

بے ہوشی کے دوران وہ اندھیرے میں بھٹک رہی تھی۔ رات کی سی گہری تاریکی میں کار کی ہیڈ لائٹس گزرتے ہوئے راستے کو روشن کررہی تھیں۔ ہوائیں چیختی ہوئی' اسٹیرنگ کی پاس والی کھڑکی سے گذر رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں بھی قیامت کا شور مچا ہوا تھا۔ اس کے ڈیڈی شاہد کے دوست سے کہہ رہے تھے۔

"وہ دو ٹکے کا گٹار بجانے والا میرا داماد نہیں بن سکتا۔ وہ میری بیٹی سے نہیں میری دولت سے محبت کرتا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ یہ شہر چھوڑ کر چلا جائے۔ ورنہ میں اس کا جینا دوبھر کردوں گا۔ اپنے اثر ورسوخ کے ذریعے اسے حوالات میں بند کرادوں گا۔"

اس کے ڈیڈی کی آواز اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ انجانی سی آندھیوں کے شور سے اسے شاہد کی پکار سنائی دے رہی تھی۔

"فرحانہ۔ تم کہاں ہو؟ یہ دنیا تمہیں مجھ سے چھڑا رہی ہے میں ہاتھ بڑھا رہا ہوں میرا ہاتھ تھام لو فرحانہ............"

گرد کے طوفان میں اسے بھولے ہوئے شاہد کا چہرہ نظر آرہا تھا جسے بھول چکی تھی' اب اس کی صورت واضح ہوگئی تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"آؤ فرحانہ میرا ہاتھ تھام لو ورنہ ہم بچھڑ جائیں گے۔"

اور وہ بچھڑ رہا تھا۔ اندھی ہوائیں اسے دور اڑائے جارہی تھیں۔ فرحانہ چیخنے لگی۔ "نہیں تم مجھ سے دور نہیں جاسکتے۔ میں آرہی ہوں شاہد۔" یہ کہتے ہی اس نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھوں سے بہک گیا۔ کار اپنے راستے سے بہک کر کہیں ٹکرائی۔ ایک دھماکہ سا ہوا پھر اس نے چیخ کر آنکھیں کھول دیں۔

لیڈی ڈاکٹر اور نرس نے اسے دونوں طرف سے پکڑ کر جبراً لٹاتے ہوئے کہا کہ وہ گھبرائے نہیں آرام سے لیٹی رہے اب وہ بہت بڑی مصیبت سے گذر چکی ہے۔ اس وقت فرحانہ کی سمجھ میں یہی آیا کہ اس نے کار کے حادثے کا جو خواب دیکھا ہے وہ اس حادثے کی مصیبت سے نکل گئی ہے۔

اس نے اطمینان سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ سوچنا چاہتی تھی کہ جو کچھ بھی اس نے دیکھا وہ خواب تھا یا حقیقت تھی؟ اگر خواب تھا تو وہ کس مصیبت سے نکل گئی ہے؟ اور یہ نرس اور لیڈی ڈاکٹر اس کے پاس کیوں موجود ہیں اسے کیا ہوگیا ہے؟

وہ کچھ سمجھ نہ سکی بہت سے سوالات اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور اس کے تھکے ہوئے ذہن کو تھپک تھپک کر سلا رہے تھے۔ اس بار وہ گہری نیند سو گئی۔ دوسری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو بالکونی کے باہر دن کی روشنی نظر آرہی تھی۔ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے لیڈی ڈاکٹر اور نرس کو دیکھا تھا تب اسے اپنے سر میں تکلیف کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھا تو وہاں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان پٹیوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی۔ پچھلی رات وہ ممی اور ڈیڈی سے ناراض ہو کر گھر سے چلی گئی تھی کیوں کہ اس

کے ڈیڈی کی وجہ سے شاہد یہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسی لئے وہ بھی تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کرتی جارہی تھی تاکہ کسی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے۔ شاہد کے بغیر یہ دنیا کس کام کی تھی؟

مگر افسوس وہ شاہد کے بغیر پھر اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے بچ گئی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جہاں سے بھاگ کر گئی تھی۔ نہ جانے وہاں پھر کیسے واپس آگئی۔ وہاں اسی وقت اس نے کوٹھی کے کسی حصے میں نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سنی۔

"یہ کس کا بچہ رو رہا ہے؟" وہ حیرانی سے سوچنے لگی۔ "اس کوٹھی میں تو کوئی چھوٹا سا بچہ نہیں ہے۔ شاید کہیں سے مہمان آئے ہوں۔ انہی کا بچہ ہوگا۔"

وہ سوچ رہی تھی کہ اتنے میں اس کی ممی ایک نوزائیدہ بچے کو گود میں لئے اس کے کمرے میں آئیں۔ بیٹی کو جاگتے دیکھ کر کہا۔

"اللہ کا شکر ہے تمہاری نیند تو پوری ہوئی۔ لو اب اسے سنبھالو۔"

ممی آگے بڑھ کر بچے کو اس کے پاس لٹانے لگیں۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟ کس کا بچہ ہے؟ آپ اسے میرے پاس کیوں لٹا رہی ہیں؟"

اس کی ماں نے حیرانی سے کہا۔

"اے بیٹی کیا بالکل ہی پاگل ہوگئی ہو۔ ایک حادثے میں تو تم نے ہم سب کو بھلا دیا ہے۔ دوسری بار سر پر چوٹ لگی ہے تو کیا اپنے بچے کو بھی بھلا دوگی۔"

"میرا بچہ؟" وہ حیرت سے چیختی ہوئی اٹھ کر بیٹھنے لگی۔ بیٹھنے کے دوران درد کی ٹیس اٹھی۔ وہ سر کی چوٹ کی تکلیف نہیں تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ........ کہیں اور سے بھی زخمی ہے۔ وہ دوہری ہو کر پھر لیٹ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور کتنے ہی سوالات چکرا رہے تھے کہ یہ سب کیا ہے؟

"نہیں کوئی اور بات ہوگی۔" وہ جھنجلا کر سوچنے لگی۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہے بھلا میں ماں کیسے بن سکتی ہوں؟ میری شادی کب ہوئی ہے؟"

اس نے ذرا دیر بعد سر اٹھا کر ماں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں پاگل ہوگئی ہوں یا آپ پاگل ہوگئی ہیں؟ آپ اسے میرا بچہ کہہ رہی ہیں۔ کب ہوئی تھی میری شادی؟"

"اے بیٹی تم تو ہم سب کو پاگل بنا کر رکھ دو گی۔ اب تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے کہیں اس معصوم کو نہ اٹھا کر پھینک دینا۔" یہ کہہ کر انہوں نے بچے کو اس کے پاس سے اٹھا لیا۔ پھر اسے سینے سے لگا کر بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ فرحانہ بستر پر لیٹی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میلوں دور سے دوڑتی چلی آ رہی ہو۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کی زندگی تقریباً ڈیڑھ سال سے یادداشت کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی ہوئی آئی ہے۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے کہاں تھی' وہ نہیں جانتی تھی۔ ہاں یہ جان گئی تھی کہ بچپن سے جوانی تک کیسے وقت گزارا؟ جوانی میں شاہد سے کیسے ملاقات ہوئی؟ کیسے ان کی محبت پروان چڑھی؟ کیسے اس کے ڈیڈی دیوار بن گئے؟ شاہد اس سے بچھڑ گیا اور وہ کار کے حادثے میں زخمی ہو کر اس وقت اپنے بیڈ پر پڑی ہے۔

اس عمر کے درمیانی ڈیڑھ سال کا اس کے پاس کوئی حساب نہ تھا۔ اس کا کوئی شوہر نہ تھا۔ کوئی بچہ نہیں تھا۔ صرف ایک بچھڑے محبوب کی یادیں تھیں اور وہ یادیں اب آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے برس رہی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کوٹھی کے اندر ہلچل سی مچ گئی کہ فرحانہ اب اپنی ممتا سے انکار کر رہی ہے جس بچے کو جنم دیا ہے اسے بھی نہیں پہچان رہی ہے۔ اس کے کمرے میں یکے بعد دیگرے سب ہی آنے جانے لگے۔ اس کی ممی تو سمجھا چکی تھیں۔ ڈیڈی نے بھی سمجھایا۔ لیڈی ڈاکٹر نے بھی آ کر یقین دلایا کہ وہ ماں بن چکی ہے اور وہ بچہ اسی کا ہے۔ فرحانہ اندر ہی اندر قائل ہو چکی تھی کہ وہ کسی طرح ماں بن گئی ہے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھی اس کی شادی ہو چکی ہے۔ آخر اس نے کس بے ہوشی کے عالم میں کسی مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گذاری تھی؟

اس کے ماں باپ اپنے کمرے میں آ کر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ فرحانہ نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کوئی اس کے کمرے میں نہ آئے اور اسے الٹی سیدھی باتیں سمجھانے کی کوشش نہ کرے۔ ممتاز احمد نے اپنی بیگم سے کہا۔

"فرحانہ کا یہ رویہ بتا رہا ہے کہ اس کی یادداشت واپس آ گئی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ پچھلے ڈیڑھ سال کی زندگی بھول گئی ہے۔ جس شاہد کو وہ بھول چکی تھی وہ اسے یاد آ گیا ہے اور جس شاہد سے اس نے شادی کرائی تھی وہ اس کے دماغ سے

غائب ہو گیا ہے۔"

اس کی ممی نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"میں تو اب پاگل ہونے والی ہوں۔ اس شادی کا کیا ہوگا جو ہم کرا چکے ہیں۔ یہ لڑکی مرتی مرجائے گی مگر اس کمبخت شاہد کو اپنا شوہر تسلیم نہیں کرے گی۔"

"ذرا ہوش میں رہ کر باتیں کرو بیگم۔ تم اپنے داماد کو کمبخت کہہ رہی ہو۔"

"چولہے میں گیا ایسا داماد۔ میں پہلے ہی کہتی تھی کہ اس طرح شادی نہ کرائی جائے۔ کوئی نہ کوئی مصیبت سامنے آئے گی اور مصیبت آ گئی۔ ہمارا کیا ہے ہم آج ہیں کل اس دنیا سے اٹھ جائیں گے مگر بیٹی کو مصیبت میں پھنسا کر جائیں گے۔ یہ سب کچھ آپ نے کیا ہے۔"

ممتاز احمد نے ایک مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ ان سے اتنی بڑی غلطی ہوئی تھی کہ اس کی سزا ان کی بیٹی کو ساری زندگی ملنے والی تھی۔ وہ سر پکڑ کر سوچتے ہی رہ گئے۔

فرحانہ اپنے کمرے میں حواس باختہ سی پڑی ہوئی تھی اور یہ سوچ سوچ کر پاگل سی ہوئی جا رہی تھی کہ آخر وہ ماں کیسے بنی؟ ابھی تو اس کے کھیلنے کے دن تھے۔ اپنے شاہد کے ساتھ خوابوں کی جیتی جاگتی دنیا بسانے کے دن تھے۔ اب زندگی کے کسی موڑ پر شاہد مل گیا تو وہ کیا منہ لے کر اس کے سامنے جائے گی۔

یہ سوچتے ہی وہ پھر رونے لگی۔ اسی وقت اس کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا وہ چیخ کر بولی۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ میرے کمرے میں کوئی نہ............"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ جس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اچانک ہی سامنے آ گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"شا...... شاہد...... تم؟" اس کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی۔ پھر وہ منہ چھپا کر رونے لگی کیوں کہ وہ اپنے محبوب کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ آنے والے کے قدموں کی آہٹ قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر وہ قریب آ کر بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر بولا۔

"فرحانہ میں نے سنا کہ تمہاری یادداشت واپس آ گئی ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے پھر کیوں رو رہی ہو؟ میرے پیار کی نشانی کو گود میں لینے سے انکار کیوں کر رہی

ہو؟"

فرحانہ نے چونک کر سراٹھایا اور حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں میری جان میں تمہارا جیون ساتھی ہوں اور وہ بچہ ہمارا ہے۔"

فرحانہ کے چہرے پر بیک وقت کتنے ہی جذبے جھلکنے لگے۔ محبوب کو جیون ساتھی کے روپ میں دیکھ کر چہرہ کھل گیا تھا لیکن آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں سوالی سوالی تھیں۔

زندگی تو سوالوں کا مجموعہ ہے۔ ڈھونڈنے والوں کو ہی جوابات ملتے رہتے ہیں۔

☆======☆======☆

گڑیا بیٹی

اونچے محل میں رہنے والی ایک کائیاں بیگم کا قصہ۔
وہ سوکن سے ڈرتی تھی اور سوکن کا راستہ روکنے کے لئے
اسے اپنے میاں کے لئے ایک ایسی داشتہ کی ضرورت تھی
جو کسی بھی وقت فاضل پرزے کی طرح بدلی جا سکے۔

بات صرف احساسات کی ہوتی ہے انسان اپنے حالات کے تحت جیسا بھی محسوس کرے۔ ایک خوبصورت عمارت کو دیکھ کر خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے لیکن زرینہ نے اس خوبصورت کوٹھی کو دیکھا تو ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ وسیع و عریض کوٹھی ابھی اس پر چڑھ بیٹھے گی اور وہ بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتی رہ جائے گی۔

دربان نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”بیٹی! کون ہو تم؟“

”جرینہ۔ میرے کو جرینہ بولتے ہیں۔ میں نگینہ سے ملنے آئی ہوں۔“

”اچھا اچھا نگینہ سے ملنے آئی ہو۔“ دربان نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس راستے سیدھی کوٹھی کے پیچھے چلی جاؤ۔ وہاں سرونٹ کوارٹر میں نگینہ رہتی ہے۔“

وہ مرعوب سی ہو کر کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہو گئی۔ پھر دربان کی بتائی ہوئی روش پر چلنے لگی۔ روش کے اطراف رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ پھول آئینہ تھے' وہاں کے مکینوں کی زندگی کا حسن پیش کر رہے تھے اور مہنگی مسرتوں کی خوشبو لٹا رہے تھے۔

جب وہ کوٹھی کے بائیں طرف سے گزرنے لگی تو خوشبو کا مزاج بدل گیا۔ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے شراب کی بھنکتی ہوئی بُو آئی۔ پھر ساری خوشبوؤں کو فاتحانہ انداز میں تسخیر کرتی ہوئی گزر گئی۔ وہ ٹھٹک کر سننے لگی۔ کن انکھیوں سے کھلی ہوئی کھڑکی کو دیکھنے لگی۔

پہلے شیشے کے نازک ۔سے جام ٹکرانے کی نازک سی آواز آئی۔ پھر چند لمحوں کا سناٹا ہوا۔ اس کے بعد وقت کی انگلیوں نے شاید کسی حسینہ کو گدگدایا تھا۔ ایک سریلی سی ہنسی ابھری مگر وہ بہت ہی مختصر سی ہنسی تھی کیونکہ ایک بھاری بھرکم قہقہے نے اسے

دبوچ لیا تھا۔

زرینہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کوٹھیوں کے ڈیزائن باہر سے مختلف ہوتے ہیں۔ اندر سے ساری کوٹھیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ کوٹھی کے بائیں باغ میں تین عدد سرونٹ کوارٹر تھے۔ دو کے دروازے پر تالے نظر آرہے تھے اس نے تیسرے دروازے کے پاس پہنچ کر دستک دی۔

”ابھی آئی۔“ اندر سے آنے والی آواز کو زرینہ نے پہچان لیا' حالانکہ ایک مدت کے بعد وہ ملنے آئی تھی۔ اس کے باوجود اس نے نگینہ کی آواز پہچان لی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ زرینہ پہلی نظر میں اسے پہچان نہ سکی۔ بس دیکھتی ہی رہ گئی۔

اس وقت نگینہ چوڑی دار پاجامے' شیفون کے سفید دوپٹے اور لیڈی ہملٹن کے چھاپ دار جمپر میں بالکل اجنبی سی لگ رہی تھی۔ ساڑھی پہننے والی نگینہ کو آج اس نے پہلی بار.......... چست لباس میں دیکھا تھا۔ جسم تھا کہ گندھا ہوا میدہ؟ کپڑوں کی تراش میں ڈھل کر جگہ جگہ سے بنتا سنورتا چلا گیا تھا۔ زرینہ نے پٹ پٹ پلکیں جھپکا کر دیکھا۔ لباس کی رنگینی اور زیورات کی چمک دمک میں وہ پوری طرح نظر نہیں آرہی تھی۔ ٹکڑے ٹکڑے نظر بھر کر دیکھو تو پوری نگینہ بنتی تھی۔

نگینہ بھی خلافِ توقع اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ پھر دونوں سہیلیوں نے دوڑ کر ایک دوسرے کو گلے لگا لیا اور پھر دونوں کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

”ہائے تُو تو سچی کی نگینہ بن گئی ہے۔“ زرینہ نے آنسوؤں میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”چل ہٹ مجھے بناتی ہے۔“ نگینہ نے اترا کر کہا۔ ”یہ بتا آج میری یاد کیسے آگئی؟“

”بس آگئی۔ تیرے جیسی بے مروت نہیں ہوں۔ سات برس ہو گئے پر تُو کبھی نہ آئی میرے کو دیکھنے..........“

”ہائے اللہ سات برس ہو گئے!“ نگینہ حیران رہ گئی۔ اچھی کھاتی پیتی زندگی ہو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اتنے سارے دن کب اور کیسے پنکھ لگا کر اڑ گئے البتہ زرینہ کے لئے

دن بھاری تھے۔ زندگی کا ایک ایک دن اسے خیرات کی طرح ملتا تھا۔ اس لئے اس نے یاد رکھا تھا کہ سہیلی کو دیکھے ہوئے سات سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔

نگینہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی تک لائی اور اس پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو بیٹھ میں بیگم صاحبہ سے چھٹی لے کر ابھی آئی۔"

زرینہ نے اسے روک لیا۔

"نہیں ری، چھٹی مت لے، میں ابھی دوسری گاڑی سے چلی جاؤں گی۔"

"واہ! کیا آنا ہے اور کیا جانا ہے۔" وہ روٹھ گئی۔ "صاف کیوں نہیں کہتی کہ اماں جان کے بولنے سے آئی ہے۔ نہیں تو سہیلی کیوں یاد آتی۔"

"ہاں تیری ماں نے بھیجا تو ہے۔ پر قسم لے لے، میں تیری محبت سے آئی ہوں۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔" نگینہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ "میرے لئے آئی ہے تو میری مرضی سے جائے گی۔ بول ٹھیک ہے نا؟"

پھر جواب سننے سے پہلے ہی اس نے زرینہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

زرینہ پگھل گئی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اس کے سر پر چلا گیا اور اس کے بالوں کو سہلانے لگی۔ نگینہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہی پیاری سہیلی کی بے قرار انگلیاں جو اس کے سر کو سہلایا کرتی تھیں، وہی ممتا بھری گداز چھاتیاں، جن سے لگ کر وہ آنکھیں بند کرلیتی تھی۔ وہی پسینے کی جانی پہچانی بو جسے محسوس کرتے کرتے وہ سوجایا کرتی تھی آج کتنے عرصہ بعد بچھڑے ہوئے لمحات سمٹ کر زرینہ کی گود میں آگئے تھے۔

نگینہ گھبرا کر الگ ہوگئی۔ پرانے رشتوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے جکڑ لیا تھا۔

"نہ بابا! تیرے پاس بیٹھو تو ملنے کو جی نہیں چاہتا۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔
"یہاں صابن پانی سب کچھ ہے۔ تو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لے۔ وہ ٹرنک کھلا ہے جو ساڑھی پسند آئے نکال کر پہن لینا۔ میں بس آتی ہوں۔" اس نے جمپر کو اِدھر اُدھر سے درست کیا اور ڈھلکے ہوئے آنچل کو شانوں پر سے پشت کی طرف لہرادیا۔ دوپٹے کا آنچل ایک لمحے کے لئے سفید پنکھ کی طرح کھلا اور وہ کسی آبی پرندے کی طرح خم کھاتی ہوئی گزر گئی۔

یکایک زرینہ کو محسوس ہوا جیسے نگینہ کے جاتے ہی نظارہ بدل گیا ہے۔ چاروں طرف کی دیواریں ننگی ہوگئی ہیں۔ اس کے پاؤں کے نیچے کا پختہ فرش ادھڑا ہوا ہے۔ سامنے ٹین کا ایک صندوق ہے بید کا موڑھا ہے۔ چھال کی چٹائی ہے، ایک بالٹی اور ایک ٹھلیا ہے اور اس کے اوپر چھوٹے سے طاقچے پر ایک ٹوٹا ہوا آئینہ ہے اور اس وقت وہ ایک سرونٹ روم میں بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف ایک ملازمہ کی اصلیت آنکھیں پھاڑے حیرت سے اسے تک رہی ہے اور تنہا۔ اسے احساس ہوا کہ اب تک وہ کپڑوں کی گٹھری اور کھنکتے ہوئے زیورات سے گلے مل رہی تھی۔ سہیلی اس کی کہیں بھی نہ تھی۔

زرینہ بھی اپنے شہر کی ایک عالیشان کوٹھی میں آیا کا کام کرتی تھی۔ اس کا بھی اپنا ایک ایسا ہی کمرہ تھا لیکن اس سے زیادہ بوسیدہ اور مرمت طلب تھا۔ وہ بھی بن سنور کر کوٹھی میں کام کرنے جاتی تھی لیکن اس طرح نگینہ جیسی مہارانی بن کر نہیں۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی جیسے کوئی پسِ پردہ جھانکنے کے لئے مچلتا ہے۔

وہ چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سامنے رکھے ہوئے صندوق کی طرف کوئی اسے دھکیل رہا تھا۔ نگینہ کے جسم پر اتنے اچھے کپڑے اور زیورات ہیں تو صندوق کے اندر کیا کچھ نہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اصلی نگینہ کو کھود کر نکال لے۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سورج ڈوبنے والا تھا، مگر شام کی ہوا اب بھی دوپہر کی گرمی سے جھلسی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے اور کھڑکیوں کو بند کرکے اپنی ساڑھی اتاری اور اسے کھاٹ پر پھینک دیا۔ بدن سے لپٹا ہوا پیٹی کوٹ اور کسی ہوئی چولی رہ گئی۔ ایسے میں آئینے کے مقابل اپنا آپ دیکھنے میں کتنا سارا وقت گزر جاتا ہے لیکن اب زرینہ کا من مزاج بدلتا جارہا تھا۔ وہ ان خوابوں سے آگے نکل چلی تھی جو آئینے کے طلسم میں نظر آتے ہیں۔

اس نے صندوق کے پاس آکر اسے کھولا۔ اندر سوتی اور ململ کی ساڑھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ نچلی تہہ کو دیکھنے کے لئے اس نے اوپر کی ایک ساڑھی اٹھائی تو اس کے ہاتھ اٹھے ہی رہ گئے۔ سرخ رنگ کی ایک ریشمی ساڑھی پر کپڑے کی بنی ہوئی ایک گڑیا لیٹی ہوئی تھی۔ ناک میں چھوٹی سی نتھ، کانوں میں موتی کے بُندے اور گلے میں سفید موتیوں کی مالا پہنے، وہ ایک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ زرینہ کو محسوس ہوا جیسے وہ

ننھی ننھی باہیں پھیلا کر اس کی طرف لپکے گی۔ اس کا دل سینے کی دیوار سے سر پھوڑنے لگا۔ پھر نہ جانے اس کی آنکھوں میں کب کے ٹھہرے ہوئے آنسو آ گئے۔

یہ گڑیا رشتہ میں اس کی بہو لگتی تھی اور اس بہو کے رشتہ سے نگینہ اس کی سمدھن بن گئی تھی۔ یہ ان کے بچپن کا آخری کھیل تھا گھر والوں کے طعنے سن سن کر انہیں احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ گڑیا بیاہنے کی عمر سے آگے نکل چکی ہیں۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ زرینہ آخری بار ڈھولک کی تھاپ پر اپنے گڈے کے لئے سہاگ کے گیت گائے اور نگینہ اپنی گڑیا کے لئے بابل گائے گی لیکن یہ ارمان بھی پورے نہ ہو سکے۔ ایک ہفتہ بعد گڑیا کا بیاہ ہونے والا تھا کہ دونوں سہیلیاں بچھڑ گئیں۔

تھوڑی دیر تک وہ صندوق میں رکھی ہوئی گڑیا کو بڑی حسرت سے دیکھتی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اسے آہستگی سے اٹھایا جیسے ماں اپنی محبت کے پالنے سے اسے اٹھاتی ہے۔ پھر اسے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔

☆======☆======☆

چاند پچھلی کھڑکی سے ان کے چہروں کو تک رہا تھا۔

وہ کھاٹ پر ایک دوسرے کے سامنے لیٹی ہوئی تھیں۔ نگینہ کا ہاتھ زرینہ کی کمر میں تھا اور زرینہ کا ہاتھ نگینہ کے شانے پر، اور ان کے درمیان، سانس لیتی ہوئی چھاتیوں کے بیچ کپڑے کی بے جان گڑیا رکھی ہوئی تھی۔ زرینہ نے بڑی آہستگی سے گڑیا سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"نگی! یہ گڑیا اگر زندہ ہو جائے تو جانتی ہے کیا کرے گی؟"

"یہ سب سے پہلے روئے گی۔ پھر میری چھاتی پر گھڑی گھڑی ہاتھ مارے گی۔"

کہتے کہتے جیسے اس کی آواز ختم ہو گئی۔ اس نے گہری طمانیت سے آنکھیں بند کر لیں، جیسے صدیوں سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس کی چھاتیوں سے رسنے لگا ہو۔

نگینہ کی سمجھ میں کچھ آیا اور کچھ نہیں آیا لیکن زرینہ کی زبان سے نکلی ہوئی زخمی صدا اس کے سینے میں پہنچ کر تڑپنے لگی۔ ایسی بھی کیا اجاڑ حسرت، بن بیاہی عورت نہ گڑیا کھیلتی اچھی لگتی ہے نہ بچے کھلاتی اس نے بڑی آہستگی سے اسے کریدتے ہوئے کہا۔

"سچ مچ ایک مدت ہو گئی۔ اگر تیری شادی ہوتی تو دو چار بچوں کی ماں بن

جاتی۔"

زرینہ نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ جیسے آہ نکلنے کی راہ پاٹ رہی ہو۔ نگینہ لاکھ اپنی سہی لیکن وہ کیسے بتائے کہ اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی ایک چھوٹی سی بات کہنے کے لئے بھی حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور جب حوصلہ ہوتا ہے تو الفاظ نہیں ملتے اور جب الفاظ ملتے ہیں تو حجاب آڑے آ جاتا ہے ورنہ دل کی بات سنانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ دونوں سہیلیاں تو پیٹ کی ہلکی تھیں کوئی بات ہو، ایک دوسرے سے کہے بنا رہا نہیں جاتا تھا۔ پھر ایسے میں جبکہ وہ پہاڑ سی جدائی کے بعد ملی تھیں تو زبان میں یوں بھی کھجلی ہو رہی تھی۔ زرینہ کے من میں تو بس یہی تھا کہ نگی پہل کرے ذرا ہاتھ بڑھائے، ذرا ماچس کی تیلی دکھائے اور پھر دیکھے کہ اس کے اندر کتنی بارود بھری ہے۔

"تیرے بھی تو بچہ ہو جاتا۔" زرینہ نے جواباً کہا۔ "اگر تو شادی کر لیتی۔"

"میں نے تیری شادی کی بات کہی تو نے میری کہہ دی۔ بات پلٹانا تجھے خوب آتا ہے۔"

"میری بات چھوڑ، میں شادی نہیں کروں گی۔"

"بھلا کیوں؟" نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جب شادی ہونے کو تھی، تب نہ ہوئی۔" زرینہ نے کہا۔ "ہماری بی بی جی نے اپنے خانساماں سے بات لگائی تھی۔ وہ حرامی ہاں تو بولا پر رات کو کوٹھی چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"بھاگ گیا؟"

"ہاں۔ وہ جانتا تھا میں خراب ہو گئی ہوں۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ جب تو یہاں نہیں آئی تھی اور جب ہم نے آخری دفعہ گڑیا کا بیاہ رچانا چاہا تھا۔"

"تو نے اس وقت بتایا نہیں؟"

"ہمت نہیں ہوئی۔ تو اس وقت بہت بھولی تھی اور میرا بھول پن چلا گیا تھا۔ تو میرے کو برا سمجھتی، اس لئے نہیں بولی۔"

نگینہ کو دھچکا سا لگا کہ اب زرینہ اسے معصوم نہیں سمجھتی ہے اسی لئے اتنی بے باکی سے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہی ہے۔

"پھر بی بی جی نے اِدھر اُدھر رشتہ کرنا چاہا۔" زرینہ کہنے لگی۔ "مگر کسی نے میرے کو پسند نہیں کیا۔ ایک بوڑھی عورت تو صاف کہہ گئی کہ میں دو بچوں کی ماں لگتی ہوں۔"

"ایسا بھی کیا الزام لگانا۔ یہ بوڑھیاں بس کیڑے نکالنا جانتی ہیں۔"

زرینہ نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ آنکھوں کو اس طرح موند لیا جیسے اپنے آپ کو چھپا رہی ہو۔

تب نگینہ کو محسوس ہوا کہ اس کے من میں چور ہے۔ جبھی تو گڑیا کے ننھے ہاتھوں کو اپنی چھاتیوں پر ٹٹولتی ہے۔ وہ آہستہ سے کھسک کر اس کے قریب آئی اور بڑی رازداری سے پوچھا۔

"بچہ کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں، شاید مر گیا۔ زچگی میں میرے کو ہوش نہیں تھا۔"

"کس کا تھا۔ خانساماں کا؟"

"نہیں، میاں جی کا۔"

"میاں جی؟"

"ہاں۔ ہم اپنے صاحب کو میاں جی بولتے ہیں۔"

نگینہ نے ٹھنڈی سانس لی اور بائیں پہلو سے سیدھی ہو کر چت لیٹ گئی۔ سامنے بھی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جہاں سے وسیع وعریض کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ سرونٹ روم کے چھجے سے جھولتی ہوئی کدو کی بیل مکڑی کے جالے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اِدھر سے دیکھو تو کوٹھی جالے میں الجھی ہوئی نظر آتی تھی۔ اُدھر سے دیکھو تو نگینہ مکھی بن جاتی تھی۔

"تیری بی بی جی اپنے میاں سے کچھ نہیں کہتی؟" نگینہ نے پوچھا۔

"وہ تو اپنے میاں کو ایسا سمجھتی ہی نہیں۔ میرے خیال میں انجان بنتی ہے۔ کہتی ہے کہ میں خانساماں یا نہیں تو کوٹھی کے ڈرائیور سے پھنسی ہوئی ہوں۔ وہ جیسے کوٹھی کا کچرا باہر پھینکتی ہے نا ویسے ہی میرے کو باہر والے کے سر تھوپتی ہے۔"

"تو اس کمینے کے پاس جاتی کیوں ہے؟"

زرینہ نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

"پہلے تو میں اپنے سے نہیں گئی۔ دو ایک بار اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں جھٹک کر بھاگ گئی۔ اب تیرے سے کیا چھپانا نگی، میں بھی اندر سے پک رہی تھی۔ ایسے میں لاکھ سنبھلو سنبھلا نہیں جاتا۔"

"ہاں سنبھلا نہیں جاتا۔" نگینہ خوابوں میں کھو گئی۔ "کوئی ہاتھ پکڑتا ہے تو ہم جھٹک دیتے ہیں لیکن اندر ہی اندر پچھتاتے ہیں، اوپر سے جسم کچھ نہیں کہتا، اندر سے آواز دیتا ہے اور ہم ایک مستی بھرے مور کی طرح دنیا کی نظروں سے چھپ کر دھیان کے جنگل میں تھرکتے رہتے ہیں۔"

"میں اپنے سے کبھی نہیں گئی۔" زرینہ نے کہا۔ "ایک رات میاں جی آپ ہی میرے کمرے میں آ گئے۔ وہ مالک میں خادمہ، بھلا کیا کہتی۔ بی بی جی سات مہینے کا پیٹ لیے اپنے کمرے میں پڑی ہوئی تھیں۔"

زرینہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر سہیلی کو دیکھ کر پوچھا۔

"تو.......... تو میرے کو برا سمجھتی ہوگی؟"

"نہیں ری۔" نگینہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ایسا کیوں کہتی ہے۔ دنیا تیرے کو برا سمجھے، پر میں نہیں سمجھتی۔"

"بی بی جی میرے کو ایسا ہی سمجھتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتی ہے۔ کبھی کبھی مارتی بھی ہے جیسے میں کوئی سچی کی سوکن لگتی ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے نگی! کہ وہ سب کچھ جانتی ہے اور جان بوجھ کر انجان بنتی ہے۔ اصل میں وہ چاہتی ہے کہ میں چور بن کے میاں جی سے ملوں اور کبھی آنکھ سے آنکھ ملا کر برابری نہ جتاؤں۔ میرے کو کیا پڑی ہے وہ خود ہی میرے پاؤں پڑنے آتا ہے۔ میں اگر کام چھوڑ کر جاؤں تو بی بی جی جانے نہیں دیتی۔ کبھی تنخواہ بڑھا کر اور کبھی بہلا پھسلا کر روک لیتی ہے۔ اب میں کروں تو کیا کروں؟" وہ خاموش ہوگئی۔

"ٹھیک تو ہے۔" نگینہ نے سوچا۔ "اتنی شاندار کوٹھی اور اتنی بڑی جائیداد کو چور نہیں چرا سکتا البتہ کوئی سوکن ہی لوٹ سکتی ہے۔ اس لئے سوکن کا راستہ کاٹنے کے لئے ایک ایسی داشتہ کی ضرورت ہے جو کسی بھی وقت فاضل پرزے کی طرح بدل جاسکے۔"

زرینہ نے ایک آہ بھری۔ سرد ہوا کے جھونکے کھڑکی سے گزرتے ہوئے اسے

اور اس کی آہوں میں گھل گئے۔ اس نے درمیان میں رکھی ہوئی گڑیا بیٹی پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے آنکھوں کو موند لیا۔

"تیری بی بی جی کے بچے کتنے ہیں؟" نگینہ نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کتنے ہوئے اور مر کھپ گئے۔ اب تو جی بچ کے پانچ ہیں۔ میاں جی تو بالکل مولوی ہے۔ بچے روکنے کو برا سمجھتا ہے۔ نہیں تو بی بی جی کی حالت ایسی نہ ہوتی۔"

"ہمارے صاحب مولوی تو نہیں ہیں مگر بیگم صاحب آپریشن سے گھبراتی ہیں۔" نگینہ نے کہا۔ "بیمار ہونے سے دوا کھاکے اچھی ہو جاتی ہیں پر انجکشن کی سوئی نہیں لیتی۔ صاحب بھی آپریشن پر زور نہیں دیتے۔ وہ تو خود بیگم صاحب کے اشارے پر چلتے ہیں جو کماتے ہیں' اس کی پائی پائی کا حساب دیتے ہیں۔"

"تب تو زیادہ نہیں کماتا ہوگا پیسے والے لوگ اپنی عورتوں سے نہیں ڈرتے۔"

"اری کیا کہتی ہے میرے صاحب بہت پیسے والے ہیں روز اتنا روپیہ لاتے اور لے جاتے ہیں کہ میرے کو اگر گننے دو تو گنتے گنتے بھول جاؤں۔"

"اچھا!" زرینہ نے حیرت سے کہا۔

"ہاں!" اور باہر ان کا بہت نام ہے۔ ایک دفعہ بہت سارے لوگ کوٹھی کے پاس آئے تھے اور چلا چلا کر صاحب کو زندہ باد کہہ رہے تھے۔"

"ہوں۔" زرینہ کہا۔ "جبھی تُو اتنی شان سے رہتی ہے۔ تیرا ٹھاٹ باٹ دیکھ کے تو پہلے میں یہی سمجھی تھی کہ تُو یہاں کی مالکن بن گئی ہے۔"

نگینہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر آہستہ سے کہا۔

"ہاں' مالکن ہی سمجھ لے۔ جب تک مالکن کے کہنے پر چلوں گی مالکن کی جیسی رہوں گی۔ تُو نے مجھے اپنا جان کے سب بات کہہ دی تو میں تجھ سے کیا چھپاؤں۔ بس یہ سمجھ لے کہ میں نام کی نوکرانی ہوں۔ کبھی کبھی اوپری کام کر دیتی ہوں۔ میرے جیسی ایک اور لڑکی ہے۔ بڑی بھولی اور ملنسار ہے۔ آج تو آ گئی ہے نا' اس لئے وہ میرے بدلے صاحب کے پاس گئی ہے۔"

زرینہ حیران نہیں ہوئی' وہ تو پہلے ہی اندازہ کر چکی تھی کہ نگینہ کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ البتہ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ یہاں نگینہ جیسی دوسری بھی ایک لڑکی ہے۔

"ایک چھوڑ دو دو ہیں۔"

"ہاں' صاحب ذرا ڈرپوک ہیں نا۔ وہ باہر کسی پرائی عورت کے ساتھ نہیں رہتے اور نہ کسی کے ساتھ بیٹھ کے پیتے ہیں۔"

"بڑے آدمی ہو کر ڈرتے ہیں؟"

"ہاں۔ بیگم صاحب بتاتی ہیں کہ ہمارے علاقہ کے لوگ چھوٹے خیال کے آدمی ہیں' صاحب کو شراب پیتے یا کسی عورت کے ساتھ گھومتے دیکھ لیا تو پھر ووٹ نہیں دیں گے۔"

"ہم۔" زرینہ سوچنے لگی۔ اپنی اور سہیلی کی زندگی کا موازنہ کرنے لگی۔ کوئی خاص فرق تو نہیں تھا۔ بس نگینہ کے پاس ذرا چمک دمک زیادہ تھی۔

"تیرے کو تنخواہ کتنی ملتی ہے؟"

"ہر مہینہ تین سو روپے۔"

"تین سو روپے!" زرینہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ نگینہ اس کی حیرانی سے بہت محظوظ ہوئی۔ اس نے کوٹھی سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی اس لئے وہ تین سو روپے پر اترا رہی تھی ورنہ تین سو روپے کی کیا حقیقت ہے۔ محل سراؤں میں رہنے والی داشتائیں اپنے نام جاگیریں لکھوا لیتی تھیں لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ محل کی بیگم صاحب کو اپنی جاگیر کی حفاظت کا سلیقہ آ گیا تھا وہ کسی کو سوکن بنا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والی داشتہ بنا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ ہاں ایک نمک حلال ملازمہ بنا کر تین سو روپے ماہوار پر رکھ سکتی تھی لیکن نگینہ اتنی ہیرا پھیری نہیں جانتی تھی' اس لئے خوش تھی۔

"کھانا' کپڑا الگ سے ملتا ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "بیمار پڑو تو علاج مفت ہوتا ہے۔ ہر طرح کا آرام ہے۔ بس بیگم صاحب کے کہنے پر چلنا پڑتا ہے۔ ان کے ملنے والے آئیں تو ملازمہ بن کر رہنا ہوتا ہے۔ باہر جاؤ تو بچوں کی آیا بن کر جانا ہوتا ہے۔ کہیں بھی ہم اپنی اوقات نہیں بھولتے۔"

زرینہ اپنے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ نگینہ کیا کچھ کہہ گئی ہے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "تین سو روپے؟"

"کیوں کیا ہوا؟" نگینہ اس کی بڑبڑاہٹ کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

"نہیں۔ سوچتی ہوں' یہ تین سو روپے تُو کیا کرتی ہوگی۔ یہ میں جانتی ہوں کہ ماں کو پچاس روپے بھیجتی ہے۔ پھر بھی پچاس کم تین سو روپے بچ جاتے ہیں۔"

"میں بھی تو خرچ کرتی ہوں۔ میرے پاس بہت سے زیور ہوگئے ہیں۔ تُو جب جائے گی تو یہ جھمکے تیرے کو دے دوں گی' لے گی نا۔ میری نشانی سمجھ کر لے لینا۔"

زرینہ کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ وہ ایک ٹک نگینہ کو دیکھنے لگی۔ میرے اللہ یہ سونے کے جھمکے میرے کو دے دی گی۔ یہ کتنے پیسے والی ہے۔ کتنی بدل گئی ہے۔ نگی نہیں معلوم ہوتی۔ کوئی میرے سے اوپر والی عورت ہے اور میں ہوں کہ اس کے برابر لیٹی ہوئی ہوں۔ اب برابری کیسی۔ اس کے پاس دینے والا ہاتھ آگیا ہے اور میرے پاس وہی لینے والا پرانا ہاتھ رہ گیا ہے۔ ہائے میں کیسے اس کے پاس سے اٹھ کر نیچے فرش پر چلی جاؤں۔

"کیا سوچنے لگی؟" نگینہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"آں۔ وہ تُو برا مت ماننا نگی! یہ جھمکے لے کے میں کہاں رکھوں گی۔ میں اگر لے بھی گئی تو پھر تیرے پاس کیا رہے گا؟"

"میری فکر نہ کر۔" اس نے بڑی فیاضی سے کہا۔ "میرے پاس پہلے ہی اتنا زیور ہے کہ تُو دیکھے گی تو رات بھر سو نہ سکے گی۔ یہ سب چیزیں کوٹھی میں رکھتی ہوں۔ نہیں تو تجھ کو ابھی بتاتی۔ اری تُو زیور کی بات کرتی ہے آج ہی بیگم صاحب میرے بینک کا کھاتہ دیکھ کر بول رہی تھیں کہ میرے نو ہزار تین سو بیالیس روپے جمع ہیں۔"

"کیا؟" زرینہ چونک پڑی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر اسے حیرت سے تکنے لگی۔

"مذاق کر رہی ہے نا؟"

"تیری قسم مذاق نہیں ہے۔ سچ بول رہی ہوں۔"

"میرے اللہ! پھر یہاں رہ کے اب کیا کر رہی ہے تُو؟ اری اتنے روپے ہیں تو اپنے لئے الگ کوٹھی بنا سکتی ہے۔"

نگینہ اس کی نادانی پر ہنسنے لگی۔

"لیٹ جا زرینہ! تیرے لئے یہ روپیہ بہت ہے مگر کوٹھی بنانے کے لئے بہت کم ہے۔" اس نے زرینہ کا ہاتھ کھینچ کر اپنے پاس کرلیا۔

"کچھ بھی ہو۔" اس نے اُس کی طرف کروٹ بدل کر کہا۔ "کوٹھی نہ سہی کٹیا تو

بن سکتی ہے۔ شادی کر کے عزت آبرو سے تو رہ سکتی ہے۔ بس بہت ہوگیا تیرے پاس' زیادہ لالچ کرے گی تو پھر بڑھاپا آجائے گا پھر نہ شادی ہوگی نہ بچے۔"

"تُو پھر شادی پر آگئی؟"

"شادی کے لئے تو یہاں تک آئی ہوں' اور تُو ہے کہ شادی کے نام سے بھاگتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مرنے کے بعد یہ سارے زیور اور روپے اپنے ساتھ لے جائے گی۔"

نگینہ کو کہیں چوٹ سی لگی۔ دھیان کے جنگل میں ناچتے ہوئے مور کو کبھی کبھی اپنے پاؤں نظر آجاتے ہیں۔ آدمی بھی سارے کا سارا خوبصورت نہیں ہوتا۔ کہیں سے کوئی بدصورتی ہوتی ہے جسے وہ ریشمی کپڑوں اور چمکتے ہوئے زیورات میں چھپا کر رکھ دیتا ہے۔ نگینہ بھی کبھی کبھی دُکھتے ہوئے ذہن سے سوچتی تھی کہ یہ جو بیگم صاحب کے پاس دولت ہے وہ اس کے بچوں کے بچوں تک جائے گی۔ آدمی کا سب کچھ آئندہ نسل کے لئے ہوتا ہے اور اس کے پاس سب کچھ تو ہے مگر آنے والی دنیا کا کوئی ننھا سا خواب نہیں ہے۔

"نگی!" زرینہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تُو نہیں جانتی' جہاں تیری ماں نے رشتہ لگایا ہے وہ لوگ بھی بہت پیسے والے ہیں۔"

"پیسہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اماں جان کہتی تھیں کہ دو دو شادیاں کرچکا ہے اور اب اولاد کے لئے مجھ سے کرنا چاہتا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ لوگ اولاد کے لئے ہی شادی کرتے ہیں۔"

"اولاد کے لئے ہی کرنا ہے تو تُو ہی کر لے نا اس سے۔"

"پگلی۔" زرینہ نے کھسیانی مسکراہٹ سے کہا۔ "کوئی اندھا بھی میرے سے شادی کرے گا تو میری اصلیت جان لے گا مگر تُو ابھی کنواری لگتی ہے' اسی لئے بولتی ہوں کہ اپنی ماں کی بات مان لے۔" اس نے نگینہ کے رخسار کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "نگی! جب تُو شادی کرے گی تب تیرے کو معلوم ہوگا کہ یہ چوری چھپے کا کھیل کتنا برا ہے۔ جب تیرے بچہ ہوگا تب تیرے کو معلوم ہوگا کہ کتنی بڑی دولت تیرے پاس آئی ہے۔ اپنے گوشت کے ٹکڑے کو اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر کیا حالت ہوتی ہے' یہ تو ابھی نہیں سمجھے گی۔"

نگینہ تڑپ گئی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچ لیا۔ جیسے اپنے اندر کے پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے کو دبوچ رہی ہو۔ زرینہ اسے دیکھ نہ سکی۔ چاند کھڑکی سے ذرا سرک گیا تھا۔ اس لئے نگینہ کی طرف اندھیرا تھا اور اس کی طرف روشنی۔ اور روشنی سے اندھیرے کی طرف دیکھو تو کچھ نظر نہیں آتا۔

"زرینہ!" نگینہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں تیری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں مگر شادی نہیں کروں گی۔"

"آخر تو انکار کیوں کرتی ہے؟"

نگینہ جواب دینے کی بجائے اس کی طرف سے پلٹ گئی۔ کروٹ بدلنے کے بہانے دوسری طرف منہ پھیرلیا۔ پھر آہستہ سے لرزتی ہوئی آواز میں پکارا۔

"زرینہ!"

"ہاں۔"

"تو چاہے تو ایک دن کے لئے بھی سہاگن بن سکتی ہے، ہے نا؟" اس کے لہجے میں آنسو آ گئے۔

"ہاں۔"

"تو چاہے تو پھر ایک بار ماں بن سکتی ہے۔ ہے ناں؟" اس کی آواز آخری ہچکی جیسی کمزور تھی۔

"ہاں۔"

"مگر میں سہاگن نہیں بن سکتی۔ میں ماں نہیں بن سکتی۔" اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔ "بیگم صاحب نے............ بیگم صاحب نے میرا آپریشن کرادیا ہے۔"

زرینہ کے اندر جیسے دھماکہ سا ہوا۔ اس نے گھبرا کر سہارے کے لئے گڑیا پر ہاتھ رکھنا چاہا تو گڑیا وہاں نہیں تھی۔

☆------☆------☆

میں ایک معمولی سا انسان ہوں۔ اگرچہ کوئی انسان معمولی نہیں ہوتا۔ ایسا ہونے سے انسانیت معمولی ہو جائے گی۔ میں ایک گھریلو ملازم ہوں۔ حق حلال کی کمائی کھاتا ہوں اس لئے معمولی تو ہوں مگر گیا گزرا نہیں ہوں۔ بڑی فرض شناسی سے گھر کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام دن رات کرتا ہوں۔ کبھی میں نے عام لوگوں کی طرح یہ نہیں سوچا کہ میری ڈیوٹی صرف آٹھ گھنٹے کی ہونی چاہئے۔ میں کام کو اور نمک حلالی کو اولیت دیتا ہوں۔ مجھے آدھی رات کو بھی بلایا جائے تو میں فوراً نیند سے اٹھ کر سرونٹ کوارٹر سے دوڑتا ہوا کوٹھی میں چلا آتا ہوں۔

فی زمانہ نمک حلالی کی قدر نہیں رہی۔ بندہ جتنا جھکتا ہے' آقا اتنا ہی اسے جھکاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ جہاں میں کام کرتا ہوں' وہاں ذرا سی بھی بھول چوک ہوتی تھی تو دس باتیں سنائی جاتی تھیں۔ ایک بار تو بیگم صاحبہ نے گالیاں بھی دیں۔ مجھے بہت برا لگا لیکن میں نے برداشت کر لیا۔

دراصل ہمارے مالکان شعوری یا غیر شعوری طور پر ہماری قوتِ برداشت کو آزماتے ہیں۔ اگر ہم صرف باتیں سنتے ہیں تو وہ باتیں سنانے کی حد تک رہتے ہیں۔ اگر ہم ایک بار گالی کھا کر چپ ہو جائیں تو پھر ہمارے لئے گالیاں مقدر بنا دی جاتی ہیں۔ ہماری خاموشی اور ہمارا جھکا ہوا سر انہیں سمجھا دیتا ہے کہ ہم مجبور ہیں اور گالیوں سے آگے جوتے بھی کھا سکتے ہیں۔

یہ جو ہماری مجبوریاں ہوتی ہیں' یہی ہمیں ذلیل کرتی ہیں۔ اگرچہ گھریلو ملازم نایاب سمجھے جاتے ہیں۔ جس کوٹھی میں جاتے ہیں' وہاں فوراً ہی انہیں اچھی تنخواہ پر کام مل جاتا ہے۔ انہیں روزگار کی مجبوری نہیں ہوتی۔ میں جن مجبوریوں کا ذکر کر رہا ہوں' وہ اور طرح کی ہوتی ہیں۔ ہم کام کرنے والوں کو دوسرے حیلوں بہانوں سے اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے اس طرح جکڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ان دیکھی زنجیروں کو

توڑ نہیں سکتا۔ اس کوٹھی کی ملازمت کو چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتا۔ ایسی ہی ایک زنجیر سے مجھے جکڑ دیا گیا تھا۔ اس کوٹھی میں خاندان کے ایک بزرگ دادا جان تھے' جو میرے صاحب کے والد صاحب تھے۔ اس کوٹھی کی چار دیواری میں اور اپنے وسیع خاندان میں محترم تھے لیکن اپنے ہی بیٹے کے گھر میں دو کوڑی کے تھے کیونکہ وہاں بیگم صاحبہ کی حکومت تھی اور وہ ہر معاملے میں ضرورت اور اہمیت کو دیکھتی تھیں۔ ان کے مزاج اور نقطۂ نظر کے مطابق اس شاندار کوٹھی میں کھانسنے اور بلغم تھوکنے والے دادا جان کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ صاحب کے سامنے بات بات پر ان کی کوئی نہ کوئی برائی کرتی تھیں۔ ان کے سٹھیا جانے کے قصے سناتی تھیں۔ یوں بیٹے کی نظروں میں باپ کا بھاؤ گراتی رہتی تھیں۔ میرا بھاؤ ڈانٹ ڈپٹ سے گرایا جاتا تھا اور دادا جان کا بھاؤ بڑے ادب سے برائیاں پیش کر کے گرا دیا جاتا تھا۔

صاحب آئینے کے سامنے شیو کرتے وقت یا لباس پہنتے اور ٹائی کی گرہ درست کرتے وقت اپنے باپ کی ڈھیر ساری برائیاں سنتے تھے اور جواباً ہوں ہاں کہتے رہتے تھے۔ صبح بڑی جلدی میں رہتے تھے۔ دولت کی ٹرین چھوٹنے والی ہوتی تھی۔ گارڈ سیٹی بجاتا اور جھنڈی لہراتا تھا۔ وہ جلدی سے دوڑ کر سوار ہوتے تھے۔ ٹرین میں بیٹھ کر آگے نکل جاتے تھے۔ پیچھے باپ کھانستا رہ جاتا تھا۔ رات کو دولت کی یہ ٹرین مالا مال ہو کر بہت لیٹ آتی تھی۔ وہ تھک جاتے تھے یا شراب کے نشے میں بستر پر آ کر گر جاتے تھے اور گہری نیند میں ڈوب جاتے تھے۔ دادا جان کی خیریت پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

بیگم صاحبہ کو یہی فکر کھائے جاتی تھی کہ اتنی عالی شان کوٹھی میں ایک بوڑھا کیوں ہے؟ اس سے کس طرح پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے؟ کسی رشتے دار کے ہاں اس بوڑھے کو پے انگ گیسٹ کے طور پر چھوڑا جا سکتا تھا لیکن اس سلسلے میں جو اخراجات ہوتے' اسے بیگم صاحبہ برداشت نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ حالانکہ صاحب کروڑ پتی کی آخری حد میں تھے اور بہت جلد ارب پتی کہلانے والے تھے لیکن دادا جان کے متعلق فیصلہ تھا کہ کچھ خرچ کئے بغیر ان سے پیچھا چھوٹ جائے۔

ان کی آتی جاتی بیماریوں نے برسوں یہ امید بندھائی کہ وہ آج کل میں دنیا سے اٹھنے والے ہیں لیکن ایسی کوئی امید بر نہیں آئی۔ میں انہیں پیدل خیراتی ہسپتال لے

جاتا تھا۔ وہ پانی ملا ہوا مکسچر اور سستی گولیاں کھا کر صحت یاب ہو جاتے تھے۔ بیگم صاحبہ مجھے گھور کر دیکھتی تھیں پھر پوچھتی تھیں۔ "عبدل! کیا تو بڑے میاں کو کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا؟"

میں قسمیں کھا کر کہتا تھا۔ "آپ جانتی ہیں۔ بڑے ڈاکٹروں کی فیس دو تین سو روپے ہو چکی ہے۔ بازار سے تین چار سو روپے میں دوائیں آتی ہیں۔ اتنی رقم نہ میرے پاس ہوتی ہے اور نہ بڑے صاحب کے پاس۔ میں تو انہیں خیراتی اسپتال لے جایا کرتا ہوں۔"

وہ اپنے مقدر سے جی رہے تھے مگر وہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ کبھی کسی کام سے یا سیر و تفریح کے لئے کوٹھی سے باہر جاتی تھیں تو مجھے اپنا جاسوس بنا کر دادا جان کے پیچھے چھوڑ جاتی تھیں پھر واپس آکر دادا جان کے ایک ایک پل کا حساب لیتی تھیں، کس وقت انہوں نے کیا کیا؟ کس کمرے میں کب گئے؟ کیا کھایا؟ کیا پیا؟ کیا تم نے انہیں کچن میں جانے دیا تھا؟

مجھے ان بزرگ سے صرف ہمدردی نہیں، محبت بھی تھی۔ وہ بیچارے شاید ہی کبھی کوٹھی کے اندر جاتے تھے۔ کوٹھی کے پیچھے کچن کے قریب ایک اسٹور روم میں زندگی کے باقی ایام گزار رہے تھے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دادا جان بہو کے سامنے سر جھکا کر انکسار سے بولتے تھے اور میں سر اٹھا کر سینہ تان کر اس لئے بولتا تھا کہ اکلوتا ملازم تھا۔ تین ملازموں کا کام تنہا نمٹایا کرتا تھا اور کبھی کسی بات پر کہہ دیتا تھا کہ فلاں کوٹھی والے مجھے دگنی تنخواہ پر بلا رہے ہیں۔

یوں بیگم صاحبہ دہری فکر میں مبتلا تھیں۔ ایک فکر یہ تھی کہ بڑے میاں کس طرح یہاں سے جا سکتے ہیں؟ دوسری فکر یہ تھی کہ میں کسی بھی طرح یہاں سے کام چھوڑ کر نہ جاؤں۔

ایک رات کا ذکر ہے، دادا جان لان میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ کر ان کے پیر داب رہا تھا۔ بیگم صاحبہ ایک تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے ہوں گے اسی لئے سکون سے آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے جیسے سو رہے تھے۔

ایسے وقت میری نظر کوٹھی کی چھت پر گئی۔ میں نے چونک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی سایہ سایہ جیسی دکھائی دے رہی تھی۔ اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ دوپٹے کا آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا اور میرے تجسس کو بھڑکا رہا تھا کہ اس کوٹھی میں بیگم صاحبہ کے علاوہ دوسری کوئی عورت نہیں ہے پھر وہ چھت پر کون ہے؟

جب تجسس بھڑکتا ہے تو اسے دور کئے بغیر بے چینی نہیں جاتی۔ میں نے دادا جان کو دیکھا۔ اگر وہاں سے جانا چاہتا تو ان کی آنکھ کھل جاتی پھر وہ سوال کرتے کہ کہاں جا رہا ہوں؟ اور میں تصدیق کئے بغیر معقول جواب نہیں دے سکتا تھا کہ جسے دیکھنے جا رہا ہوں، وہ سیدھی آسمان سے اتر کر چھت پر آئی ہے یا میری نظروں کا دھوکا ہے۔

میں نے پھر ادھر دیکھا۔ اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ البتہ کبھی کبھی لہراتا ہوا آنچل جھلک رہا تھا اور میرے تجسس کو سبز جھنڈی دکھا کر مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ ایسے وقت میں ان کے پیر دابنا بھول گیا تھا۔ میں بڑی آہستگی سے گھاس پر سے اٹھا۔ بوڑھے کچی نیند سوتے ہیں۔ انہوں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا پھر پوچھا۔ "اے کام چور! کہاں جا رہا ہے؟"

میں نے اسکول کے بچوں کی طرح فوراً ہی اپنی چھوٹی انگلی دکھائی۔ انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ "ٹھیک ہے مگر وہیں نہ بیٹھ جانا۔ اگر تیری بیگم صاحبہ آجائیں گی تو نہ تیری خیر ہوگی اور نہ ہی میری۔"

"میں نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ بیگم صاحبہ کسی کے ہاں مہندی پر گئی ہیں۔ رات کے بارہ ایک بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گی۔"

میں کوٹھی کے ایک طرف سے گھوم کر سرونٹ کوارٹر کی طرف آیا۔ ادھر سے ایک زینہ چھت کی طرف جاتا تھا۔ میں اس زینے پر چڑھتا ہوا اوپر آیا۔ وہ منڈیر سے لگی دوسری طرف منہ کئے ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ سنتے ہی گنگناہٹ تھم گئی مگر وہ اسی طرح منہ پھیرے کھڑی رہی۔ میں نے پوچھا۔ "اے! کون ہے تو؟"

اس نے بڑے اطمینان سے لچکنے کے انداز میں گھوم کر مجھے دیکھا۔ بڑی بڑی کاجل بھری آنکھیں تھیں۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا۔ اس نے ایک ادائے ناز سے گوندھی ہوئی چوٹی کو پیچھے سے آگے کیا پھر اس کے پراندے سے کھیلنے لگی۔ میں نے

پوچھا۔ "کیا بہری ہے؟ سنائی نہیں دیتا؟ آخر تو کون ہے؟ اور ہماری چھت پر کیا کر رہی ہے؟"

وہ ذرا ہنسی پھر بولی۔ "تیری چھت؟ کیا یہ تیری چھت ہے؟ کبھی خواب میں ہی ایسی کوٹھی اور چھت کا مالک بن کر دکھا دے۔"

"میں مالک ہوں یا نہیں مگر تو کون ہے؟"

"میں مالکن ہوں' چھوٹی مالکن۔ آج ہی آئی ہوں۔"

میری ساری اکڑ نکل گئی میں فوراً ہی ادب سے بولا۔ "آ.......... آپ چھوٹی بی بی جی ہیں؟ لندن سے آئی ہیں؟ وہ بات یہ ہے کہ میں بازار سے سودا لانے شام کو گیا تھا واپسی میں دیر ہو گئی مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ آپ آئی ہوئی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے بھی جاتے وقت آپ کا ذکر نہیں کیا۔"

وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ "میں لندن والی نہیں ہوں بیگم ماں مجھے بیٹی بنا کر یہاں لائی ہیں۔ میں تمہاری بیگم صاحبہ کو بیگم ماں کہتی ہوں۔"

وہ پھر ایک بار ہنس کر بولی۔ "پہلے مجھے "تو" کہہ رہا تھا' اب "آپ" پر آگیا۔ ویسے مجھے تو اچھا لگتا ہے کیونکہ میں تیری ہی ذات برادری کی ہوں۔ اس کوٹھی کا ڈرائیور صدیق میرا بہنوئی ہے۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "کبھی بیگم صاحبہ کی بیٹی بن جاتی ہے۔ کبھی ڈرائیور کی سالی' کیا تو کوئی پاگل عورت ہے؟"

"اے خبردار! میں عورت نہیں ہوں لڑکی ہوں لڑکی۔ ابھی تو میری شادی نہیں ہوئی۔ شادی کے بعد تو جو چاہے کہہ سکتا ہے۔"

"تجھے ذرا بھی شرم لحاظ ہے؟ کیا ہر ایک سے اسی طرح بے شرمی سے باتیں کرتی ہے؟"

میں اس کی بے باکی پر حیران تھا وہ پہلی ملاقات میں کسی فلمی ہیروئن کی طرح گلے پڑ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "تو کس رشتے سے مجھ سے ایسی باتیں کر رہی ہے؟"

اس نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی ایک باریک سی سونے کی زنجیر کو ایک چٹکی میں پکڑ کر کھینچا۔ وہ زنجیر قمیض کے وی گلے کی گہرائی سے نکلتی ہوئی باہر آئی۔ اس زنجیر کے ساتھ دل کی شکل کا ایک لاکٹ تھا۔ اس نے لاکٹ کھول کر میرے سامنے کر دیا پھر کہا

"لے دیکھ.........."

میں نے دیکھا اور پھر دیکھتا رہ گیا۔ اس دل نما لاکٹ میں میری چھوٹی سی تصویر تھی۔ میں نے شدید حیرانی سے کہا۔ "تعجب ہے۔ میں تجھے پہلی بار یہاں دیکھ رہا ہوں اور تو میری تصویر ایسے لئے پھر رہی ہے جیسے مجھ سے پرانی جان پہچان ہو۔ یہ تصویر تجھے کہاں سے ملی؟"

وہ لاکٹ بند کرتے ہوئے بولی۔ "اپنے بہنوئی کی جیب سے چرائی ہے۔"

میں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک جوان لڑکی اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میری تصویر لگائے رکھتی تھی۔ یہ پیار کا ایسا انداز تھا کہ میرا بھی دل اس کے لئے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ڈرائیور صدیق کو کبھی اپنی تصویر نہیں دی تھی نہ اس نے مانگی تھی پھر تصویر اس کی جیب میں کیسے پہنچی اور اس کی جیب سے ایک نوخیز حسینہ کے دل کی دھڑکنوں تک کیسے پہنچ گئی تھی۔ ویسے صدیق نے ایک آدھ بار اپنی سالی کا ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے یاد آ رہا ہے ایک بار صدیق نے کہا تھا کہ کہیں سے اس کی سالی کا رشتہ آیا تھا مگر سالی نے یعنی تو نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ ویسے تو سوسائٹی کے کسی بنگلے میں کام کرتی ہے لیکن یہاں کیسے آئی ہے؟"

"یہ لاکٹ مجھے یہاں لے آیا ہے۔ میرے صدیق بھائی تیری اتنی تعریفیں کرتے ہیں کہ باجی تعریفیں سن کر کہتی ہیں کہ کسی طرح میرے رشتے کی بات تجھ سے کی جائے۔ وہ صدیق بھائی پر زور دیتی رہتی ہیں۔ میں دوسرے کمرے میں رات کو سوتے وقت بہن اور بہنوئی کی باتیں سنتی تھی اور تجھے اپنے دل میں محسوس کرتی رہتی تھی۔ ایک رات باجی نے ان سے کہا۔ "کبھی اس کی تصویر تو لا کر دکھاؤ۔"

"دوسرے دن صدیق بھائی تیرے کوارٹر سے ایک چھوٹی سی تصویر چھپا کر لائے۔ باجی تصویر دیکھ کر مچل گئیں کہ یہ رشتہ ہونا ہی چاہئے۔ دونوں کی جوڑی خوب رہے گی۔ ایسی باتیں اور ایسی تعریفیں سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے صبح ان دونوں کے جاگنے سے پہلے ہی وہ تصویر صدیق بھائی کی جیب سے چرالی۔"

وہ بول رہی تھی' میرے سامنے اپنا دل کھول رہی تھی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی پیاری پیاری سی من موہنی سی لڑکی مجھ سے دور رہ کر مجھے اس قدر چاہتی ہوگی۔ اس رات دنیا کے خوش نصیب عاشقوں کی فہرست میں میرا نام درج

ہو گیا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "جذبۂ عشق سچا ہو تو قریب آنے کی کوئی راہ نکل ہی آتی ہے ایک روز اللہ مجھ پر مہربان ہو گیا۔ تمہاری بیگم صاحبہ سوشل ویلفیئر کے کسی کام سے ہماری کوٹھی میں آئیں۔ میں نے صدیق بھائی کو ان کی گاڑی چلاتے دیکھا تھا اس لئے انہیں پہچان لیا۔ میں نے ان کے سامنے بڑے ادب اور سلیقے سے چائے اور ناشتا پیش کیا۔ تُو مجھے پھر بے شرم کہے گا مگر دل کی بات کہتی ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری ہونے والی ساس مجھے پسند کرنے آئی ہے۔ میں نے اپنے طور طریقوں سے انہیں متاثر کرنے کی کوششیں کیں۔ چلتے ہوئے صدیق بھائی نے انہیں بتایا کہ میں ان کی سالی ہوں۔ انہوں نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر مجھے بخشش کے طور پر پچاس روپے دے کر چلی گئیں۔"

اس کی باتوں سے دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بولنے کے دوران سانس لینے کے لئے بھی رکتی تو میں بے چین ہو جاتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تُو یہاں کیسے آ گئی؟"

اس نے کہا۔ "دوسری رات باجی اور صدیق بھائی نے کہا کہ میں نوکری چھوڑ دوں۔ صدیق بھائی کی بیگم صاحبہ مجھے بیٹی بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اتنی دولت مند بیگم صاحبہ مجھے بیٹی کیوں بنانا چاہتی ہیں؟ صدیق بھائی نے بتایا کہ ان کی اپنی بیٹی لندن میں ہے' پاکستان نہیں آتی ہے۔ وہ بیٹی کی کمی کو مجھ سے پورا کرنا چاہتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ عجیب سی قصے کہانی والی بات تھی کہ گھروں میں جھاڑو برتن کا کام کرنے والی لڑکی کو کوئی بڑی بیگم صاحبہ بیٹی بنائے۔ باجی نے کہا' ہمیں ایسی بات پر حیران نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ تقدیر جب بدلتی ہے تو اس طرح حیران ہونے والی خوشیاں ملنے لگتی ہیں۔

"میری تو جیسے عید ہو گئی تھی۔ میں تیرے قریب آنے کے خواب دیکھ رہی تھی اور اللہ میاں نے مجھے تیرے پاس بھیجنے کا سامان کر دیا تھا۔ ہماری تمہاری اوقات کیا ہے کہ بڑے لوگ ہمیں بیٹا یا بیٹی بنائیں مگر تیری چاہت نے مجھے خوش نصیب بنا دیا ہے اور تُو دیکھ رہا ہے کہ اب میں تیرے سامنے ہوں۔"

میں نے اسے نظر بھر کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تیرے اس لباس کو پہچانتا ہوں یہ بیگم صاحبہ کا ہے۔ اسے پہن کر' یوں بن سنور کر واقعی کوٹھی والی لگتی ہے لیکن بیٹی بن

کر آئی ہے تو ان کے ساتھ مہندی میں کیوں نہیں گئی؟"

"بیگم ماں نے مجھے بیٹی کا فرض سمجھایا ہے کہ ماں کی غیر موجودگی میں بیٹی کو گھر کی دیکھ بھال کرنی چاہئے۔"

"بہت خوب سمجھایا ہے۔ آخر بیگم صاحبہ ٹھہریں۔ بیٹی کے ساتھ ساتھ ایک حسین چوکیدار بھی لائی ہیں۔ اگر سگی بیٹی ہوتی تو اتنی بڑی کوٹھی میں اسے تنہا چھوڑ کر ہرگز نہ جاتیں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "تُو یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ میں تیری خاطر یہاں رہ گئی ہوں۔ تُو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا تھا اس لئے دکھانا چاہتی تھی کہ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ مجھے دیکھے گا تو پھر بار بار دیکھنا چاہے گا۔"

یہ کہہ کر وہ زینے کی طرف جانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہے؟"

"بیگم ماں کے بیڈ روم میں لباس اور میک اپ کا سامان بکھرا پڑا ہے۔ اسے ٹھیک طرح رکھنے جا رہی ہوں۔"

وہ زینے سے اترتی ہوئی' پلٹ پلٹ کے مجھے دیکھتی ہوئی کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ اگر وہ سرونٹ کوارٹر میں رہنے والی محض ایک ملازمہ ہوتی تو میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ ابھی اسے جانے نہ دیتا لیکن وہ بیگم صاحبہ کی بیٹی بن کر آئی تھی۔ ان کی اترن پہن کر بڑے گھر کی بیٹی لگ رہی تھی۔ شاید اسی لئے اسے روک نہ سکا کہ لاشعوری طور پر اس سے مرعوب اور متاثر ہو گیا تھا۔

میں چھت سے اتر کر دادا جان کی طرف جانے لگا۔ جب کہ دل کہہ رہا تھا کوٹھی کے اندر جا کر اسے پھر ایک بار دیکھوں۔ اس نے درست کہا تھا کہ ایک بار دیکھنے کے بعد اسے بار بار دیکھنے کی آرزو کروں گا۔ میرا دل ادھر ہی لگا رہا اور میرے قدم مجھے دادا جان کے پاس لے آئے۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے تھے۔ میں نے ان کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "بڑے صاحب! اٹھیں۔ بڑے صاحب!"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ "آں؟ کیا.......... کیا بہو آ گئی ہیں؟"

"نہیں۔ میں نے اس لئے جگایا ہے کہ آپ کمرے میں جا کر آرام سے سو جائیں۔"

انہوں نے بہو کو نہ پا کر اطمینان کی سانس لی پھر کہا۔ "میں نیند میں تھا مگر تُو خواب

میں بول رہا ہے۔ آرام اور میرے کمرے میں؟ جہاں نہ تازہ ہوا کے لئے کھڑکی ہے اور نہ ہی گرم ہوا باہر پھینکنے کے لئے وینٹی لیٹر ہے۔"

بڑے صاحب کے حالات دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا۔ جن دنوں وہ خوب کماتے تھے تو اس اسٹور روم میں پھلوں اور میووں کی پیٹیاں لاکر رکھتے تھے تاکہ تمام رشتے دار آتے رہیں اور کھاتے رہیں۔ اب اسی کال کوٹھری میں وہ باقی عمر قید گزار رہے تھے۔ وہاں گرمی اور حبس کی وجہ سے ان کے جسم پر باریک دانے نکل آتے تھے۔ جب میں کوٹھی سے گرمی دانوں کا پاؤڈر چرا کر لاتا تھا اور پاؤڈر چھڑک کر ان کی پیٹھ پر ہتھیلی پھیرتا تو یوں لگتا تھا جیسے میری ہتھیلی کسی ریگ مال پر رک رک کر پھسل رہی ہے۔

میں نے کہا۔ "بڑے صاحب! اس طرح کرسی پر سوتے رہیں گے تو آپ کی کمر اکڑ جائے گی۔"

انہوں نے مجھے بڑی حسرت سے دیکھا پھر کہا۔ "جب تُو میری فکر کرتا ہے تو مجھے اپنے بیٹے سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کاش میں نے ساری عمر کی محنت کے بدلے تجھ جیسا ایک بیٹا کمایا ہوتا۔"

میں نے کہا۔ "خدمت کرنے والے ملازم کہلاتے ہیں۔ شاید اسی لئے صاحب، صاحب ہی رہتے ہیں۔ ملازم نہیں بننا چاہتے۔ ویسے آپ کو یاد ہے نا' ڈاکٹر نے آپ کو رات کی دوا کے ساتھ دودھ پینے کو کہا ہے؟"

"اب تُو اپنی جیب سے پیسے نکالے گا اور یہاں سے نکڑ تک جاکر میرے لئے دودھ لائے گا۔"

"نہیں بڑے صاحب! کچن میں اور فریج میں دودھ ہی دودھ ہے۔ ایک گلاس لے آؤں گا۔"

"جب بیگم صاحبہ آکر قطرے قطرے کا حساب لیں گی تو کیا دودھ میں پانی ملائے گا؟"

"وہ جیسا کرتی ہیں' ان کے ساتھ ویسا ہی کرنا چاہئے۔"

انہوں نے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا۔ "میں نے ساری عمر بے ایمانی سے بچنے کی کوشش کی ہے اس لئے چوری اور بے ایمانی کا تجھے مشورہ نہیں دوں گا۔ آئندہ کوئی ہیرا پھیری کرنے سے پہلے یہ نہ بھولنا کہ یہ گھر میرے بیٹے کا ہے۔"

میرا سر جھک گیا۔ وہ اس گھر میں بزرگ نہیں سمجھے جاتے تھے اس کے باوجود گھر کو تحفظ دینے کا فرض ادا کر رہے تھے۔ میں کوٹھی کی طرف دیکھ کر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "مگر دوا کے ساتھ پینے کے لئے دودھ ضرور لاؤں گا اور ایمانداری سے لاؤں گا۔ آپ کے بیٹے کے گھر میں چوری نہیں کروں گا۔ آپ اپنے کمرے میں جائیں۔"

وہ جانے کے لئے کرسی سے اٹھ گئے۔ میں لان سے گزر کر کوٹھی کے دروازے پر آیا پھر کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "دروازہ کھول۔ میں عبدل ہوں۔"

وہ مجھے بہت پہلے سے جانتی تھی۔ یقیناً میرا نام بھی جانتی ہوگی مگر اس نے پوچھا "کون عبدل؟ میں کسی عبدل وبدل کو نہیں جانتی۔"

"میں وہی ہوں' تیرے دل سے لگ کر دھڑکنے والا۔ تیرے لاکٹ میں قید رہنے والا۔"

وہ دروازہ کھول کر بولی۔ "آخر تُو نے مجھے دوسری بار دیکھنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیا ہے۔"

میں نے اندر آکر کہا۔ "یہی سمجھ لے۔ ویسے میں تجھے اس گھر کی سب سے بزرگ ہستی سے ملانا چاہتا ہوں۔ تُو نے دادا جان کا ذکر سنا ہوگا؟"

"ہاں۔ بیگم ماں نے تاکید کی ہے کہ میں ان سے دور رہا کروں اور انہیں زیادہ منہ نہ لگاؤں۔"

میں نے پوچھا۔ "اگر میں کہوں کہ تجھے دادا جان سے ملنا اور ان کی عزت کرنا چاہئے تو کیا پھر بھی انکار کرے گی؟"

وہ الجھ سی گئی۔ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔ "تیرے کسی حکم سے انکار نہیں کروں گی۔ مگر بیگم ماں کو معلوم ہوگا کہ .... کہ میں.........."

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "انہیں نہیں معلوم ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

وہ راضی ہوگئی۔ میں اس کے ساتھ کچن میں آیا۔ دیگچی سے ایک گلاس دودھ نکالتے ہوئے اسے دادا جان کی مظلومیت کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ بہت متاثر ہوئی'

بولی۔ "آدمی کا بڑھاپا بہت خراب ہوتا ہے۔ اسے اپنی اولاد بھی نہیں پوچھتی مگر میں پوچھوں گی اور جب بیگم ماں نہیں ہوا کریں گی تو ان کی خدمت کروں گی۔"

"آج بھی تجھے خدمت کرنا ہے۔ یہ ایک گلاس دودھ ان کے لئے لے جا رہا ہوں۔ بیگم صاحبہ کو شبہ ہو گا تو کہہ دینا کہ تُو نے دودھ پیا ہے۔"

"بیگم ماں نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں یہاں جو چاہوں پہنوں اور جو چاہوں کھاتی پیتی رہوں۔ میں ایک گلاس دودھ بھی پی سکتی ہوں اور اپنے حصہ کا دودھ دادا جان کو بھی پلا سکتی ہوں مگر یہ بات بیگم ماں سے نہیں کہوں گی۔"

میں بہت خوش ہوا کہ وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ اگر اس سے شادی ہو گئی تو زندگی ہنستے کھیلتے گزرے گی۔ وہ دودھ کا گلاس لے کر میرے ساتھ کچن کے پچھلے دروازے سے نکلی پھر کچن کے ساتھ والے اسٹور روم میں آئی۔ اس نے دادا جان کو سلام کیا۔ میں نے اس کا تعارف کرایا۔ انہوں نے سن کر کہا۔ "میں نے عشاء کے وقت اسے ڈرائیور صدیق کے ساتھ دیکھا تھا۔ یہ کوٹھی کے اندر جا رہی تھی۔ تم کہتے ہو، بہو نے اسے بیٹی بنایا ہے بیٹی؟"

وہ ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے ان کی بوڑھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ بڑے کرب سے بولے۔ "سگا خون بوڑھا اور ناکارہ ہو چکا ہے۔ اس لئے باہر سے تازہ خون کی بوتل لائی گئی ہے۔"

کچھ عرصہ پہلے بیگم صاحبہ ان سے گھر کا کام کرایا کرتی تھیں۔ پھر وہ آئے دن کی بیماریوں کے باعث کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ وہ بولی۔ "میں سگی تو نہیں بن سکتی مگر مجھے بیٹی کہا گیا ہے تو اس رشتے سے آپ میرے دادا جان ہیں۔ یہ لیں، دوا کے ساتھ دودھ پئیں۔ یہ چوری کا مال نہیں ہے، آپ کے بیٹے کی کمائی میں آپ کا اتنا حصہ ضرور ہونا چاہئے۔ بیگم ماں سے ہم نمٹ لیں گے۔"

انہوں نے پوچھا۔ "بیٹی، تمہارا نام کیا ہے؟"

"مجھے سب نوری کہتے ہیں۔ بیگم ماں نے مجھے یہاں آزادی سے کھانے پینے کی اجازت دی ہے۔ آپ یوں سمجھیں۔ آپ کی پوتی اپنے حصے کا دودھ آپ کو پلا رہی ہے۔ اگر بیگم ماں کو معلوم ہوگا اور وہ میری اس حرکت پر اعتراض کریں گی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

انہوں نے ہنستے ہوئے دودھ کا گلاس لے کر کہا۔ "میں سمجھتا تھا صرف عبدل اپنی بیگم کو کام چھوڑ کر جانے کی دھمکیاں دیا کرتا ہے۔ تو بھی یہی انداز اپنا رہی ہے۔ تم دونوں میں ایسا اتحاد رہے گا تو مجھے فائدہ پہنچے گا۔ اب یہاں میرا خیال رکھنے والے اور مجھ سے محبت کرنے والے دو رہیں گے۔"

انہوں نے دوائی کھائی۔ اس کے ساتھ دودھ پیا پھر ہم دونوں کو ایسی دعائیں دینے لگے کہ نوری مسکراتی اور شرماتی ہوئی خالی گلاس لے کر وہاں سے چلی گئی۔

☆------☆------☆

بیگم صاحبہ نوری کو بیٹی بنا کر لائی تھیں لیکن انہوں نے کبھی اسے بیٹی کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ کم از کم میں نے کبھی اسے بیٹی کہتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ انہوں نے کھانے کی میز پر کبھی اسے اپنے ساتھ بٹھا کر نہیں کھلایا تھا۔ نوری بچپن سے مختلف گھروں میں جھاڑو' برتن اور چولہے ہانڈی کا کام کرتی آئی تھی۔ اس لئے ایک بڑے گھر میں بیٹی بنا کر لائے جانے پر خوش تھی۔

بیگم صاحبہ اکثر مہمانوں کے سامنے کہتی تھیں۔ "اس کا نام نوری ہے۔ ہماری بہت ہی محنتی اور تابعدار ملازمہ ہے لیکن میں اسے بیٹی کی طرح رکھتی ہوں۔"

نوری خوش ہو جاتی تھی۔ یہ بھول جاتی تھی کہ اسے ملازمہ کہا گیا ہے۔ صرف یہ خوشی کافی ہوتی تھی کہ اسے بیٹی کی طرح رکھا گیا ہے۔ دادا جان نے درست کہا تھا کہ تازہ خون کی بوتل لائی گئی ہے اور اس بوتل پر بیٹی کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے۔

ایسے ہی مہمانوں کے سامنے بیگم صاحبہ مجھ سے ایسا سلوک کرتی تھیں جیسے میں نہایت ہی کمتر اور کمینہ ملازم ہوں۔ وہ اکثر کہتی تھیں۔ "یہ عبدل برسوں سے یہاں کام کرتا ہے مگر کام چوری کرتا ہے۔ کبھی برتن توڑ دیتا ہے' کبھی استری کرتے وقت کپڑے جلا دیتا ہے۔ سچ پوچھو تو پکا حرام خور ہے..........."

بہت عرصہ پہلے مجھ سے ایک برتن ٹوٹ گیا تھا اور ایک بار استری کرتے وقت بیگم صاحبہ کی شلوار کا پائنچہ جل گیا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ دادا جان ان دنوں بیمار تھے۔ چلتے چلتے گر پڑے تھے۔ میں نے انہیں سنبھال کر' سہارا دے کر اسٹور روم میں پہنچایا تھا۔ مجھے خیال نہیں رہا۔ اتنی دیر میں شلوار کا پائنچہ جل گیا۔ ایک بار دادا جان کے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے پلیٹ گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ میں اس سلسلے میں دادا جان کو طرح طرح کی غیر مہذب باتیں سنتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اس لئے پلیٹ توڑنے کا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ تب سے مجھے انہی دو غلطیوں کے طعنے اور کوسنے ملتے

بجے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب نوری کوٹھی میں اور میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔

میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے وقت بہت مستعد اور محتاط رہتا تھا۔ ایک بار بیگم صاحبہ نے آواز دی۔ مجھے چولہے سے سالن اتارنے میں ایک ذرا دیر لگی۔ میں ان کے سامنے حاضر ہوا تو وہ شوہر سے کسی بات پر لڑ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر آندھی کا رخ بدل گیا۔ وہ غصے سے بولیں۔ "اب آیا ہے؟ کہاں مر گیا تھا؟ کیا اپنی ماں کی میت اٹھانے گیا تھا؟"

عجیب عورت تھی۔ انگارے چباتی رہتی تھی۔ بے انتہا دولت نے بد دماغ بنا دیا تھا۔ میں یہ بد دماغی برداشت نہ کر سکا۔ میں نے کہا۔ "برسوں پہلے ماں کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ آج میں اپنا جنازہ اس کوٹھی سے لے جا رہا ہوں۔ لعنت بھیجتا ہوں ایسی نوکری پر............"

میں جواباً غصہ دکھا کر کوٹھی کے پیچھے سرونٹ کوارٹر میں آ گیا اور نوکری چھوڑ کر جانے کے لئے اپنے کپڑے اور ضروری سامان سمیٹنے لگا۔ اس کوٹھی میں اور کوئی نوکر نہیں تھا۔ مجھے وہاں صرف دادا جان سے دلی لگاؤ تھا ورنہ بہت پہلے ہی وہاں سے چلا جاتا۔

شاید تھوڑا بہت لگاؤ صاحب کے دل میں بھی کہیں چھپا ہو گا۔ انہوں نے صرف ایک بار اپنی بیگم سے پوچھا تھا۔ "تم نے ابو کو اسٹور روم میں کیوں بھیج دیا ہے؟"

وہ بولیں۔ "اور کیا کروں؟ دن رات کھانستے اور بلغم تھوکتے رہتے ہیں۔ یہاں سیاسی اور کاروباری لوگ اپنی بیگمات کے ساتھ آتے ہیں۔ کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کے والد محترم ان سب کے سامنے بلغم تھوکتے رہیں؟"

صاحب نے ناگواری سے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ ابو پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ اپنی بیماریاں بڑھاتے رہتے ہیں۔ وہ اسٹور ہوادار نہیں ہے۔ ہم انہیں سرونٹ کوارٹر میں رکھنا چاہیں گے تو رشتے دار باتیں بنائیں گے۔ آدمی بوڑھا ہو کر پرابلم بن جاتا ہے۔ تم ایسا کرو' ایک ٹیبل فین اسٹور روم میں پہنچا دو۔"

یہ کہہ کر وہ ایک ضروری بزنس میٹنگ اٹینڈ کرنے چلے گئے۔ اس دن کے بعد پھر

انہوں نے پلٹ کر باپ کی خیریت نہیں پوچھی۔ انہیں اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ ملک سے باہر بھی جاتے رہتے تھے۔ ایک بار بیگم صاحبہ کو کھانسی ہونے لگی۔ وہ ہائے ہائے کرنے لگیں کہ بڑے میاں کی کھانسی کے جراثیم ان کے اندر پہنچ گئے ہیں۔ صاحب ان کا علاج کرانے لندن لے گئے تاکہ علاج کے علاوہ بچوں سے بھی ملاقات ہوجائے۔ ادھر دادا جان خیراتی ہسپتال کی دواؤں کے سہارے اپنی زندگی کو آخری منزل تک گھسیٹ کر لے جارہے تھے۔

بہرحال میں نے نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اپنا سامان باندھ کر جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت صاحب آگئے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کہاں جارہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یہاں ایسی درجنوں کوٹھیاں ہیں' جہاں کے مالکان تنخواہ بڑھا کر ملازمت دینا چاہتے ہیں۔ میں یہاں سے جاکر بھوکا نہیں مروں گا۔"

"میں جانتا ہوں۔ کوٹھیوں میں کام کرنے والے نوکروں کے بھاؤ بڑھتے رہتے ہیں۔ سامان رکھو اور کچن میں جاؤ۔ تمہاری تنخواہ بڑھادی جائے گی۔"

"میں گالیاں کھانے کی تنخواہ نہیں لوں گا۔"

"تم جانتے ہو کہ بیگم غصے کی ذرا تیز ہیں مگر دل کی بری نہیں ہیں۔"

"انہیں غصے میں یاد رکھنا چاہئے کہ میں نوکر ہوں مگر وہ مجھے شوہر سمجھ کر الٹی سیدھی سنانے لگتی ہیں۔"

صاحب نے جھینپ کر کہا۔ "کیا بکواس کررہے ہو۔"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں روانی میں صاحب کے منہ پر کہہ گیا تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کے دباؤ میں رہتے ہیں۔ اسی وقت کھانسی کی آواز سنائی دی۔ میرے دروازے پر دادا جان بھی آگئے۔ صاحب نے پوچھا۔ "آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ "بیٹے! تمہارا ایک مان مرتبہ ہے۔ تم مالک ہو۔ تمہیں ایک ملازم کے کوارٹر میں نہیں آنا چاہئے۔ تم جاؤ میں عبدل کو جانے سے روک لوں گا۔"

میں نے کہا۔ "میں یہاں ایک منٹ نہیں رہوں گا۔ بڑے صاحب! آپ مجھے نہ روکیں۔"

"کیا تم مجھے بیماری میں چھوڑ کر جاؤ گے؟ اور جاؤ گے تو مجھے خیراتی ہسپتال کون لے جائے گا۔ تم اپنی جیب سے دودھ کے پیسے نہیں دو گے تو میں کس سے مانگنے جاؤں

گا۔"

صاحب نے ایک دم تلملا کر کہا۔ "آپ ایک ملازم کے سامنے میری انسلٹ کررہے ہیں۔ کیا ضرورت کے وقت مجھ سے ہزار دو ہزار یا دس ہزار نہیں مانگ سکتے؟"

"ایسے تو تم مانگا کرتے تھے جب میں کماتا تھا۔ تم سیرو تفریح کے لئے ہزاروں روپے لے جاتے تھے۔ کبھی ذرا سا بیمار پڑتے تھے تو میں بڑے ڈاکٹروں سے تمہارا علاج کراتا تھا۔ کبھی تم نے ماضی کو یاد کرکے پوچھا کہ میرا علاج اسپیشلسٹ کررہے ہیں یا میں خیراتی اسپتال جاتا ہوں اور وہاں جاتے وقت میری جیب میں ایک روپیہ بھی ہوتا ہے یا نہیں؟"

"آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں بزنس کے معاملات میں کس قدر مصروف رہتا ہوں۔ کیا آپ میرے پاس آکر کچھ رقم نہیں مانگ سکتے؟"

"میں تو سڑک کے کنارے بھی کھڑا ہوکر مانگ سکتا ہوں مگر تمہاری عزت رکھنے کے لئے اسی عبدل سے دوا اور دودھ کے لئے کچھ لیتا رہتا ہوں۔ بیٹے! یہ ملازم تمہارے لئے بھی ضروری ہے' میرے لئے بھی ضروری ہے تم اسے ملازم سمجھ کر روکنے آئے ہو۔ میں اسے بیٹا سمجھ کر اپنی ضرورت کے لئے کچھ روپے مانگنے آیا ہوں جاؤ میرے بیٹے جاؤ۔ یہ عبدل مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔"

صاحب شرمندگی سے جھنجلاتے ہوئے چلے گئے۔ دادا جان نے ایسی باتیں کہہ دی تھیں کہ مجھے وہاں رکنا پڑا۔ ان کے سمجھانے پر کوٹھی میں پھر کام کرنے آیا۔ وہاں صاحب اور بیگم صاحبہ میں جھگڑا ہورہا تھا پھر صاحب غصے سے تنتناتے ہوئے چلے گئے۔ میں اپنے کام سے لگ گیا۔

اس روز بیگم صاحبہ کو دادا جان کی اس اہمیت کا پتا چلا کہ میں اگر نوکری چھوڑ کر جانا چاہوں تو مجھے صرف وہی روک سکتے ہیں ورنہ میں صاحب اور بیگم صاحبہ کو آئندہ خاطر میں نہیں لاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے ساتھ دادا جان کو بھی لے جاؤں۔

پھر یہ بھی پتا چلا کہ وہ مجھے پانچ سو روپے رشوت کے طور پر دے کر دادا جان کے پیچھے جاسوس بنا کر غلطی کیا کرتی تھیں۔ اب انہیں مجھ پر بھروسا نہیں کرنا چاہئے تھا مگر وہ بڑی چالاک تھیں۔ یہی ظاہر کرتی رہیں کہ مجھ پر ہمیشہ کی طرح اعتماد کرتی ہیں اور کہیں

باہر جاتے وقت کوٹھی کی ہر چیز کو میرے حوالے کر کے جاتی ہیں۔

بہرحال ایک رات اچانک ہی کوٹھی کے حسن میں اضافہ ہو گیا۔ نوری بھری بہار کی طرح آئی اور میرے حواس پر چھا گئی۔ میں اسے پہلے نہیں جانتا تھا لیکن وہ مجھے جانتی تھی اور میری لاعلمی میں مجھ سے محبت کرتی رہتی تھی پھر محبت کی یہ شدت اسے میرے قریب کوٹھی میں لے آئی تھی' اس کے پیار کی اس ادا نے مجھے اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔

پہلی ملاقات کی رات اس نے میری باتوں سے متاثر ہو کر دادا جان کو ایک گلاس دودھ دیا تھا۔ اس طرح مجھے اپنا اور گرویدہ کر لیا تھا۔ جو ملبوسات بیگم صاحبہ کے استعمال میں نہیں رہے تھے وہ اب نوری کے ہو گئے تھے۔ میک اپ کا بچا ہوا سامان' سینڈلوں کی درجنوں جوڑیاں اور بہت کچھ اسے بیگم صاحبہ نے دیا تھا۔ نوری کو جیسے خزانہ ملتا رہتا تھا۔ وہ صبح سے شام تک بن سنور کر رہتی تھی۔ کبھی کچن کے کسی کام میں میرا ساتھ دے دیتی تھی ورنہ بیگم صاحبہ کی خدمت کے لئے ان کے بیڈ روم میں گھسی رہتی تھی۔

مجھ سے تنہائی میں ملاقات ہوتی تو عشقیہ مکالمے ضرور ادا ہوتے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بیگم صاحبہ کے بھی گن گاتی رہتی۔ غریب عورتیں اپنی گلیوں میں پھیری لگانے والوں کو اپنے پرانے ملبوسات دیتی ہیں اور ان کے بدلے پکانے کی دیگچیاں اور برتن وغیرہ ان سے لیتی ہیں اس طرح رقم بچتی ہے اور چولھے ہانڈی کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے اپنے پرانے کپڑے اور پرانا سامان دے کر اور صرف بیٹی کہہ کر اسے خرید لیا تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے تو وہ زہر لگتی ہے' تو اس کی تعریفیں کیوں کرتی ہے؟"

وہ تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھا کر بولی۔ "دیکھ میری بیگم ماں کے خلاف کچھ نہ کہنا۔ تو یہاں برسوں سے ہے مگر ان کے اندر چھپی ہوئی ایک مظلوم ماں کو نہیں جانتا۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ مظلوم کیسے ہو گئیں؟"

"کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ان کی ایک جوان بیٹی اور جوان بیٹا ہے مگر دونوں ان سے دور رہتے ہیں۔ کبھی یہاں ماں سے ملنے نہیں آتے۔ بیچاری ماں مجبور ہو کر خود ہی ان سے ملنے جاتی ہے۔"

"اس میں مظلومیت کی کیا بات ہے۔ وہ وہاں تعلیم حاصل کرنے گئے ہیں۔ جب تعلیم مکمل ہو جائے گی تو واپس آ جائیں گے۔"

"واپس نہیں آئیں گے۔ تو اندر کی بات نہیں جانتا۔ بیٹی نے وہاں والدین کی مرضی کے خلاف شادی کر لی ہے اور بیٹا آوارہ اور نشے کا عادی ہو گیا ہے۔ اب تیری سمجھ میں آئے گا کہ وہ مجھے بیٹی بنا کر اپنے اندر کا دکھ دور کر رہی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ممتا صرف بیٹی کے لئے ہے؟ کیا بیٹے کے لئے نہیں ہے؟ اگر ہے تو وہ مجھے بیٹا کیوں نہیں بنا لیتیں؟"

"فضول باتیں نہ کر۔ سب ہی کو بیٹی یا بیٹا نہیں بنایا جاتا۔ جو اچھا لگے جس پر محبت آئے' اسے ہی اپنایا جاتا ہے۔ میں اتنی خوبصورت اور اتنی کشش والی ہوں کہ بیگم صاحبہ نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے پسند کر لیا تھا۔"

"اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ میں بھی پہلی ملاقات میں تیرا ہو گیا تھا۔"

"تو مجھ سے بہت محبت کرتا ہے نا؟"

"کیا تجھے شبہ ہے؟"

"تھوڑا سا شبہ ہے۔ اسے دور کر دے۔ میری ایک بات مان لے۔ آج سے ہم دادا جان کو چوری سے دودھ نہیں پلایا کریں گے۔"

"ہماری محبت کا دادا جان کے دودھ سے کیا تعلق ہے؟"

"کوئی بھی تعلق ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں' تو میری بات مانتا ہے یا نہیں؟"

"میری محبت کو آزمانے اور اپنی بات منوانے کے لئے یہ بھی کہہ دے کہ میں دادا جان کو زہر کھلا دوں۔"

"کیوں بات کو دوسری طرف لے جا رہا ہے؟"

"بات دوسری نہیں ہے۔ دادا جان جو دوائیاں کھاتے ہیں۔ ان کے لئے دودھ پینا ضروری ہے۔ دودھ نہ دینے سے دوائیں بے اثر ہوں گی۔ اس سے بہتر ہے' انہیں زہر دے دیا جائے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو الٹی بحث کرے گا لیکن میں اپنی بیگم ماں سے کوئی بات نہیں چھپاتی ہوں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ تو انہیں چوری سے دودھ پلاتا ہے اور

میں نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ کچن یا فریج میں سے دودھ نہیں جانے دوں گی۔"

"نوری! تُو نے بیگم صاحبہ کو یہ بتا کر اچھا نہیں کیا ہے۔ دادا جان کو تھوڑی سی ملنے والی توانائی پر پہرا بٹھا دیا ہے۔"

میں اس سے منہ پھیر کر کوارٹر میں چلا آیا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ مجھے ساری دنیا کی حسیناؤں سے زیادہ حسین لگتی تھی۔ اس پر بڑا پیار آتا تھا۔ ایسے میں غصہ کرتے وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ غصے کے پیچھے پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

کوٹھی کے اندر کام کرنے کے دوران ہمارا سامنا ہوتا رہا۔ وہ مسکراتی رہی۔ مجھے مختلف اداؤں سے مناتی رہی۔ میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دادا جان کے سلسلے میں اپنی بات منوانا چاہتا تھا لیکن میرے بات نہ کرنے اور اس سے ناراض رہنے میں بھی رومانیت تھی۔ عاشقانہ انداز تھا۔ وہ مجھے مناتی تو بڑا مزہ آتا تھا۔ اپنی اہمیت کا احساس ہوتا۔ وہ میری محبت میں زیادہ سے زیادہ گرفتار دکھائی دیتی تھی جب کہ نادانستگی میں' میں اس کا اور زیادہ اسیر ہوتا جا رہا تھا۔

ادھر میں نے دادا جان سے معذرت چاہی۔ انہیں بتا دیا کہ نوری اپنی بیگم ماں کے سحر میں جکڑی ہوئی ہے۔ میں ہر رات بازار سے ایک پاؤ دودھ لا کر انہیں پلانے لگا۔ دل نے کہا کہ دادا جان کی ضرورت پوری کر رہا ہوں۔ اب اپنی جان سے روٹھ کر اپنی نیندیں حرام نہیں کرنا چاہئے۔

ہماری پھر دوستی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "دیکھ نوری! میں نے تیری بات مان لی۔ دادا جان کے لئے اس کوٹھی سے دودھ نہیں جاتا ہے۔"

وہ میری گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "بیگم ماں سے میرا کیا ہوا وعدہ پورا ہو رہا ہے۔ تُو میرا سچا بجن ہے۔"

"تُو نے مجھے اچھی طرح پرکھ لیا ہے تو اب ہم جلدی شادی کر لیں۔"

"ہاں۔ میں بیگم ماں سے کہوں گی۔ جب ہم دونوں کو ہمیشہ اس کوٹھی میں ساتھ رہنا ہے تو پھر کیوں نہ ہم شادی کر لیں۔"

میں نے کہا۔ "ہم ساری عمر یہاں نہیں رہیں گے۔ میں صرف دادا جان کی زندگی تک رہوں گا پھر کسی بھی دوسری کوٹھی میں جاؤں گا تو ماہانہ تین ہزار روپے سے کم نہیں ملیں گے۔ تین ہزار مجھے اور تین ہزار تجھے ملا کریں گے۔ ہم خوب مال کھائیں

گے۔"

"میں تو بیگم ماں کو چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گی اور نہ ہی تجھے جانے دوں گی۔ یہاں جو محبت اور عزت مجھے مل رہی ہے۔ وہ دوسروں کے تین ہزار اور چھ ہزار روپے سے نہیں ملے گی۔"

"عورت کو عزت اس کے شوہر سے ملتی ہے۔ شادی کے بعد میں جہاں تجھے لے جاؤں گا' وہاں تُو جائے گی۔"

"تُو پھر جھگڑا کرنا چاہتا ہے۔ اچھا ہے شادی سے پہلے اپنے تمام ارادے بتا دے۔ مجھے معلوم تو ہو کہ تُو کتنا خودغرض ہے مگر ایک بات پتھر کی لکیر ہے۔ میں مرتے دم تک بیگم ماں کو نہیں چھوڑوں گی۔"

"تو پھر اپنے جہیز میں بیگم ماں کو لے آنا۔ میں انہیں بھی ساتھ لے چلوں گا۔"

ہمارے درمیان پھر بات بڑھی پھر جھگڑے ہوئے اور ہم روٹھ کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اگر دادا جان کا خیال نہ ہوتا تو میں اسی دن کوٹھی سے چلا جاتا۔ اس کوٹھی میں رہ کر اس سے جدائی ممکن نہیں تھی کیونکہ بار بار ہمارا سامنا ہوتا رہتا تھا اور وہ طرح طرح کی اداؤں سے مجھے اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی تھی پھر میں بے اختیار دیکھتا تھا تو اس کا دوپٹہ سر اور سینے پر سے ڈھلکا رہتا تھا۔

پھر ایک بار میں نے چور نظروں سے دیکھا تو وہ سونے کی پتلی سی زنجیر کو ایک چٹکی میں پکڑے ہوئے تھی اور اسے گریبان کی گہرائی سے نکال کر اس لاکٹ کو چوم رہی تھی' جس میں مجھے قید کر رکھا تھا۔

ہم اَن دیکھی زنجیروں کو دیکھ نہیں پاتے کہ کس طرح ان زنجیروں نے ہمیں جکڑ رکھا ہے۔ رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد اس کی تمام کافرانہ ادائیں نگاہوں کے سامنے گھومتی رہتی تھیں اور میری آنکھوں سے نیندیں اڑاتی رہتی تھیں۔ کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں اسے تصور میں نہیں' سچ مچ آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں اور اس کی رس بھری باتیں سن رہا ہوں۔

پھر میں نے اس کی گنگناہٹ سنی اس ترنم کے ساتھ ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں ہر سمت نظریں دوڑانے لگا وہ نہیں تھی مگر گنگناتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی اور یہ آواز باہر سے آ رہی تھی۔

میں بستر سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ گنگناہٹ واضح طور سے سنائی دی۔
میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ کوٹھی کی چھت پر تھی۔ بڑی اداؤں سے زینے کے ایک ایک پائیدان پر قدم تھم تھم کر رکھ رہی تھی۔ نیچے اتر کر کوٹھی میں جانا چاہتی تھی۔ میں زینے کے قریب آیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی گنگناہٹ تھم گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ مجھ سے کترا کر جانا چاہتی تھی' میں نے اس کے گداز بازو کو پکڑ لیا۔ وہ بولی۔ "چھوڑ مجھے۔ میں تیری کوئی نہیں لگتی ہوں۔"

میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ اسے کئی بار چھوڑ کر آزما لیا تھا کہ سانس رکنے لگتی تھی۔ اس کے بغیر سکون غارت ہو جاتا تھا۔ اس لئے میں نے اس غارت گر کو نہیں چھوڑا۔ وہ خود کو ایسے چھڑا رہی تھی کہ خود کو حوالے بھی کرتی جا رہی تھی۔ ایسی ادائیں اور دیوانہ بنا دیتی ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ دیوانگی بڑھ رہی ہے تو ایک دم سے بلند آواز میں بولی۔ "جی ہاں۔ بیگم ماں آ رہی ہوں۔ بس ابھی آ رہی ہوں۔"

میں گھبرا کر ایسے الگ ہو گیا جیسے بیگم صاحبہ کی کوئی چیز چرا رہا تھا اور وہ عین وقت پر پکڑنے آ گئی ہوں۔ وہ ہنستی ہوئی' بھاگتی ہوئی کچن کے پچھلے دروازے کو کھول کر کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہوش آیا کہ بیگم صاحبہ نے اسے آواز نہیں دی تھی لیکن وہ اپنی بھری بہار سے مجھے دور رکھنے کے لئے ایسی چال چل گئی تھی۔

ایسی چنچل محبوبہ نے میری عقل کو گھٹا دیا تھا اور دیوانگی کو بڑھا دیا تھا۔ میں نے دوسرے دن کچن میں کام کرنے کے دوران کہا۔ "میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھ سے شادی کر لے۔"

"کیسے کروں؟ تو شادی سے پہلے خود غرضی دکھاتا ہے۔ مجھے میری بیگم ماں سے الگ کر دینا چاہتا ہے۔"

"تو نہیں سمجھتی۔ یہاں ہمارا گزارہ نہیں ہو گا۔ بیگم صاحبہ کو صرف میں چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں۔ اس کی سگی بیٹی اور بیٹا بھی ان سے پیچھا چھڑا کر لندن چلے گئے ہیں۔ صرف ایک صاحب ہی ان کے ساتھ گزارہ کر رہے ہیں۔ پتا نہیں کیا بات ہے کہ وہ بیوی کو نہیں چھوڑتے؟"

"جب شادی کرے گا' تب پتا چلے گا کہ عورت کا مارا تمام دن مارا مارا پھرتا ہے؟

رات ہوتے ہی پھر عورت کے پاس چلا آتا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں تسلیم کیا۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ جب رات کو کوارٹر میں جا کر بستر پر آرام سے لیٹ جاتا تھا تو میرے بستر پر نور ہی نور پھیل جاتا تھا اور میں جاگتے خیالوں میں اور سوتے خوابوں میں نوری کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

ہماری گفتگو ادھوری رہ گئی۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کسی بات پر جھگڑا کر رہے تھے۔ ہم نے کچن سے باہر آ کر زینے کے اوپر والے کمرے کی طرف دیکھا۔ ادھر صاحب اور بیگم صاحبہ کا بیڈ روم تھا۔ نوری نے کہا۔ "آج بیگم ماں کا موڈ صبح ہی سے خراب ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ جب سے پیدا ہوئی ہیں' تب سے خراب ہے۔"

وہ مجھے میٹھی ناراضگی سے دیکھ کر بولی۔ "تجھے تو میری ماں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ جا' جا کر دادا جان کو ناشتہ دے۔ وہ بھوک سے بلبلا رہے ہوں گے۔"

میں نے کچن میں آ کر ایک ٹرے میں رات کا بچا ہوا سالن اور روٹیاں رکھیں پھر کچن کے پچھلے دروازے سے نکل کر اسٹور روم میں آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔ بیچارے بھوکے تھے۔ میں نے ان کے آگے بستر پر ٹرے رکھی تو وہ بسم اللہ کہہ کر جلدی سے کھانے لگے۔

میں نے کہا۔ "بڑے صاحب! آج صبح سے بجلی کوند رہی ہے۔"

انہوں نے پوچھا۔ "بادل بھی گرج رہا ہے یا نہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ تو جانتے ہیں۔ بادل صاحب گرجتے ہیں' برستے نہیں ہیں۔"

انہوں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "اس گھر میں دولت کی کمی نہیں مگر محبت اور سکون کی کمی رہتی ہے۔ دراصل عورت مطمئن نہیں ہوتی۔ میرا بیٹا پوری طرح اس کی مٹھی میں ہے پھر بھی وہ ڈرتی ہے کہ میں بیٹے کو اس سے چھین لوں گا۔"

ہم باتیں کرتے رہے پھر میں خالی پلیٹیں ٹرے میں رکھ کر اسٹور روم سے باہر آیا ادھر بیگم صاحبہ کچن کے پچھلے دروازے سے نکل کر غصے سے تنتناتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ آندھی کی طرح میرے قریب سے گزرتی ہوئی' اسٹور روم کے اندر گئیں پھر ایک دم سے بھڑک کر بولیں۔ "پتا نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں تمہارے ذلیل خاندان میں بیاہ کر آئی تھی۔ تمہاری پوتی جسے

میں نے جنم دیا اور جو لندن میں کسی انگریز سے شادی کرچکی ہے' وہ تمہارے بیٹے کا خون ہے اور تمہارا پوتا' جو نشہ کرتا ہے اور لندن کی چھوکریوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہتا ہے' وہ بھی تمہارے بیٹے کا خون ہے اور تمہارا بیٹا' جو میرا شوہر ہے اور جس کے ذلیل اور بے حیا بچوں کو میں نے پیدا کیا ہے' وہ بھی اپنے جوان بچوں کی طرح اس بڑھاپے میں جوان چھوکریوں کے ساتھ منہ کالا کرتا ہے۔"

دادا جان نے تھرتھراتے ہوئے پوچھا۔ "یہ.......... یہ تم کیا کہہ رہی ہو بہو؟"

"خبردار! مجھے بہو نہ کہنا۔ پتا نہیں' تم نے بھی جوانی میں کتنی بدمعاشیاں کی ہوں گی۔ تمہارے باپ دادا نے بھی کتنی بے حیائی اور بے غیرتی دکھائی ہوگی۔ وہ گندہ خون نسل در نسل چلتا ہوا میرے بچوں تک پہنچا ہے۔ میں تو بالکل لٹ گئی۔ میں نے اس خاندان میں دولت کمائی ہے اور عزت گنوائی ہے۔ میرے بچوں کے لئے بھی دولت کی کمی نہیں ہے لیکن وہ دربدر ہوگئے ہیں۔"

وہ بول رہی تھیں اور ہانپ رہی تھیں پھر وہ بولیں۔ "بڑے میاں! اگر تم پیدا ہوتے ہی مرجاتے اور اپنے خون سے میرا شوہر بننے والا بیٹا پیدا نہ کرتے تو میں اس ذلیل خاندان میں بہو بن کر نہ آتی۔ یہ جتنی تباہیاں میرے نصیب میں آئی ہیں' اس کے ذے دار تم ہو۔ بڈھے تم ہو۔"

دادا جان نے کہا۔ "مجھ پر جس قدر کیچڑ اچھالنا چاہو' اچھالو مگر میرے بیٹے اور پوتے پوتی کا کردار یوں نہ بگاڑو۔ وہ دونوں معصوم بچے لندن میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔"

وہ پھر بھڑک کر بولیں۔ "کتوں کو گھی ہضم نہیں ہوتا۔ اسی طرح کم ظرف کو دولت ہضم نہیں ہوتی۔ تمہیں کیا پتا ہے کہ وہ لندن میں کس طرح دولت لٹا رہے ہیں۔ میں نے اور تمہارے بیٹے نے خاندان والوں سے اب تک اپنے بیٹے اور بیٹی کے کرتوت چھپائے ہیں۔ میں اس لئے چھپا رہی ہوں کہ آخر ماں ہوں۔ اپنی اولاد کی بدنامی کبھی نہیں چاہوں گی لیکن تمہارے بیٹے کو نہیں چھوڑوں گی۔ ان تصویروں کے ذریعے اسے بدنام بھی کروں گی اور عدالت سے سزا بھی دلاؤں گی۔"

بیگم صاحبہ نے یہ کہہ کر دو پوسٹ کارڈ سائز کی تصویریں سسر کی طرف پھینکیں۔ انہوں نے ایک تصویر کو اٹھا کر دیکھا پھر لاحول پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں' تصویر کو

بستر پر پھینک دیا۔

وہ تڑخ کر بولیں۔ "آنکھیں کیوں بند کررہے ہو۔ دیدے پھاڑ کر دیکھو۔ تمہارے بیٹے کا یہ شرمناک کارنامہ بھری عدالت میں دکھایا جائے گا پھر اسے کوڑے مارنے کی سزا دی جائے گی۔"

دادا جان لرز گئے۔ دونوں ہاتھ انکار کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولے۔ "نہیں۔ نہیں بہو نہیں۔ میرا بیٹا انسان ہے۔ اس سے یہ غلطی ہوگئی ہے۔ ان تصویروں کو جلادو۔ وہ تمہارا شوہر ہی نہیں ہے' تمہارا مزدور بھی ہے۔ دن رات محنت کرکے تمہارے اور بچوں کے لئے دولت کماتا ہے۔"

وہ بولیں۔ "بڑے میاں! دولت بہت حاصل ہوچکی ہے۔ ہماری اگلی کئی نسلیں اس دولت سے عیش کریں گی۔ جب تمہارے بیٹے کو سنگسار کئے جانے کی سزا ملے گی تو اس کی موت کے بعد تمام دولت اور تمام جائیداد میرے اور بچوں کے حصے میں آئے گی۔"

وہ فوراً ہی بستر سے اتر کر بہو کے قدموں میں جھکنے آئے' بہو پیچھے ہٹ کر بولی۔ "خبردار' مجھ سے دور رہو۔"

وہ دونوں لرزتے ہوئے ہاتھوں کو جوڑ کر بولے۔ "میں نے تمہیں اور پوتے پوتی کو خوش دیکھنے کے لئے کبھی اس گھر سے اور بیٹے کی کمائی سے اپنا حق نہیں مانگا۔ آج تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنے بیٹے کے لئے نیک نامی کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ اس نے تم سب کے لئے بڑی عزت اور شہرت کمائی ہے۔ اسے عدالت میں پہنچا کر بدنام نہ کرو۔ خدا کے لئے غصہ تھوک دو۔ مجھ پر تھوک دو۔ مگر بسے بسائے گھر کو نہ اجاڑو۔ تم نے میرے بیٹے سے جتنی دولت حاصل کی ہے وہ تمہیں مبارک ہو۔ اس کے بدلے میرے بیٹے کو معاف کردو۔ اسے اپنا سہاگ سمجھو یا نہ سمجھو۔ ایک پھٹا ہوا آنچل ہی سمجھ کر اسے اپنے سر پر رہنے دو۔"

وہ ذرا پرے ہوگئیں پھر بولیں۔ "میں جانتی تھی تم بیٹے کے لئے گڑگڑاؤ گے۔ اسے سزا سے بچانے کے لئے میرے قدموں میں گر پڑو گے لیکن معافی اتنی آسانی سے نہیں مل جاتی۔ اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔"

"بے شک' میرے بیٹے سے جو چاہو گی' وہ تمہیں دے گا۔ مجھے جیسی قربانی کا حکم

دو گی' میں انکار نہیں کروں گا۔"

"تمہارے بیٹے سے میں نے معاملہ طے کرلیا ہے۔ وہ اپنی عزت رکھنے اور اس گھر کو تباہی سے بچانے کے لئے تمہاری قربانی دینے کو تیار ہے' بہت معمولی سی قربانی ہے۔ تم یہ گھر چھوڑ کر' یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تمہارے جانے کے بعد میں ایسی تمام شرمناک تصویروں کو جلا دوں گی۔ اس کے بعد تمہارا بیٹا ہمیشہ کی طرح معزز کہلائے گا۔"

وہ فرش پر سے اٹھ کر کھڑے ہوئے پھر ڈگمگا کر بستر پر گر پڑے۔ اندر سے بالکل خالی ہوگئے تھے۔ جسم میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ بہو نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ یہاں سے جاتے ہوئے جان نکل رہی ہے۔"

وہ بیمار سی آواز میں بولے۔ "نن.......... نہیں۔ میں تو جاؤں گا' ضرور جاؤں گا۔ تم نے میرے بیٹے کو بہت سستا چھوڑ دیا ہے۔ میں.......... میں ابھی اپنا بوریا بستر باندھ کر جارہا ہوں۔"

بیگم صاحبہ اسٹور روم سے باہر آگئیں۔ مجھے دیکھ کر بولیں۔ "یہاں کھڑے کیا کررہے ہو؟ جاؤ میرے لئے گرم چائے لے آؤ۔ میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔"

میں دادا جان.......... کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن گرم چائے لانے کا حکم سن کر کچن میں جانا پڑا۔ بیگم صاحبہ میرے پیچھے آئیں پھر کچن سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئیں۔ مجھے اس عورت پر بہت غصہ آرہا تھا۔ بچے اس کے گمراہ ہوئے تھے اور کوئی شرمناک غلطی صاحب نے کی تھی لیکن سزا دادا جان کو دی جارہی تھی۔

میں نے ایک ٹرے میں قہوے کی کیتلی' شوگر پاٹ' ملک پاٹ' اور خالی کپ طشتری رکھی پھر ٹرے اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ بیگم صاحبہ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ نوری صوفے کے پیچھے کھڑی ان کا سر دبا رہی تھی۔ میں نے ان کے آگے سینٹر ٹیبل پر ٹرے رکھ دی۔ انہوں نے کپ میں کیتلی سے قہوہ لیا۔ اس میں دودھ ملایا پھر چائے میں چمچ ہلا کر پیالی اٹھائی۔ انسان بہت زیادہ پریشانی میں یا بہت زیادہ خوشی میں غلط کام کرتا ہے۔ غصہ اور پریشانی تو انہوں نے خود مول لے رکھی تھی اور دادا جان کے چلے جانے کی بے انتہا خوشی بھی تھی۔ ایسے میں وہ شوگر پاٹ سے چینی لینا بھول گئیں۔ ایک گھونٹ پیتے ہی پھر دماغ میں گرمی چڑھ گئی۔ وہ چیخ کر بولیں۔ "کتے! کام

چور! چائے میں کیا تمہارا باپ چینی ملائے گا۔"

یہ کہتے ہی انہوں نے پیالی میری طرف پھینکی۔ وہ میرے سینے سے آکر ٹکرائی۔ گرم گرم چائے میری قمیض اور میرے جسم کی کھال میں اترتی چلی گئی۔ میں ایک دم سے بھنا گیا۔ ٹھیک ہے کہ میں ایک معمولی نوکر ہوں لیکن معمولی کا مطلب بالکل ہی گیا گزرا نہیں کہ جب چاہا اسے جوتے مار دو۔

میں نے گرج کر کہا۔ "چینی تمہارے سامنے رکھی ہے۔ تم نے دودھ ملایا' چینی نہیں ملائی اور غصہ مجھے دکھا رہی ہو۔ میں صرف ملازم ہی نہیں' ایک مرد بھی ہوں۔ اس طرح گرم چائے پھینکنے کے جواب میں بہت کچھ کرسکتا ہوں مگر نوکر' نوکر ہی رہتا ہے۔ جواباً گالیاں دے سکتا ہے نہ ہاتھ اٹھا سکتا ہے.........."

نوری دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی پھر مجھے دھکیلتی ہوئی دروازے کی طرف لے جاتی ہوئی بولی۔ "تجھے میری قسم ہے۔ بیگم ماں سے گستاخی نہ کرنا۔ میری بیگم ماں کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔ چپ ہوجا۔ خدا کے لئے آگے کچھ نہ کہنا۔ ابھی یہاں سے چلا جا۔"

میں خود جانا چاہتا تھا اس لئے دروازے کے پاس آکر بولا۔ "جارہا ہوں۔ ہمیشہ کے لئے جارہا ہوں۔ اب اس دروازے پر تھوکنے بھی نہیں آؤں گا۔"

میں نے جھٹکا دے کر نوری کو الگ کیا پھر دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ کوئی میری ذات برادری والی عورت یا مرد میرے ساتھ ایسا سلوک کرتا تو میں منہ توڑ جواب بھی دیتا اور منہ بھی توڑ دیتا' اچھا ہوا کہ نوری آڑے آگئی تھی۔ اگر میرا ہاتھ اٹھ جاتا تو بڑے لوگ الٹا مجھے ہی پولیس کیس میں پھنسا دیتے۔

میں نے اسٹور روم کے دروازے پر آکر دیکھا۔ دادا جان نے ایک میلا سا بستر باندھ لیا تھا اور ٹین کے ایک چھوٹے سے صندوق میں تالا لگا کر جانے والے تھے۔ میں نے مخاطب کیا تو انہوں نے گھور کر دیکھا۔ وہ کمزوری سے تھرتھرا رہے تھے اور رہ رہ کر کھانس رہے تھے۔ میں نے چائے سے بھیگی ہوئی قمیض دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے۔ یہ بڑے لوگ ہم سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ آپ مجھے یہاں سے جانے سے کئی بار روک چکے ہیں۔ آج تو رکنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ آپ بھی جارہے ہیں۔"

انہوں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "آہ! سوچا تھا آخری سانس تک رہوں گا۔ جیسے بھی رہوں گا' بیٹے کے قریب ہی رہوں گا مگر افسوس.........."

"دادا جان! افسوس نہ کریں۔ بس تھوڑی دیر انتظار کریں۔ میں اپنا سامان لے کر آتا ہوں۔ میں آپ کو سہارا دے کر یہاں سے لے جاؤں گا۔"

میں تیزی سے پلٹ کر اپنے کوارٹر میں آیا اور ایک چھوٹی سی اٹیچی میں اپنے کپڑے اور دوسرا تمام ضروری سامان رکھنے لگا۔ میں جانتا تھا' میرے جانے کے بعد وہ گھریلو ملازم کے لئے اشتہار شائع کرائیں گے۔ مختلف ذرائع سے ملازم تلاش کریں گے لیکن تین ملازموں کا کام تنہا کرنے والا بندہ مشکل ہی سے ملے گا اور جب تک نہیں ملے گا' گھر کا سارا بوجھ نوری پر پڑے گا۔

میں نے جانے کے لئے سامان اٹھایا تو دیکھا' دروازے پر نوری کھڑی تھی۔ ہم چند لمحوں تک خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر وہ اندر آکر سنجیدگی سے بولی۔ "کیا مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا؟"

"ہاں جاؤں گا لیکن جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تجھے چھوڑ رہا ہوں۔ ہم اس کوٹھی کے باہر مل سکتے ہیں۔"

"کیسے مل سکتے ہیں؟ ایک بیٹی اپنی ماں کو دھوکا دے کر کب تک ملنے آئے گی۔ جس نے مجھے بیٹی بنایا' اس کوٹھی میں ایک بیٹی کی طرح رہنے' کھانے' پینے اور پہننے کی آزادی دی' جس نے اپنی سگی بیٹی کا دیا ہوا زخم بھرنے کے لئے مجھے مرہم بنایا ہے تو کیا میں اس ماں کے لئے دوانہ بنوں؟"

"تو پھر دوا بنتی رہ۔ میرے راستے سے ہٹ جا۔ مجھے جانے دے۔"

وہ دروازے کے پاس کھڑی رہی۔ اس نے سونے کی پتلی سی زنجیر کو ایک چٹکی سے پکڑا' پھر اسے آہستہ آہستہ کھینچنے لگی۔ گریبان کی گہرائی میں اچھے اچھے ڈوب گئے' اس گہرائی سے لاکٹ باہر آیا۔ وہ لاکٹ کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر میرے قریب آکر بولی۔

"مجھے چھوڑ کر جانے سے پہلے اس لاکٹ سے اپنی تصویر نوچ کر پھینک دے لیکن یہ سمجھ لینا اس لاکٹ میں رہنے والی یادوں کو نوچ کر نہیں پھینک سکے گا۔"

میری تصویر چوبیس گھنٹے اس دل کی دھڑکنوں سے لگی رہتی تھی۔ یہ ایسی محبت تھی جسے کوئی دشمن نوچ کر نہیں پھینک سکتا تھا پھر میں محبوب تھا۔ وہ میرے اور قریب آئی پھر میری قمیض کے بٹن کھولتی ہوئی بولی۔ "غصے میں جا رہا ہے اور قمیض پر چائے کے دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ چل اسے اتار۔ میں ابھی اسے دھو کر دھبے دور کروں

گی۔"

مجھے احساس ہوا کہ میں لباس تبدیل کئے بغیر جا رہا تھا۔ میں سر جھکا کر قمیض اتارنے لگا۔ ایسے وقت اس نے پلٹ کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

دروازہ اس لئے بند ہوتا ہے کہ باہر سے کوئی نہ آئے۔ یا پھر گھر کا آدمی باہر نہ جاسکے۔

دنیا کے تمام پولیس والے مجرموں کو قید کرنے کے لئے باہر سے تالا لگاتے ہیں لیکن عورت باہر سے تالا نہیں لگاتی۔ اندر سے گرفتاری جاری رکھتی ہے۔

اس کوٹھی میں جتنے دروازے تھے' سب کے تالے اور چابیاں بیگم صاحبہ کے پاس تھیں۔ صرف ایک سرونٹ کوارٹر کے دروازے کا تالا نہیں تھا۔ میں کسی وقت بھی نوکری چھوڑ کر دروازہ کھول کر جاسکتا تھا۔ وہ مغرور بیگم صاحبہ مجھے نہیں روک سکتی تھیں۔

مگر روک لیا تھا۔ بہت عرصہ بعد اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ نوری کو بیٹی بنا کر نہیں' میرے لئے تالا بنا کر لائی تھیں۔

چالیس چوروں کا دروازہ "کھل جا سم سم" کہنے سے کھلتا تھا میرے کوارٹر کا دروازہ بیگم صاحبہ کی بیٹی کے لئے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ اب سارا چکر سمجھ میں آگیا تھا۔

ایک دروازہ حمام کا ہوتا ہے' جس کے پیچھے سب ننگے ہوتے ہیں۔ ننگی خود غرضی اس انتہا کو پہنچتی ہے کہ اپنی سگی بیٹی کسی انگریز کے حمام میں جاتی ہے اور منہ بولی بیٹی کو وقتِ ضرورت ملازم کے حمام میں پہنچایا جاتا ہے۔

دیر ہوگئی۔ بہت دیر ہوگئی۔ میں نے دادا جان سے کہا تھا' میرا انتظار کریں۔ وہ تنہا نہیں جائیں گے۔ میں انہیں سہارا دے کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

میں نے سر گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا پھر نوری سے الگ ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی بیٹھتے ہوئے اپنی زلفوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "وہ.......... وہ دادا جان؟ میں نے ان سے کہا تھا کہ.........."

میں بات ادھوری چھوڑ کر بستر سے اتر کر کھڑکی کے پاس آیا پھر اس کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ سامنے کچھ فاصلے پر اسٹور روم کا کھلا ہوا دروازہ نظر آرہا تھا۔ وہ

انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئے تھے۔ اسٹور روم کی چوکھٹ پکڑ کر تھرتھراتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔ بستر کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھ رہے تھے اور ٹین کے۔ چھوٹے سے صندوق کے ہینڈل کو پکڑ کر اٹھا رہے تھے۔

میں جو کچھ دیکھ رہا تھا' صاحب بھی وہی منظر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے دیکھ رہے ہوں گے اور روٹھی ہوئی بیگم صاحبہ کو آغوش میں لئے منا رہے ہوں گے۔

کھڑکی صاحب کی ہو یا' نوکر کی' باہر کا منظر ایک ہوتا ہے۔ اس منظر میں ایک بوڑھا اپنا سامان اٹھائے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے جا رہا تھا۔ اس کا سارا وجود پھٹی ہوئی پتنگ کے کاغذ کی طرح ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

میرے اندر ایک ذرا سی تڑپ پیدا ہوئی پھر ختم ہو گئی۔ نوری پیچھے سے آ کر یوں لگ گئی تھی جیسے موٹر سائیکل پر بیٹھنے والی اپنے سوار ساتھی سے لگ جاتی ہے اور اپنے سینے کی تمام دھڑکنوں کو اپنے ساتھی میں منتقل کرتی رہتی ہے۔

الوداع دادا جان! آپ کی شرافت اور تہذیب کا دور گزر چکا۔ جو لوگ اپنے دور کے ساتھ نہیں چلتے' وہ اسی طرح اپنی زندہ میت اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

☆======☆======☆

چاندرات کا اجنبی

ان فریب خوردہ کتوں کا شرمناک فسانہ جو اپنی اصلیت پر پردہ ڈال کر ہنس کی چال چلنے لگے تھے۔

بیگم شباب کے مرحوم خاوند کا نام کچھ اور رہا ہو گا مگر وہ شباب دہلوی کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے مرتے وقت اپنی بیگم کے لئے ایک خوبصورت سی کوٹھی اور چند دکانوں کی معقول آمدنی چھوڑی تھی لیکن جو سب سے خوبصورت چیز وہ چھوڑ گئے تھے، ان کا نام تھا۔ شباب!

وہ اپنے خاوند کے اس نام کو بے حد عزیز رکھتی تھیں، دکانوں سے وصول ہونے والی آمدنی کا ایک بڑا حصہ انہوں نے اس نام کی حفاظت اور سلامتی کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اسی لئے وہ چالیس برس کی عمر میں بھی پچیس برس کی جوان بیوہ دکھائی دیتی تھیں۔ انہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، وہ پچیس برس سے آگے نہیں بڑھیں گی۔ مرحوم شباب دہلوی کے نام نے انہیں بڑا سہارا دیا تھا۔

صباحت اپنی سہیلی رضوانہ کے ساتھ پہلی بار بیگم شباب کے ہاں آئی تو ڈرائنگ روم میں اس وقت رمی کے لئے تاش کی دو گڈیاں پھینٹی جا رہی تھیں۔ وہاں کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اور دو چار بوڑھے ہنستے بولتے نظر آ رہے تھے۔ رضوانہ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے دہلیز پر ٹھٹک گئی اور صباحت کے بازو کو تھام کر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"صابی! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تمہاری عمر کیا ہے؟"

"پچیسواں سال ہے۔"

"مائی گڈنس! تم کتنی آسانی سے سچی بات کہہ جاتی ہو۔ دیکھو ہر جگہ سچائی سے کام نہیں چلتا۔ آج سے تم سولہ برس کی ہو۔"

صباحت حیرانی سے تقریباً چیخ پڑی۔

"سولہ برس!"

اس کی آواز سن کر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے افراد نے ان کی جانب دیکھا۔

بیگم شباب چہک کر بولیں۔

"ہے یو رضوانہ! وہاں کیا کر رہی ہو؟ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟"

"ایک نئی رنگروٹ ہے۔" رضوانہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "نئے ماحول میں آتے ہوئے ہچکچا رہی ہے۔" بیگم شباب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہ نو۔ وی آر جسٹ فرینڈز ہیئر۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں استقبال کے لئے پہلے ہی دروازے پر پہنچ جاتی.........."

وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگیں۔ رضوانہ صباحت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی۔

"شبو۔ اس سے ملو۔ یہ میری بڑی پیاری سہیلی صباحت افروز ہے۔"

بیگم شباب نوجوانوں کے حلقہ میں شبو کہلاتی تھیں۔ نام سمٹ کر مختصر ہو جائے تو یوں لگتا ہے جیسے عمر بھی کم ہو گئی ہے۔ لڑکے یا لڑکیاں انہیں شبو کہہ کر مخاطب کرتیں تو وہ بلاشبہ خود کو ان کی ہم عمر سہیلی اور ہمجولی سمجھ کر خوش ہو جایا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے خوش ہو کر صباحت سے مصافحہ کرتے ہوئے رضوانہ سے کہا۔

"تمہاری سہیلی واقعی پیاری پیاری سی گڑیا لگتی ہے۔ ایسی نازک سی گڑیا کہ صباحت نہیں صبیحہ کہنا چاہئے یا پھر اس سے بھی مختصر ہلکا پھلکا سا نام ہونا چاہئے۔ ایزیو نو، نام مختصر ہو تو مخاطب کرتے وقت کافی وقت کی بچت ہوتی ہے۔ کسی بھی معاملے میں بچت کرنا ہم عورتوں کا اولین فرض ہے۔"

صباحت نے مسکرا کر کہا۔

"آپ مجھے صابی یا صبو کہہ لیں۔ مجھے اعتراض نہ ہو گا بلکہ خوشی ہو گی۔ اگر میرے نام کی ادائیگی سے وقت کی بچت ہو جائے۔"

بیگم شباب نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کے انداز میں کہا۔

"تم مجھے آپ نہ کہو۔ یہاں ہم سب کی عمر ایک ہے۔ حیثیت ایک ہے اور مزاج ایک ہے۔ لہٰذا یہاں "آپ" والا تکلف گراں گذرتا ہے۔ وی ہیو ٹو بی فری اینڈ فرینک۔ تم یہاں ہم سب کو تم کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔ یو فولو می؟"

"جی ہاں!" صباحت بدستور مسکرا کر بولی۔ "مجھے تم سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی ہو رہا ہے کہ تم جوانی میں بیوہ ہو گئی ہو۔"

صباحت یہ آخری فقرہ رضوانہ سے سیکھ کر آئی تھی۔ بیگم شباب پر اس فقرہ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر ڈرامائی انداز میں بولی۔ "آہ میرے نصیب! میں نہیں جانتی تھی کہ سہاگن کیا ہوتی ہے۔ ایک ذرا دیر کو سہاگ کا سپنا دیکھا تھا' جب آنکھ کھلی تو میں بیوہ ہو چکی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ورنہ لوگ مجھے بوڑھی سمجھنے لگتے۔"

رضوانہ نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"تمہیں بوڑھی کہنے والا عقل کا اندھا ہوگا۔ ویسے کہنے والوں کی زبان کون پکڑتا ہے۔ اب یہی دیکھو نا۔ پرانے زمانے کی بوڑھیاں اپنی صباحت کو دیکھ کر کہتی ہیں کہ اس کی عمر کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔ حالانکہ بیچاری سولہ سال کی ہے............"

"ہاؤ سویٹ۔ سویٹ سکسٹین!" چند لڑکے یوں قریب آنے لگے جیسے مٹھاس پر مکھیاں آتی ہیں۔

"میٹھا برس ہے!" ایک بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔

صباحت اس جھوٹ پر کچھ نروس ہوگئی تھی کہ شاید لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں پھر اسے یقین ہوگیا کہ سب ہی سنجیدہ ہیں۔ پوری سچائی سے وہ تعریفیں کر رہے ہیں اور اسے میٹھی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ کچھ مسکراتی' کچھ شرماتی اور اتنی ساری نظروں سے بچنے کے لئے ذرا سمٹ کر رضوانہ کے قریب ہوگئی۔ رضوانہ نے کہا۔

"اس کے ڈیڈی امریکہ میں ہیں اور بڑا بھائی مسقط میں الیکٹریکل انجینئر ہے۔ یہ بھی کچھ عرصے کے بعد یہ ملک چھوڑ دے گی۔ ابھی کنفرم نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے ہماری سوسائٹی سے اتنی دلچسپی پیدا ہو جائے کہ یہ ملک سے باہر جانے کا خیال چھوڑ دے اسی لئے میں اسے یہاں لے آئی ہوں۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔" بیگم شباب نے کہا۔ "ہم صباحت کا دل جیتنے کی کوشش کریں گے۔"

"ہاں۔ اگر صباحت نے دل تک پہنچنے کا موقعہ دیا تو............" ایک نوجوان نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

صباحت نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ بھی بڑی اپنائیت سے اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ جھینپ کر دوسری جانب دیکھنے لگی بیگم شباب نے کہا۔

"صباحت اس سے ملو۔ یہ فرید کامرانی ہے۔ بہت شریر ہے۔ یہ اس شہر کے ہر دولتمند کی تجوری کا راز جانتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ انکم ٹیکس کے محکمے میں انسپکٹر ہے۔ کچھ لڑکیوں کا خیال ہے کہ یہ صرف آہنی تجوریوں کو دیکھتا ہے۔ کسی کے دل کی تجوری میں جھانکنا نہیں جانتا۔ اسے کون بتائے کہ وہاں عورت کی محبت کا کتنا خزانہ چھپا ہوتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو شبو!" فرید نے کہا۔ "میری کمزوری یہ ہے کہ میں بہت سی باتیں بھول جاتا ہوں۔ اب یہی دیکھو ناں۔ جب سے صباحت آئی ہیں میں یہی سوچ رہا ہوں کہ انہیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اتنی دیر تک سوچنے کے بعد اب یاد آیا کہ میں نے انہیں کہاں دیکھا؟"

"آں!" صباحت نے بے اختیار پوچھا۔ "کہاں دیکھا ہے؟"

وہ ذرا آگے کو جھک کر بولا۔

"یہ سب کے سامنے کہنے کی بات نہیں ہے۔"

تمام لڑکیوں کے کان کھڑے ہوگئے۔

"کہاں دیکھا ہے۔ بتاؤ؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"یہاں رازداری منع ہے۔" بیگم شباب نے کہا۔ "چلو جلدی بتاؤ کہاں دیکھا ہے؟"

"شبو!" فرید نے کہا۔ "صباحت پہلی بار یہاں آئی ہیں میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا میں نے انہیں ایسی جگہ دیکھا ہے کہ............"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سننے والوں کا تجسس اور بڑھ گیا۔ صباحت پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی کہ نہ جانے اس کمبخت نے اسے کہاں دیکھا لیا ہے؟ وہ جس اونچی سطح پر کھڑی ہے اگر فرید نے اس سطح سے نیچے اسے دیکھا ہے تو سب کے سامنے بڑی سبکی ہوگی۔

رضوانہ نے جھپٹ کر فرید کا بازو پکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑتی ہوئی بولی

"یہ تمہاری بہت بری عادت ہے۔ ہمیشہ بات ادھوری چھوڑ کر لڑکیوں کو اختلاج میں مبتلا کر دیتے ہو۔ بتاؤ کیا تم نے میری سہیلی کو کہیں چوری کرتے دیکھا ہے؟"

"توبہ توبہ!" اس نے اپنے گال پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں اور صباحت کو

چور کہوں؟ توبہ توبہ میں تو خود صباحت کے ساتھ وہاں موجود تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" صباحت چیخ پڑی۔ "میں نے آج سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" فرید نے کہا۔ "یاد کرو۔ کچھ عرصے پہلے ہم شاداب پہاڑیوں کے دامن میں تھے۔ ہمارے سامنے ایک پہاڑی کی بلندی پر ایک نہایت ہی شاندار محل نما کوٹھی تھی۔"

صباحت اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور وہ بلندی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔

"ہم اس کوٹھی تک پہنچنے کے لئے اونچائی پر چڑھ رہے تھے اور راستہ نہایت ہی دشوار گذار تھا۔ ہم ابھری ہوئی چٹانوں پر قدم جما کر اوپر اور اوپر جانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ ایک بار تمہارا پاؤں پھسل گیا لیکن میں نے تمہیں تھام لیا۔

"ہر انسان اونچی منزل کی طرف اڑنا چاہتا ہے۔ میں نے تمہیں سمجھایا کہ ہم جس مقام پر ہیں' ہمیں وہیں اپنی جنت بنا لینا چاہئے۔ زیادہ اونچائی پر ہمیشہ گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ مگر تم ضد کر رہی تھیں اور میں تمہاری ضد سے مجبور ہو کر تمہارا ساتھ دے رہا تھا۔

"پھر اچانک ہی ہم دونوں کے قدم ایک ساتھ ڈگمگا گئے اور ہم بلندی سے لڑھکتے ہوئے نیچے گہری کھائی میں چلے گئے۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی..........."

اس کا آخری فقرہ سنتے ہی قہقہوں کا طوفان آ گیا۔ مردوں کے بے ہنگم قہقہوں میں عورتوں کی سریلی ہنسی گڈمڈ ہونے لگی۔ صباحت اطمینان کی گہری سانس لے کر فرید کو احسان مندی سے دیکھ رہی تھی۔ اس شریر نے اس کے دماغ پر ایک انجانا سا بوجھ لاد کر خود ہی اسے اتار پھینکا تھا۔ اس نے ذرا قریب ہو کر پوچھا۔

"صباحت! میرے خوابوں کی سرزمین کیسی تھی؟"

"میں کیا جانوں؟" وہ جھینپ کر بولی۔ "میں ایسی جگہ کبھی نہیں جاتی۔"

"میں بتاؤں؟ تمہیں نیند میں چلنے کی عادت ہے۔ تم اسی طرح چلتے چلتے میرے خواب میں آ گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تم وہاں آ کر بھی اس جگہ سے انجان ہو۔"

"اوہ!" صباحت کو اچانک احساس ہوا کہ فرید مذاق ہی مذاق میں رومانی طرز کی گفتگو کر رہا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اتنی جلدی بے تکلف ہونا سراسر حماقت

ہے۔ وہ فرید سے کترا کر آگے بڑھ گئی........... رضوانہ آتشدان کے قریب چلی گئی تھی اور وہاں ایک نوجوان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے صباحت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا۔

"وہاں ٹرالی پر کافی کی پیالیاں رکھی ہیں۔ بہترین کافی ہے۔ ذرا ایک چسکی لے کر دیکھو۔"

وہ ٹرالی کی طرف مڑ گئی۔ ایک لڑکی نے پیالی اٹھا کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا نام فہمیدہ ہے۔ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔ تم سے دوستی کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"شکریہ!" صباحت نے پیالی لیتے ہوئے کہا۔ "تم بھی بہت اچھی ہو تمہاری سہیلی بن کر مجھے خوشی ہو گی۔"

وہ پیالی کو ہونٹوں سے لگا کر چسکیاں لیتی ہوئی فہمیدہ کو دیکھنے لگی۔ وہ دیکھنے میں واقعی اچھی تھی۔ اسمارٹل کے سوٹ میں خوب جچ رہی تھی۔ ناک نقشہ بھی ایسا تھا کہ نگاہوں کو پکار لیتی تھی۔ اس کے مسکرانے کے انداز میں بڑی کشش تھی مگر آنکھوں میں زندہ مسرتوں کی چمک نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کہیں سے یہ مسرتیں مانگ کر لائی ہے اور یہاں سے واپس جاتے ہی وہ مانگی ہوئی چیزیں لوٹا دے گی۔

اسی وقت بیگم شباب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر تمام لوگوں کو مخاطب کیا۔

"لسن ٹومی۔ اب ہمیں پروگرام بدلنا چاہئے۔ تاش کا کھیل بعد میں ہو گا۔ باہر چاند نکل آیا ہے۔ باغ کی ہریالی میں چاندنی چٹک رہی ہے۔ پھولوں کے چہرے روشن ہو گئے ہیں۔ اب وہاں ہم بھی ایک دوسرے کے چہروں کو پہچان سکیں گے۔ کیا خیال ہے؟ اسٹرینجران دی مون لائٹ کا پروگرام شروع کیا جائے؟"

"یس۔ آف کورس!" ایک نے کہا۔

"اٹ ہیز ٹو اسٹارٹ ان نو ٹائم!" دوسرے نے خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں پہلے یہی پروگرام ہونا چاہئے۔" ایک نوجوان نے کہا۔ "ورنہ رات زیادہ ہو گی تو سردی بڑھتی جائے گی۔ میری طبیعت ناساز ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے زکام ہو جائے۔"

ایک بوڑھے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"یہ آج کل کے نوجوان ہیں۔ بھئی چاندنی رات میں کوئی حسین ساتھی مل جائے تو مجھے کبھی زکام نہیں ہوتا۔ یہ پروگرام بھی شروع ہونا چاہئے۔"

وہ سب ہنستے بولتے باہر جانے لگے۔ فہمیدہ نے کہا۔

"تم کافی پی کر باہر آؤ۔ میں ذرا نعیم سے ملنے جا رہی ہوں۔"

وہ دوسروں کے پیچھے چلی گئی۔ صباحت اس پروگرام کے متعلق اس سے کچھ نہ پوچھ سکی۔ رضوانہ اس کے پاس آئی تو اس نے پوچھا۔

"یہ اسٹرینجران دی مون لائٹ کیا بلا ہے؟"

"بلا نہیں ایک دلچسپ تفریح ہے چاندنی رات میں ہم تمام لڑکیاں باغیچے کی سیر کرتی ہیں لیکن ایک دوسرے سے الگ الگ۔ بلکہ دور دور رہتی ہیں پھر ایسے وقت کوئی اجنبی ہمارے پاس آجاتا ہے۔"

صباحت نے حیرانی سے اور کچھ ناگواری سے کہا۔

"توبہ توبہ یہ بھی کوئی تفریح ہے وہ اجنبی کون ہیں جو ان لڑکیوں سے ملنے چلے آتے ہیں؟"

"اسی حلقہ کے نوجوان اور بوڑھے ہیں جنہیں تم ابھی دیکھ چکی ہو۔ یہاں اجنبی سے مراد وہ شخص ہے جس کی توقع ہم تنہائی میں نہیں کرتیں جس کے متعلق ہم کبھی نہیں سوچتیں کہ وہ ہمارے پاس آئے گا۔ مگر وہ آجاتا ہے۔ اب سوچو کہ ایسے میں ہمارے درمیان کتنی اجنبیت ہوگی۔ ہم اخلاقاً اس سے باتیں کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ اس طرح ہمیں اخلاقی تربیت حاصل ہوتی ہے۔"

"مجھے نہیں چاہئے ایسی تربیت۔" صباحت نے کہا۔ "میں کسی اجنبی سے نہیں ملوں گی۔"

"یہ کیا کہتی ہو۔ اگر تم نے انکار کیا تو میری سبکی ہوگی۔ یہ لوگ کہیں گے کہ میں کسی بیک ورڈ لڑکی کو یہاں لے آئی ہوں۔ تمہیں اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ اس تفریح میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے سے دور رہتی ہیں پھر بھی چاندنی میں دور دور تک دوسرے ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں تنہائی کا مقصد ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے پارٹنر بدل جائیں۔ ایسے پارٹنر سے ضروری نہیں ہے کہ پیار و محبت کی باتیں کی

جائیں۔ اور بھی زندگی کے مسائل ہوتے ہیں جو باہمی تعاون سے حل ہوسکتے ہیں۔ اس تفریح کے پس پردہ بہت سے تعمیری مقاصد ہیں۔ تم کافی ختم کرکے آؤ میں باہر جا رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس تفریح میں ضرور دلچسپی لوگی۔ زندگی تاش کا ایک کھیل ہے دیکھو کہ تمہارے ہاتھ میں کون سا پتا آتا ہے۔ دیکھو کہ تمہارے راستے میں کیسا اجنبی آتا ہے............"

یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے جانے لگی۔

چاند رات کا اجنبی!

صباحت کافی کی پیالی کو تکنے لگی۔ اس کی نگاہیں کہیں تھیں اور خیال کہیں تھا۔ اسٹرینجران دی مون لائٹ بڑی رومانٹک تفریح لگ رہی تھی۔ کسی اجنبی کے ذکر سے طبیعت آپ ہی آپ یوں لہرا جاتی ہے جیسے خیالوں کی پُرسکون جھیل میں کوئی کنکر آگرا ہو۔ صباحت کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی وہ اس انوکھی تفریح میں حصہ نہیں لینا چاہتی تھی لیکن دل میں چھپی ہوئی کوئی آرزو اسے سمجھا رہی تھی کہ اسے چاند رات میں باغیچے کی سیر ضرور کرنی چاہئے۔

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ڈرائنگ روم خالی تھا۔ سب جاچکے تھے اور وہ تنہا رہ گئی تھی۔ وہ پیالی کو ٹرالی پر رکھ کر کھڑکی کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ باہر جانے سے پہلے وہ باہر کا منظر دیکھنا چاہتی تھی کہ اجنبی جوڑے کس طرح رات کی چاندنی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔

بقول بیگم شباب' باہر چاند نکل آیا تھا۔ باغ کی ہریالی میں چاندنی چٹک رہی تھی اور پھولوں کے چہرے روشن ہوگئے تھے۔ دو جوڑے مختلف سمتوں میں نظر آرہے تھے۔ دور سے ان کے چہرے واضح نہیں تھے لیکن قیاس آرائی سے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ کون ہوسکتے ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے کی نظروں میں رہ کر بھی تنہا تھے۔ وہاں بے حیا تنہائی کا تصور تک نہ تھا۔

صباحت کو صرف دو ہی جوڑے نظر آئے لیکن وہ سمجھ گئی کہ باقی جوڑے کوٹھی کے دائیں بائیں بھٹک رہے ہوں گے اور کچھ پائیں باغ میں بھی چہل قدمی کر رہے ہوں گے۔ اتنے میں ایک طرف سے بیگم شباب آتی ہوئی دکھائی دیں۔ صباحت جلدی سے کھڑکی کے پردے کے پیچھے ہوگئی۔ ان کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"نعیم! ذرا ٹھہرو۔ تم شاید فہمیدہ کو تلاش کر رہے ہو؟"

کھڑکی کے قریب ہی نعیم کی آواز آئی۔

"جی ہاں!"

"اور فہمیدہ بھی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔" بیگم شباب نے کہا۔ "لیکن یہ تفریح چاندنی رات کے کسی اجنبی کے لئے ہے۔ وہاں تمہیں نہیں بلکہ فہمیدہ کی توقع کے خلاف کسی اجنبی کو پہنچنا چاہئے۔ اسے کسی اجنبی سے ملنے دو اور تم اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ تمہارا آج اور کل شاندار نہیں ہو گا تو اس سوسائٹی میں تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔"

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر صباحت نے نعیم کی شکست خوردہ آواز سنی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں دولت کمانے کا خواب دیکھتا ہوں مگر خواب کی تعبیر تک نہیں پہنچ پاتا۔"

"کراچی بڑا ہی بندہ پرور شہر ہے۔" بیگم شباب نے کہا۔ "یہاں ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے متعلق نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اور کتنا کماتا ہے؟ یہاں کسی کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اپنے پڑوسی سے اس کا نام معلوم کر سکے۔ یہاں انسان بڑی آسانی سے اپنی غریبی کو چھپا لیتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے متعلق بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ پچھلی چاند رات کو تم نے خود ہی اگل دیا تھا کہ تمہاری آمدنی دو ہزار روپے نہیں بلکہ پانچ سو روپے ماہوار ہے۔"

"ہاں۔ بہت مجبور ہو کر میں نے بتایا ہے کہ میری تنخواہ بہت کم ہے۔ گذارہ نہیں ہوتا۔ میں روکھی سوکھی کھا کر رہ سکتا ہوں۔ اس لئے کہ گھر کی چار دیواری میں کوئی جھانکنے نہیں آتا کہ ہم کیا کھا رہے ہیں؟ مگر ہم کیا پہن رہے ہیں یہ سب دیکھتے ہیں۔

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے نیچی نظر سے دیکھے۔ لوگوں کی نظر میں اونچا رہنے کے لئے اونچی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ تم جیسے اونچے لوگوں کے ساتھ رہنے کے لئے مہنگے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ مہنگا سگریٹ پینا پڑتا ہے اور یہ پانچسو روپے سے پورا نہیں ہوتا۔ اپنی حیثیت کو بلند کرنے کے لئے میں آئے دن قرض کے بوجھ تلے دبتا جا رہا ہوں۔ میں نے تمہارے سامنے اپنی کمزوری اس لئے بیان کی ہے کہ تم کافی اثر و رسوخ

والی ہو۔ میرے لئے مزید آمدنی کا کوئی ذریعہ بنا سکتی ہو۔"

"ہاں تمہارے لئے میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ تمہیں اپنے برابر لا کر کھڑا کر سکتی ہوں۔ تم فہمیدہ کو بھول جاؤ۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ فہمیدہ کی محبت صرف جوانی کا نشہ ہے۔ احمق لوگ ایسی محبت کرتے ہیں۔ سمجھدار انسان اُدھر جاتے ہیں جدھر دولت ملتی ہے۔ دولت' جو بڑھاپے تک ساتھ دیتی ہے اور سوسائٹی میں ہمیشہ ہمارا سر اونچا رکھتی ہے۔ تمہیں فہمیدہ کو بھول کر میرے متعلق سوچنا چاہئے۔ مجھے اپنی دکانوں سے ہر ماہ دس ہزار روپے ملتے ہیں۔ یہ روپے ہم دونوں کے لئے ضرورت سے زیادہ ہیں۔ تم ایک سے ایک عمدہ سوٹ پہنو گے کاروں میں تفریح کرو گے اور اس کوٹھی کے مالک کہلاؤ گے..........."

صباحت بڑی حیرانی سے بیگم شباب کی باتیں سن رہی تھی۔ رضوانہ نے اسے بتایا کہ بیگم شباب تقریباً چالیس برس کی ہے لیکن خود کو پچیس برس کی جوان عورت ظاہر کرتی ہے۔ اور اب صباحت پردے کے پیچھے سے سن رہی تھی کہ وہ ایک نوجوان کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ نعیم پر احسان کر رہی ہے۔ اسے پستی سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے پہلے اپنا فائدہ ہر انسان دیکھتا ہے۔ وہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق نعیم کے کام آ رہی ہے۔

صباحت نے اس کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"فہمیدہ حاسد لڑکی ہے۔ ایک بار کسی سے کہہ رہی تھی کہ میری عمر زیادہ ہے۔ وہ مجھ سے جلتی ہے۔ محض اس لئے کہ میں تمہارا مستقبل سنوارنا چاہتی ہوں۔ تم میرے مرحوم خاوند کی ڈائری پڑھو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ میں کتنی کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھی۔ آہ! اب یہ پہاڑ جیسی زندگی کس کے سہارے گزاروں گی۔ میں نہیں جانتی کہ سہاگن کیا ہوتی ہے۔ میں نے ذرا دیر سہاگ کا سپنا دیکھا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو بیوہ ہو چکی تھی............"

وہ ریکارڈ کی طرح بول رہی تھی اور نعیم خاموش تھا۔ صباحت انتظار کرتی رہی

کہ شاید وہ کوئی جواب دے گا مگر وہ ایسے خاموش تھا جیسے بیگم شباب کی پیشکش پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہو۔

صباحت کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی اور دبے قدموں سے چلتی ہوئی دروازے پر آگئی۔ باہر برآمدے میں کرسمس ٹری کے پاس ایک نوجوان جوڑا مصروفِ گفتگو تھا۔ لڑکی صباحت کو دیکھ کر مسکرائی۔ صباحت بھی جواباً مسکراتی ہوئی وہاں سے گذر گئی۔

باغیچے کی کھلی فضا میں پہنچ کر وہ الجھن میں پڑ گئی کہ کہاں جائے؟ دور دور تک لڑکے اور لڑکیاں ٹہل رہے تھے۔ یا کسی درخت کے سائے میں کھڑے تھے یا کسی پتھر کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑا ہی رومان پرور ماحول تھا۔ ایسے ماحول میں کسی کے قریب سے ہو کر گذرنا معیوب سی بات تھی۔ مگر تنہا کھڑے رہنے میں بھی ایک قباحت تھی۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ اسے کسی اجنبی نوجوان نے لفٹ نہیں دی ہے۔ یہ بڑی توہین آمیز بات تھی حالانکہ وہ کسی توجہ کی محتاج نہیں تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے قریب آئے.......... اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے معمولی لڑکی سمجھے۔ ایسی لڑکی جس کے قریب کوئی بھی جانا پسند نہیں کرتا۔ عجیب الجھن تھی۔ نہ جائے رفتن' نہ پائے ماندن والی بات تھی۔

اس نے سوچا کہ وہاں پتھر کے مجسمہ کی طرح خاموش کھڑے رہنا حماقت ہے اسے پائیں باغ میں جانا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی نہ ہو۔ وہ کوٹھی کے دائیں طرف سے گذرنے لگی۔ گھاس کے ایک قطعہ میں قد آدم جھاڑیاں ایک دائرے کی صورت میں تراشی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں کے پیچھے سے فہمیدہ کا نام سن کر صباحت ٹھٹک گئی اور کان لگا کر سننے لگی کوئی کہہ رہا تھا۔

"فہمیدہ! تم میرے بڑھاپے کو نہ دیکھو۔ میں تمہیں اتنی بلندی پر پہنچا دوں گا۔ اتنی بلندی پر کہ نعیم تمہیں سر اٹھا کر دیکھے گا تو اس کی گردن ٹیڑھی ہو جائے گی۔

"دیکھو' تم اخباروں میں لکھتی ہو۔ تمہیں ہر ماہ پانچ چھ سو روپے مل جاتے ہیں۔ میں ایک ننھے سے چیک پر لکھتا ہوں تو مجھے لاکھ دو لاکھ اور دس لاکھ روپے ملتے ہیں۔ بولو کس کا قلم بھاری ہے؟"

فہمیدہ کی شکست خوردہ آواز سنائی دی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو غفار سیٹھ! یہ ہمارے والدین کی غلطی ہے کہ انہوں نے بچپن

ہی سے ہمیں چیک پر لکھنے کی اہمیت نہیں سمجھائی۔ جوانی میں ادب اور آرٹ سے دلچسپی لی تو دل میں محبت اور اس کی لطافت کا احساس پیدا ہو گیا۔ میں نے نعیم کو پسند کیا اور نعیم نے مجھے۔ ہمارے ماں باپ نے ہماری منگنی کر دی۔ یہ منگنی یا شادی ایک حماقت ہے۔ شادی کے بعد عورت میں وہ جاذبیت نہیں رہتی جو بیگم شباب اور رضوانہ جیسی اونچے طبقے کی عورتوں میں ہوتی ہے۔ ہم جیسی عورتیں محدود آمدنی میں چولہا ہانڈی سنبھالتے سنبھالتے اپنے حسن و صحت کو بھی چولہے میں جھونک دیتی ہیں۔

"میں نے نعیم سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں غیر شادی شدہ کہلانا پسند کرتی ہوں۔ میرے پاس دولت نہیں ہے۔ پھر بھی میں اپنی عزت اور اپنا مقام بنا سکتی ہوں کیونکہ میں ایک اچھوتی اور بن بیاہی لڑکی ہوں۔ ہائی سوسائٹی میں ایسی لڑکی جو ان ٹچڈ ہو' وہ ہمیشہ گفتگو کا موضوع اور توجہ کا مرکز بنی رہتی ہے۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟ تم غفار سیٹھ میری یہی خاصیت دیکھ کر مجھ سے شادی کی درخواست کر رہے ہو۔"

"ہاں!" غفار سیٹھ کی آواز آئی۔ "میں جوہری ہوں اور ہیرے کی اچھوتی چمک کو پہچانتا ہوں۔ تم میری بات پر غور کرو۔ تم کہو گی تو تمہارے لئے ایک نیا اخبار جاری کر دوں گا۔ تمہارے نام سے ایک کوٹھی خریدوں گا اور نکاح کے وقت تمہیں مہر کی رقم ایک لاکھ روپے نقد ادا کروں گا اور بولو کیا مانگتی ہو............"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر غفار سیٹھ نے فخر سے کہا۔

"اور کیا مانگو گی؟ دعا مانگو گی تب بھی اتنا نہیں ملے گا' جتنا میں تمہیں دے رہا ہوں۔

"ایک لاکھ روپے مہر کی اتنی بڑی رقم نعیم جیسا آدمی تمہیں نہیں دے سکے گا۔

"ایک اپنی کوٹھی۔ نعیم کے پاس رہنے کے لئے اپنی ایک جھگی بھی نہیں ہو گی۔

"اپنا ذاتی اخبار۔ اس اخبار کے دفتر میں تم نعیم کو ملازم رکھ سکتی ہو............"

وہ کہہ رہا تھا' یہ سن رہی تھی۔

چاند روشن تھا۔ مگر دلوں میں تاریکیاں تھیں۔ چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی لیکن راستہ کسی کو سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ صباحت اب اس ماحول کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آج کا ہر انسان خود کو اپنی سطح سے بلند ظاہر کرتا ہے۔ ہر جگہ یہی بدعت چلی ہے۔ خود نمائی کا جذبہ شدید ہو گیا ہے۔ جن کی آمدنی دو چار سو روپے

ماہوار ہے وہ بھی ریڈیو اور ٹی وی قسطوں پر اٹھا لاتے ہیں۔ تاکہ گانے بجانے کی آواز سن کر پڑوسیوں کو یقین ہو جائے کہ وہ خوش حال ہیں اور سماجی حیثیت میں ان کے برابر ہیں۔

وہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی اسے یقین تھا کہ فہمیدہ اس بوڑھے کی پیشکش کو ٹھکرا دے گی اور نعیم کی محبت کو گلے لگانے کی بات کرے گی لیکن اس کی آواز دوبارہ نہیں ابھری۔ وہ محبت اور دولت کے دوراہے پر کھڑی تھی' شاید اتنی جلدی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔

صباحت چپ چاپ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ پائیں باغ میں پہنچتے ہی فرید کامرانی سے سامنا ہو گیا اس نے مسکرا کر کہا۔

"تم اکیلی ہو۔ رضوانہ نے مشورہ دیا کہ مجھے تمہارے ساتھ ہونا چاہئے ویسے میں بھی یہی چاہتا تھا اسی لئے یہاں چلا آیا۔"

"رضوانہ کہاں ہے؟"

"اوں ہوں!" فرید نے کہا۔ "میں تمہارے پاس آیا ہوں پہلے تم رسمی طور پر یہ کہو کہ فرید تمہارے آنے سے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ یا میری تنہائیوں کو دور کرنے والے اجنبی تیرا شکریہ.........."

"شکریہ!" وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "یہ تفریح بڑی عجیب ہے اور دلچسپ ہے۔ یہ کس کے ذہن کی پیداوار ہے؟"

"یہ تفریح کسی ایک کے ذہن سے نہیں نکلی۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ محض تفریح نہیں ہمارے معاشرے کی اٹل سچائی ہے۔ ہم محض چاند رات کے اجنبی نہیں ہیں ہم سب زندگی کے ہر موڑ پر اجنبیوں کی طرح ملتے ہیں۔ تم میرا نام جانتی ہو۔ میرا چہرہ پہچانتی ہو لیکن میں نے اپنے اندر جس فرید کو چھپا رکھا ہے وہ تمہارے لئے ہمیشہ اجنبی رہے گا۔ اسی طرح تمہارے اندر چھپی ہوئی صباحت مجھے کبھی نظر نہیں آئے گی۔"

"مم۔ میں کچھ چھپانے کی عادی نہیں ہوں۔" وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "چھپاتے وہ ہیں جو مالی حیثیت سے کمزور ہوتے ہیں اور اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ تم مجھے اپنی طرح کیوں سمجھ رہے ہو؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ تم برا مان گئیں۔ بھئی میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں اور میں بھی کوئی گیا گزرا آدمی نہیں ہوں۔ میری آمدنی اتنی معقول اور حیثیت اتنی مستحکم ہے کہ اگلے سال میں اپنی ذاتی کوٹھی بنوانا شروع کر دوں گا۔"

کوٹھی کے ذکر پر صباحت کو فرید کا وہ خواب یاد آگیا۔ اس نے ازراہ مذاق کہا تھا کہ خواب میں پہاڑی کی بلندی پر ایک کوٹھی نظر آ رہی ہے اور فرید اور وہ اس کوٹھی تک پہنچنے کے لئے پہاڑی کی دشوار گزار بلندی کو طے کر رہے تھے۔ وہ خواب تھا' صرف فرید اور صباحت کا نہیں' ہر امیر و غریب کا خواب تھا۔ جب تک ایک شاندار کوٹھی نہ ہو گھریلو جنت کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔

صباحت نے بڑی خاموشی اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے فرید کو دیکھا۔ اس کا لباس' اس کی شخصیت اور اس کے کھڑے ہونے کا پُروقار انداز بتا رہا تھا کہ اگلے سال اس کی کوٹھی ضرور تعمیر ہو گی۔

"تمہاری کوٹھی کہاں ہے؟" فرید نے پوچھا۔

"آں!" وہ چونک گئی۔ "میری۔ میری۔ کوٹھی نہیں ہے۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے کہاں رہنا چاہئے۔ ڈیڈی ہر ماہ دو ہزار روپے بھیجتے ہیں اور بھائی جان ایک ہزار روپے۔ اگر میں ڈیڈی کے پاس امریکہ جاتی ہوں تو بھائی جان کی دل شکنی ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں۔ میری لائف میں بڑے بڑے پرابلمس ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ غریبوں کو صرف ایک وقت کی روٹی اور ایک جوڑے کی فکر ہوتی ہے۔ مگر ہم پیسے والوں کی زندگی میں بڑے بڑے پرابلمس ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھو نا! میری کوٹھی کی تعمیر کل سے ہی شروع ہو سکتی ہے۔ مگر سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ میری ہونے والی بیوی کو وہ کوٹھی پسند آئے گی یا نہیں؟"

صباحت نے دبی زبان سے کہا۔

"وہ خوش نصیب کون ہے؟"

"ابھی تک کوئی نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے اگلے سال تک کے لئے کوٹھی کا

خیال دل سے نکال دیا ہے۔ اگر اس دوران میں نے کسی کے دل میں جگہ بنالی تو اس کی پسند کے مطابق کوٹھی بنواؤں گا۔"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ ان کے درمیان ایک خیالی کوٹھی رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ پھر فرید نے کہا۔

"تمہیں اپنے ڈیڈی یا بھائی جان کے پاس نہیں جانا چاہئے۔ لڑکیاں باپ یا بھائی کے پاس سدا نہیں رہتیں۔ وہ اپنی زندگی کا ساتھی تلاش کرتی ہیں اور اپنا گھر بساتی ہیں۔ تمہیں بھی انہی اصولوں پر عمل کرنا چاہئے۔"

"زندگی کا ساتھی!" یہ الفاظ صباحت کے دل پر دستک دینے لگے۔ چاند اس کی آنکھوں میں کچھ اور روشن ہوگیا۔ سرما کی شبنمی ہوائیں اس کے لباس سے سرسراتی ہوئی اور دوپٹے کے آنچل کو اڑاتی ہوئی گذرنے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں خواب اتر آئے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"اے چاند رات کے اجنبی!
میرے دل پر دستک نہ دے۔
میں نے اپنی تمام آرزوؤں کو
دل کے تہہ خانے میں دفن کردیا ہے۔
آہ! یہ چاند میرے دل میں انگارے کی طرح جل رہا ہے۔"

وہ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے حوض کے کنارے آگئے۔ حوض کے شفاف پانی میں چاند ٹکڑے ٹکڑے ہوکر چاندنی بکھیر رہا تھا اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بکھرے ہوئے جذبوں کی چمک پیدا کررہا تھا۔ وہ حوض کے کنارے پختہ چبوترے پر بیٹھ گئے۔ فرید نے پوچھا۔

"فی الحال تمہاری رہائش کہاں ہے؟"

"رضوانہ نے نہیں بتایا؟"

"نہیں..........!"

"میں اپنی خالہ زاد بہن کے ہاں لانڈھی تین نمبر میں رہتی ہو۔ میں نے کئی بار چاہا کہ یہاں سوسائٹی میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لوں لیکن ڈیڈی اور بھائی جان ہر خط میں تاکید کرتے ہیں کہ مجھے خالہ اور خالو کے زیر سایہ رہنا چاہئے۔ وہ ٹھیک ہی کہتے

ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک لڑکی کوٹھی کرائے پر لے کر تنہا رہے تو لوگ اسے بدنام کردیتے ہیں۔"

"تمہیں تنہا رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم وہاں خالہ اور خالو کو اپنے ساتھ رکھ سکتی ہو۔"

"اوں ہونہہ۔ وہ بہت ہی پرانے خیال کے لوگ ہیں۔ یہاں اس ماحول میں ایک تماشہ بن جائیں گے۔ کیونکہ میری خالہ زاد بہن حمیدہ برقع پہنتی ہے۔ ایک ریڈی میڈ گارمنٹس کے کارخانے میں سلائی کا کام کرتی ہے۔ بسوں میں آتی جاتی ہے۔ میں اسے ٹیکسی کا کرایہ دیتی ہوں تو وہ لینے سے انکار کردیتی ہے۔ ایسی بھی کیا خودداری؟ وہ اتنا بھی نہیں سوچتی کہ میری سوسائٹی کے لوگ اسے پیدل چلتے یا بسوں میں سفر کرتے دیکھیں گے تو میری کتنی توہین ہوگی۔"

"ہاں تمہاری بہن کو پوزیشن کا خیال رکھنا چاہئے۔ نہ جانے یہ چھوٹے لوگ بسوں میں کس طرح سفر کرتے ہیں۔ دھوپ گرمی اور بارش میں بس اسٹاپ پر کھڑے رہتے ہیں۔ کیسی تھرڈ کلاس لائف ہے ان کی۔ میرا خیال ہے کہ کنوینس کا پرابلم تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔"

"ہاں کہیں آنے جانے کی بڑی دشواری ہے کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ اپنی ضرورت کے لئے ایک کھلی چھت کی فلوریڈا خرید لوں۔ مجھے سرخ رنگ کی فلوریڈا بہت پسند ہے۔ مگر خالہ کے ہاں گیراج بنانے کی گنجائش نہیں ہے اور میں کھلی جگہ کار کو چھوڑ کر مطمئن نہیں رہ سکتی۔ محلے کے بچے دو ہی دن میں اسے کھٹارا بنادیں گے۔"

"واقعی تمہاری زندگی میں بڑی پرابلمس ہیں۔"

"اسی لئے میں ٹیکسیوں میں آتی جاتی ہوں۔ بس کے نام سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

"میرے پاس ویسپا ہے۔ تنہا ہوں اس لئے ویسپا سے کام چلا رہا ہوں۔ شادی ہوگی تو کار خرید لوں گا۔"

صباحت مسکرا کر بولی۔

"شادی ہوگی تو تمہارے تمام مسائل حل ہوجائیں گے؟"

"شادی کے بعد تمہارے مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ اسی وقت ڈنر گونگ کی آواز سنائی دی۔ فرید نے کہا۔

"چلو۔ اب ہمیں بلایا جارہا ہے۔ اب ہم ڈنر میں شریک ہوں گے اس کے بعد تاش کی بازیاں چلیں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کوٹھی کی طرف جانے لگے۔

دوسرے جوڑے بھی ڈرائنگ روم میں آکر جمع ہو رہے تھے۔ چاندنی رات کی تفریح سے لطف اندوز ہو کر سب ہی مسکرا رہے تھے۔ فہمیدہ اور نعیم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی لیکن صباحت مسکراہٹوں کے پیچھے چھپی ہوئی شکست خوردہ محبت کو پڑھ رہی تھی۔ اگر وہ ان کے حالات سے واقف نہ ہوتی تو یقیناً ان کی مسکراہٹوں سے دھوکا کھا جاتی۔

پھر اسے ایک تکلیف دہ حقیقت کا علم ہوا۔ وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اپنے پیچھے اسے ایسی بہت سی لڑکیاں اور لڑکے نظر آئے جن کی مسکراہٹیں مصنوعی تھیں یعنی ان کے ہونٹ مسکرا رہے تھے لیکن آنکھوں میں زندہ مسرتوں کی چمک نہیں تھی۔ وہی فہمیدہ جیسا حال تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہیں سے یہ مسرتیں اور یہ تمام سج دھج مانگ کر لائے ہیں اور یہاں سے واپس جاتے ہی مانگی ہوئی چیزیں لوٹا دیں گے۔

ڈنر کے وقت فہمیدہ اور نعیم ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے لیکن اس طرح کہ فہمیدہ کے دائیں طرف بوڑھا غفار بیٹھا ہوا تھا اور نعیم کے بائیں طرف بیگم شباب چمک رہی تھیں۔ وہ دو محبت کرنے والے دو بوڑھوں کے درمیان پھنسے ہوئے تھے۔ دوسری طرف صباحت اور فرید کا ساتھ تھا۔ وہ کھانے کی میز پر ایک دوسرے کی طرف ڈشیں بڑھا رہے تھے۔ ڈشوں کے تبادلے کے ساتھ مسکراہٹوں کے تبادلے بھی ہو رہے تھے۔ کھانے کے بعد تاش کا کھیل شروع ہوا تو اس وقت بھی وہ دونوں پارٹنر بنے کھیلتے رہے۔ صباحت کو اس محفل میں فرید ہی ایسا ملا تھا جس سے وہ کسی قدر بے تکلف ہوگئی تھی۔ رات کے دو بجے تک کھیل جما رہا۔ پھر ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ وہاں بہت کم لوگ ایسے تھے جن کے پاس کاریں نہیں تھیں۔ جو ٹیکسیوں میں آتے تھے واپسی پر انہیں کاروں میں لفٹ مل جایا کرتی تھی رضوانہ نے صباحت سے کہا۔

"مجھے ناظم آباد جانا ہے اور تم لانڈھی میں رہتی ہو میں اپنی کار میں مین روڈ تک

لے جاؤں گی۔ وہاں سے ٹیکسی لے لینا............؟"

"ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے۔" فرید نے کہا۔ "یہ لانڈھی میں رہتی ہیں اور میں کورنگی میں رہتا ہوں۔ میں انہیں چھوڑتا ہوا آگے بڑھ جاؤں گا۔"

"اٹز ویری کائنڈ آف یو فرید!" رضوانہ نے کہا۔ "تم نے ہماری مشکل آسان کردی ہے۔"

صباحت کو اس کے ساتھ جانے میں اعتراض نہیں تھا پھر بھی وہ ذرا ہچکچا رہی تھی۔ رات کے دو بجے تک بے تکلفی سے ہنستے بولتے رہنے کے باوجود وہ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ صباحت کو رضوانہ پر غصہ آرہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر وہ اسے لانڈھی تک چھوڑ دے گی لیکن اب اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ جانے کے لئے وہ اپنی سہیلی کو فرید کے حوالے کر رہی تھی۔

وہ کار اسٹارٹ کر کے ٹاٹا کرتی ہوئی چلی گئی۔ فرید نے بھی ویسپا اسٹارٹ کی۔ وہ اس کے پیچھے آکر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ اپنے ہی بل پر بیٹھی رہے گی۔ فرید کا سہارا نہیں لے گی لیکن وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسکوٹر اسٹارٹ کیا تو صباحت سنبھلنے کے لئے بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور پریشان ہو کر بولی۔

"آہستہ چلاؤ۔ مجھے تیز رفتاری سے ڈر لگتا ہے۔"

وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے احاطہ سے باہر آیا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے رفتار سست کردی۔

"تم اسی طرح مضبوطی سے میری کمر پکڑے رہو۔ ڈر نہیں لگے گا۔"

وہ ایک ذرا سہارے کے لئے فرید سے اس طرح آلگی تھی کہ دل آپ ہی آپ دھڑکنے لگا تھا۔ وہ بیگم شباب کی محفل میں فرید کے قریب تھی تو کوئی بات نہ تھی آخر وہ محفل تھی اور یہاں مکمل تنہائی تھی۔ کبھی کبھی کوئی کار یا ٹیکسی اس کے قریب سے گذر جاتی تھی۔ اس کے بعد پھر وہی دل دھڑکانے والی تنہائی آجاتی تھی۔ فرید نے کہا۔

"اگر اس وقت دعا قبول ہونے کا یقین ہو جائے تو میں یہی دعا مانگوں گا کہ یہ گاڑی چلتی رہے۔ ہم اسی طرح بیٹھے رہیں اور یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو۔"

وہ زیرلب مسکرا کر رہ گئی فرید نے پوچھا۔

"تمہیں یہ دعا پسند ہے؟"

صباحت نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ مرد بڑے چالاک ہوتے ہیں کتنی ہیرا پھیری سے محبت کا اقرار کرواتے ہیں۔ اس نے بڑی نخوت سے کہا۔

"اوں ہونہہ۔ فضول سی دعا ہے۔ کیونکہ راستہ کوئی سا بھی ہو' کسی ایک مقام پر ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ کسی دوسرے راستے پر مڑ جاتا ہے۔"

"ہم دوبارہ کس موڑ پر ملیں گے صباحت؟"

وہ فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ ذرا سوچ کر بولی۔

"آئندہ کسی پارٹی میں............"

"آئندہ پارٹی آئندہ ماہ ہوگی۔ جب اگلے ماہ چودھویں کا چاند طلوع ہوگا۔ اسٹرینجران دی مون لائٹ کی تفریح مہینے میں ایک بار ہوتی ہے لیکن اب تو ہم اجنبی نہیں ہیں۔"

اجنبی! وہ اجنبی ہے یا نہیں؟ اب تو تنہائی میں بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ بلکہ اتنے قریب تھے کہ وہ فرید کی کمر کے گرد اپنے ملائم بازوؤں کا گھیرا ڈالے بیٹھی تھی۔ وہ اس طرح بیٹھنے پر مجبور تھی۔ مجبوری سہی مگر اجنبیت تو نہیں رہی تھی۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ فرید تم اجنبی ہو؟

وہ صحیح جواب سے کتراتی ہوئی بولی۔

"آئندہ پارٹی غفار سیٹھ کے ہاں ہوگی؟"

"ہاں۔ ایک ماہ پہلے ہی طے ہو جاتا ہے کہ آئندہ کس کے ہاں گیدرنگ ہوگی۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"آں۔ کون سی بات؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

"یہی کہ اگر تمہیں مجھ سے کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو تو تم آئندہ بھی مجھ سے ملو گی۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا تم سے کیا تکلیف پہنچے گی۔ بلکہ اس وقت تم میرے لئے تکلیف اٹھا رہے ہو۔"

"تمہیں بازوؤں میں اٹھا کر نہیں لے جا رہا ہوں کہ تکلیف ہوگی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تمہارے بیٹھنے سے میری گاڑی کا مان بڑھ گیا ہے۔ کل شام کو کلفٹن چلو گی؟"

"کل............!" وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "کل نہیں۔"

"پرسوں؟"

"پرسوں بھی نہیں............"

"تو پھر بڑھاپے میں کبھی ملو گی؟"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

"اوہ فرید۔ کبھی کبھی میں آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر سوچتی ہوں کہ بڑھاپے میں کیسی دکھائی دوں گی۔ ایک جھریوں دار چہرہ سامنے آتا ہے تو ڈر جاتی ہوں۔"

"آدمی موت سے ڈرتا ہے اور عورت بڑھاپے سے۔ ویسے تم میری باتوں کو بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتی ہو۔ کل شام کو میں تمہیں لینے آؤں گا۔ رائیٹ؟"

اس نے ہاں یا نہ میں جواب نہیں دیا۔ اس کی خاموشی نے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔ فرید نے پوچھا۔

"تم تمام دن کیا کرتی ہو؟"

"کتابیں پڑھتی ہوں اور اپنی خالہ زاد بہن حمیدہ کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہوں۔"

"یعنی تم بھی سینے پرونے کا کام جانتی ہو؟"

"ہاں جانتی ہوں مگر کرتی نہیں۔ حمیدہ اپنے کارخانے سے کپڑا لے کر آتی ہے میں اسے نت نئے ڈیزائن سے تراش کر دیتی ہوں۔ اس طرح اس کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کی کمپنی سے کئی بار آفر آیا کہ میں مستقل ان کا کام کروں لیکن میں نے ملازمت سے انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ ایک ہزار روپے ماہوار دے رہے تھے۔ مگر میں اپنا پرسٹیج کا خیال رکھتی ہوں۔"

"تم ملازمت پسند نہیں کرتیں۔ تمہارے خیالات دیکھ کر میرے خیالات بھی بدل رہے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ جو رقم میں نے کوٹھی بنوانے کے لئے رکھی ہے۔ اسے کسی کاروبار میں لگا دوں گا۔ کاروبار چمک گیا تو ملازمت چھوڑ دوں گا۔"

وہ صباحت کے سوچنے کا شاہانہ انداز دیکھ کر کہہ رہا تھا کہ اب وہ بھی ملازمت نہیں کرے گا اور صباحت سوچ رہی تھی کہ نہ جانے اس نے کوٹھی کے لئے کتنی رقم جمع کی ہے ایسا نہ ہو کہ تمام روپے اناڑی کی طرح کسی کاروبار میں جھونک دے وہ دونوں ایک دوسرے کے احساسات و جذبات اور نفع و نقصان کے متعلق سوچنے لگے تھے۔

"بس یہاں روک دیجئے۔" صباحت نے کہا۔
اس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔
تمہارا مکان کون سا ہے؟"
وہ گاڑی سے اتر گئی اور انگلی اٹھا کر سامنے میدان سے پرے اشارہ کرتے ہوئے
بولی۔
"وہ جو سبز رنگ کا مکان ہے اس کی ایک کھڑکی سے روشنی آرہی ہے۔ وہ میرا
کمرہ ہے جب تک میں گھر میں نہیں پہنچتی کمرہ روشن رہتا ہے۔"
"تم اتنی رات تک تنہا باہر رہنے کے بعد گھر جاؤ گی تو تمہارے بزرگ ناراض
نہیں ہوں گے؟"
وہ ہنستی ہوئی بولی۔
"اس گھر کے بزرگوں کو مجھ سے ہر ماہ سینکڑوں روپے ملتے ہیں۔ حمیدہ کی آمدنی تو
بس یونہی سی ہے۔ ویسے آج پہلی بار اتنی رات تک باہر رہ گئی۔ ورنہ میں سات بجے
کے بعد ہمیشہ گھر پر ہی رہتی ہوں۔"
"تو پھر میں کتنے بجے آؤں کل شام کو؟" اس نے پوچھا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔
"چار بجے ٹھیک ہے نا؟"
وہ سر جھکا کر جانے لگی۔
فرید نے جواب کے لئے اصرار نہیں کیا۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ ابتدائی ملاقاتوں
مین عورت گونگی ہوتی ہے ذرا ذہانت سے اس کے انکار اور اقرار کی اداؤں کو سمجھنا
پڑتا ہے اور وہ سمجھ گیا تھا۔

☆======☆======☆

وہ اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک چار بجے مکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔
صباحت بھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گاڑی کی آواز سن کر دروازہ کھول دیا۔
"آئیے کچھ دیر بیٹھیے پھر چائے پی کر چلیں گے۔"
وہ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے سامنے والے کمرے میں آگیا۔ وہ چھوٹا سا کمرہ
ڈرائنگ روم کی طرح سجا ہوا تھا۔ فرش پر قالین' آرام دہ صوفے' ایک کونے میں
رکھا ہوا ٹی وی اور گلدان میں سجے ہوئے تازہ رنگ برنگے پھول صباحت کی خوش

ذوقی کا ثبوت دے رہے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "میری بڑی خواہش ہے کہ ایک
بڑی سی کوٹھی لے کر اسے دلہن کی طرح سجادوں۔ اس چھوٹے سے گھر میں ساری
خواہشیں دم توڑ دیتی ہیں۔ میں کل ہی ڈیڈی کو خط لکھوں گی کہ وہ مجھے سوسائٹی میں
کوٹھی لے کر رہنے کی اجازت دے دیں۔"
"اس طرح اجازت نہیں ملے گی۔" فرید نے کہا۔ "تم انہیں لکھو کہ وہ تمہیں
شادی کی اجازت دے دیں۔ شادی کے بعد تم اپنے گھر میں اپنی ہر خواہش..........."
وہ پوری بات سنے بغیر جھینپ کر وہاں سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو
اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔ وہ ٹرے کو تپائی پر رکھ کر اس کے ساتھ ہی
صوفے پر بیٹھ گئی اور چائے بنانے لگی۔ فرید نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
"بڑی عمدہ خوشبو ہے۔"
"دار جلنگ کی چائے بڑی خوشبودار ہوتی ہے۔ یہ دارجلنگ سے مسقط جاتی
ہے۔ مسقط سے بھائی جان ہمارے لئے بھیجتے ہیں۔"
"اوہو۔ میں چائے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اس خوشبو کی تعریف کر رہا ہوں
جو تمہارے لباس سے آرہی ہے۔"
وہ ہنستی ہوئی بولی۔
"اچھا۔ یہ خوشبو۔ یہ بلوگراس ہے۔ ڈیڈی نے چلی سے بھیجی ہے۔"
"چلی؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "او' ہاں۔ یاد آیا........... چلی امریکہ میں
ہے۔ شاید بندر گاہ ہے؟"
"شاید!" وہ وثوق سے نہ کہہ سکی۔
"نہیں۔" فرید نے کہا۔ "وہ ایک صنعتی علاقہ ہے۔"
"شاید!"
"میری یادداشت کمزور ہے۔ میں پڑھتا ہوں۔ پھر بھول جاتا ہوں اب مجھے کچھ
یاد آرہا ہے۔ وہ صنعتی علاقہ نہیں ہے۔ وہاں ایک بہت بڑی سائنسی تجربہ گاہ ہے۔
تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔"
وہ چائے کی پیالی بڑھاتی ہوئی قدرے بیزاری سے بولی۔
"ڈیڈی اپنے خطوط میں خیر خیریت کی باتیں لکھتے ہیں۔ انہوں نے کبھی چلی کا

جغرافیہ نہیں لکھا۔ تم کہتے ہو تو آئندہ خط میں معلوم کروں گی۔“

”نہیں کیا ضرورت ہے۔ کون سا مجھے چلی جا کر رہنا ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ کلفٹن جانا چاہتا ہوں۔ تم ساتھ رہو گی تو سارا امریکہ سمٹ کر کلفٹن میں آجائے گا؟“

اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا اور خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگی۔

اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک برقعہ پوش خاتون کھڑی تھیں۔ صباحت نے تعجب سے پوچھا۔

”ارے۔ حمیدہ! آج بہت جلدی؟ فرید! یہ میری خالہ زاد بہن حمیدہ ہے۔ مگر تم ماڈرن تہذیب کے مطابق اس سے متعارف نہیں ہو سکو گے اور نہ ہی اس کی صورت دیکھ سکو گے کیونکہ پردے کی سختی سے پابندی کرتی ہے۔ حمیدہ! یہ فرید صاحب بہت اچھے آدمی ہیں ہو سکے تو ان سے پردہ نہ کرو۔ نقاب الٹ دو!“

وہ سر جھکا کر تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی صباحت نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں نہ کہتی تھی کہ میرے گھر والے بہت ہی بیک ورڈ ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ سوسائٹی کے علاقہ میں رہوں گی تو تماشا بن جاؤں گی۔“

فرید اس دروازے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے حمیدہ دوسرے کمرے میں گئی تھی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”بعض اوقات اچھائی ایک مضحکہ خیز تماشا بن جاتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب دو تہذیبیں ٹکراتی ہیں۔ مشرق والے مغربی تہذیب کو اور مغرب والے مشرقی تہذیب کو تماشا سمجھتے ہیں۔ اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ اپنی بہن حمیدہ سے پوچھو تو وہ اپنی سوچ کے مطابق کہیں گی کہ ہم دونوں گمراہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے ایک صوفہ پر بے تکلفی سے بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ وہ تسلیم نہیں کریں گی کہ اتنی بے تکلفی کے باوجود ہم اخلاقی تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہیں۔

”اور ہم سے پوچھا جائے تو ہم کہیں گے کہ اس عورت کو پردہ نہیں کرنا چاہئے جو میدانِ عمل میں آتی ہے کارخانوں‘ ملوں اور دوسرے تجارتی اداروں میں کام کرتی ہے کیونکہ ان حالات میں پردہ صحیح معنوں میں قائم نہیں رہتا ہزار پردوں کے باوجود آدھی دنیا انہیں دیکھ لیتی ہے اور جو دیکھ نہیں پاتے‘ وہ برقع کی چار دیواری سے

اندازہ کرتے ہیں۔ عورت ہو یا خزانہ یا دو پیسے کی چیز تم کسی بھی چیز کو چھپا کر لے جاؤ تو لوگوں کو تجسس بڑھ جاتا ہے۔ چھپی ہوئی چیز جرأتِ نگاہ کو للکارتی ہے کہ آؤ اور ہمیں دریافت کرو۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اگر پردہ قائم نہ رہ سکے تو پھر برائے نام پردہ نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے برقع کے باہر حمیدہ کے ہاتھ دیکھے ہیں۔ ان ہاتھوں کی ملائمت دیکھ کر میں کہتا ہوں صباحت! کہ وہ عمر میں تم سے چھوٹی ہے۔ ہاتھوں کی رنگت سے چہرے کا رنگ اور انگلیوں کی نزاکت سے چہرے کے نقوش تصور میں ابھر آتے ہیں............ پھر پردہ کہاں رہا؟

”کوئی ضروری نہیں ہے کہ میرا خیال درست ہو۔ میں نے کہا نا کہ اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہوتا ہے۔ تمہارا خیال بھی درست ہے کہ سوسائٹی کی آب وہوا حمیدہ جیسی لڑکی کو راس نہیں آئے گی؟“

صباحت نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

”توبہ ہے تم تو تقریر ہی کرنے بیٹھ گئے۔ تمہاری پیالی کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

اس نے مسکراتے ہوئے پیالی ہونٹوں سے لگالی اور جلدی سے جلدی گھونٹ بھرنے لگا۔ پھر وہ پیالی کو ٹرے میں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”چلو۔ وی آر گیٹنگ لیٹ............“

صباحت نے اپنا وینٹی بیگ اٹھا لیا اور باہر نکلتی ہوئی بولی۔

”حمیدہ! چائے کی پیالیاں اٹھا لینا۔ میں جلدی ہی لوٹ آؤں گی“

فرید نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ پیچھے آکر بیٹھ گئی۔ گاڑی کا رخ سڑک کی جانب موڑتے وقت فرید نے کن انکھیوں سے کھڑکی کی جانب دیکھا۔ وہاں حمیدہ کی جھلک نظر آئی وہی برقعہ تھا۔ مگر چہرے کا نقاب الٹ گیا تھا۔ بس ایک ساعت کا نظارہ تھا پھر وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا سڑک پر آگیا اور مسکرا کر بولا۔

”کوئی لاکھ چھپنا چاہے مگر نہیں چھپ سکتا۔ حالات اسے بے نقاب کر دیتے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھی۔ وضاحت کرو۔“ صباحت نے پوچھا۔

"ابھی حمیدہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔"

"اچھا!" وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "تو تم نے اسے دیکھ لیا ہے۔"

"ہاں اسے دیکھ کر شکیلہ یاد آ گئی۔"

"کون شکیلہ؟"

"وہی جو کل رات شبو کے ہاں پارٹی میں تھی۔ وہ وولی فلیٹ کا سوٹ یاد ہے؟"

"ہاں۔ وہ جو گرے کلر کا تھا؟"

"ہاں۔ پہلے وہ سوٹ لائٹ کریم کلر کا تھا۔ دوسرے ماہ شکیلہ نے رنگریز کے ہاں لے جا کر اسے بلشنگ کلر میں بدل دیا تو وہ ایک نیا سوٹ معلوم ہونے لگا۔ تیسرے ماہ وہی سوٹ نارنجی رنگ میں بدل گیا۔ اس کے ڈیزائن میں ذرا سی ترمیم کر دی۔ وہ بالکل نیا ہو گیا۔ اس ماہ تم نے اسی سوٹ کو گرے کلر میں دیکھا ہے۔

"ایک متوسط طبقے کی عورت ہر ماہ نئے کپڑے نہیں خرید سکتی۔ نئے لباس نہیں سلوا سکتی۔ ہاں دو چار روپے خرچ کر کے بار بار ان کے رنگ بدلوا سکتی ہے۔ وہ خود کو اپنی سطح سے اونچا کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتی رہتی ہے۔ کم خرچ اور بالا نشیں کے مصداق ہر عورت اونچی سوسائٹی تک پہنچنا چاہتی ہے۔ جب وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہے تو اپنی سوسائٹی میں خود کو دوسری عورتوں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ میں ایک شکیلہ کے چہرے کے پیچھے ہزار عورتوں کے چہرے دیکھ رہا ہوں۔"

صباحت نے سختی سے اعتراض کیا۔

"نہیں ایسا تو نہ کہیں تمام عورتیں ایسی نہیں ہوتیں............"

"میں اس ملک کی تمام عوتوں کے متعلق نہیں کہتا۔ اس شہر میں رہتا ہوں اور یہاں کی ستر فیصد عورتوں کے بارے میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ جو نظر آتی ہیں اور جیسا خود کو ظاہر کرتی ہیں حقیقتاً اس سے مختلف ہوتی ہیں۔ مردوں میں بھی خود نمائی کا جذبہ ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ اپنے عیب چھپاتے تھے اب اپنی حیثیت چھپاتے ہیں۔"

"ہاں!" صباحت نے کہا۔ "یہ سلسلہ مردوں سے شروع ہوتا ہے وہ عورتوں کی خود نمائی کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے عورتیں زیادہ سے زیادہ خود کو نمایاں کرنے کی

کوشش کرتی رہتی ہیں۔ حسن کی ملکہ اور ملبوسات کی شہزادی جیسے خطابات مرد ہی دیتے ہیں۔ یہ خطابات اور انعامات محض کسی فیشن شو میں نہیں ہوتے بلکہ ہر گھر میں ہوتے ہیں۔ کون ایسا مرد ہے جو اپنی محبوبہ کو حسین ترین لڑکی کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ کون ایسی عورت ہے جو اپنے محلے کی تمام عورتوں کے درمیان خود کو نمایاں اور منفرد رکھنے کی کوشش نہیں کرتی؟ مختصر یہ کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو تم نے فیصلہ کر دیا۔ واقعی آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ خدا کا شکر ہے ہم اس آوے میں نہیں ہیں۔"

صباحت ذرا دیر چپ رہی۔ پیچھے بیٹھی ہوئی فرید کی پشت کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔

"مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے جو اپنی اصلیت چھپاتے ہیں۔ وہ جو نعیم ہے نا وہ جس کے ساتھ بیگم شباب لگی لگی پھر رہی تھیں۔ کل اس کا پول کھل گیا ہے۔ وہ اونچی حیثیت کا آدمی نہیں ہے۔ نہ جانے لوگ ہنس کی چال کیوں چلتے ہیں۔ اونہہ!"

فرید نے گاڑی کی رفتار ذرا تیز کر دی۔ پھر ہینڈل پر لگے ہوئے سائیڈ میرر کا زاویہ بدل کر اس میں صباحت کا عکس دیکھنے لگا۔ وہ پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ کہیں کہیں سے آئینے کی مختصر سی سطح پر جھلک رہی تھی۔ فرید نے ایک کراسنگ کو پار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی ایسی عورتوں سے نفرت ہے جو اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنی نمائش کرتی ہیں شکیلہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اب اس لڑکی کو کون سمجھائے کہ بی بی! جتنے پر ہیں اتنی ہی اڑان رکھو۔ زیادہ بلندی پر پرواز کرو گی تو پر جل جائیں گے۔"

صباحت ہنسنے لگی حالانکہ ہنسنے کی کوئی بات نہ تھی۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ شکیلہ اور فہمیدہ جیسی شہزادیوں کا بھید کھل گیا تھا۔ ایک عورت کی کمزوریوں کو پا کر دوسری عورت کو ایک عجیب سی خوشی ہوتی ہے کہ چلو ہم ان سے بہتر ہیں۔ صباحت اپنی بہتری اور ان کی کمزوری پر ہنس رہی تھی۔

☆------☆------☆

پھر ایسا ہوا کہ ان کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔

صباحت نے سوچا تھا کہ دوسری ملاقات کے بعد تیسری نہ ہو۔ دور ہی دور رہنے میں بہتری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زیادہ قریب آنے پر فرید بھی نعیم کی طرح ہنس کی چال چلتا نظر آئے۔ دل ہارنے کے بعد آئیڈل اندر سے کھوکھلا نظر آئے تو عورت کو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ حالانکہ فرید ایسا نظر نہیں آرہا تھا لیکن بعض اوقات یہ کہاوت بھی سچ ہو جاتی ہے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔

فرید نے کچھ اسی انداز میں سوچا تھا کہ زیادہ ملاقاتیں نہ ہوں۔ ابھی ان کے درمیان ایک فاصلہ ہے اگر یہ فاصلہ مٹ گیا اور صباحت بھی شکیلہ اور فہمیدہ کی طرح کمزور حیثیت کی لڑکی ثابت ہوئی تو دل ٹوٹ جائے گا۔ دوسری لڑکیوں کی جھوٹی شان وشوکت دیکھ کر وہ ذرا شبہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ورنہ صباحت ہر اعتبار سے اونچی حیثیت کی لڑکی نظر آتی تھی۔ وہ ہمیشہ نت نئے ڈیزائن اور مختلف رنگوں کے لباس پہنتی تھی۔ شکیلہ کی طرح ایک ہی لباس کا رنگ بار بار نہیں بدلتی تھی۔ اس کے لباسوں کا رنگ، ڈیزائن اور کپڑوں کی کوالٹی بھی مختلف ہوتی تھی۔ اس کے پاس دو چار قسم کے سینڈل تھے۔ زلفوں کی ریشمی ملائمت بتاتی تھی کہ وہ کوئی بہت ہی عمدہ شیمپو استعمال کرتی ہے۔ اس کے ملبوسات میں صبح ایک خوشبو ہوتی تھی۔ شام کو دوسری۔ فرید کے خیال میں وہ اپنے باپ اور بھائی سے ملنے والی رقم زیادہ تر نئے کپڑے خریدنے میں صرف کرتی تھی۔

دونوں نے اپنے طور پر سوچا تھا کہ وہ اچھے ہوں یا برے۔ ان کا سوشل اسٹیٹس مضبوط ہو یا کمزور۔ انہیں دور ہی رہنا چاہئے کیونکہ دور رہنے سے چاہت بڑھتی ہے۔

چاہت ایسی بڑھی کہ وہ دل سے مجبور ہو کر بار بار کسی نہ کسی بہانے سے ملتے رہے۔ کبھی کلفٹن میں کبھی ہل پارک میں، کبھی کسی شاپنگ سنٹر میں اور کبھی کسی کافی ہاؤس میں دلوں کی راہیں ہموار ہوتی گئیں لیکن دماغی سمجھوتہ پھر بھی نہ ہو سکا۔ دونوں اکثر محسوس کرتے تھے کہ ان کے درمیان ایک اجنبیت سی ہے۔ ایک ایسا تکلف ہے جو غیروں میں ہوتا ہے۔ عجیب بات تھی کہ وہ اپنوں کی طرح ملتے تھے اور غیروں کی طرح تکلف سے پیش آتے تھے۔

ایک بار صباحت فرید کے ہاں گئی تھی۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے وہاں دس پندرہ منٹ سے زیادہ بیٹھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ وہاں سے گذرتے وقت فرید نے کہا۔

"آؤ۔ میرا مکان بھی دیکھ لو۔ حالانکہ کرایہ دے کر رہتا ہوں۔ پھر بھی ذاتی کوٹھی بننے تک اسے اپنا ہی مکان کہتا ہوں۔"

وہ دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ اور پیچھے ایک کھلا آنگن تھا۔ ڈرائنگ روم کا قالین، صوفے، کرسیاں، پیتل کے چمکیلے گلدان، ایک ٹی وی سیٹ، ایک کنگ سائز ریکارڈ پلیئر اور ایک بھاری بھرکم فریج۔ یہ تمام قیمتی سامان بتا رہے تھے کہ فرید کی مالی حیثیت کتنی مستحکم ہے۔ دوسرے کمرے کے دروازے پر تالا لگا تھا اس کی چابی کہیں گم ہو گئی تھی۔ فرید نے پڑوسی کے ہاں سے چابی لا کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہیں کھلا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔

"مجبوری ہے، ورنہ میں تمہیں اپنا بیڈ روم دکھاتا۔ اب میں آفس جا کر دیکھوں گا۔ شاید چابی وہاں رہ گئی ہو۔ کوئی بات نہیں پھر کبھی یہ کمرہ دیکھ لینا............"

صباحت کو پھر کبھی ادھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بلکہ وہ خود ہی فرید سے کترانے لگی۔ ایک روز صبح سات بجے وہ اس کے گھر پہنچا تو حمیدہ برقع پہنے دروازے سے باہر آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس نے کہا۔

"ذرا صباحت سے جا کر کہہ دو کہ میں آیا ہوں۔"

وہ مکان کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر اس نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ فرید اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

"اچانک ہی حیدرآباد جا رہی ہوں۔ میرے چچا بیمار ہیں۔ ان کے صحت یاب ہوتے ہی واپس آجاؤں گی۔ فقط صباحت افروز۔"

فرید نے بڑی مایوسی سے اس خط کو دوبارہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے دیکھا۔ حمیدہ میدان پار کر کے بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ گاڑی دوڑاتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ حمیدہ نے گردن گھما کر برقعے کے پیچھے سے اسے دیکھا۔ پھر اسی طرح خاموشی سے آگے بڑھنے لگی۔ فرید نے کہا۔

"سنو حمیدہ! تم صباحت کی بہن ہو۔ اس لئے میں بھی تمہیں بہن سمجھتا ہوں۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں کارخانے تک پہنچا دوں گا۔"

وہ جواب دینے کی بجائے اس طرح تیزی سے بس اسٹاپ کی طرف جانے لگی جیسے کوئی اجنبی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ فرید نے گاڑی روک لی اور مسکراتے ہوئے

بڑبڑانے لگا۔

"واقعی پرانے زمانے کی لڑکی ہے۔ نہ جانے بیچاری صباحت اس کے ساتھ کیسے گذارہ کر رہی ہے.........."

اس نے گاڑی کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

دوسرے دن شام کو وہ پھر معلوم کرنے آیا کہ صباحت واپس آگئی ہے یا نہیں دروازے کے پیچھے سے ایک بوڑھی خاتون نے جواب دیا کہ وہ ابھی واپس نہیں آئی ہے۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ حمیدہ کارخانے سے آرہی تھی فرید اسے دور ہی دور سے دیکھتا رہا۔ اس سے کچھ پوچھنا اور بھینس کے آگے بین بجانا ایک جیسی بات تھی لیکن ایک ہفتہ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ وہ صبح شام صباحت کو پوچھنے کے لئے ایسے وقت آتا تھا جب حمیدہ گھر سے نکل کر جاتی تھی اور شام کو اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوکر آتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ صباحت کے متعلق اس سے کچھ نہیں پوچھے گا۔ اس کا کوئی خط آئے گا تو حمیدہ خود ہی اسے لاکر دے گی۔

ایک ہفتہ کے طویل انتظار سے وہ پریشان ہوگیا۔ دل کی بے چینی بڑھنے لگی۔ صباحت کا ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آکر اسے پکارتا تھا۔ آٹھویں دن وہ یہ سوچ کر آیا کہ صباحت کا پتہ حاصل کرے گا اور وہ خود ہی حیدر آباد جاکر اس سے ملاقات کرے گا لیکن آٹھویں دن وہ آگئی۔ اس نے دروازہ کھول کر کہا۔

"آؤ' یہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ آج باہر نہ جاسکوں گی۔"

وہ کمرے میں آگیا اور بڑے ہی رومانٹک موڈ میں بولا۔

"یہ ایک ہفتہ میں نے تمہارے بغیر کس طرح گذارا ہے۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے کاش کہ میں اپنی بے چینی اور تڑپ کا اظہار الفاظ میں کرسکتا۔"

"میں جانتی ہوں تم روزانہ صبح شام مجھے پوچھنے آتے تھے تم نے اس طرح اپنی بے چینی ظاہر کردی ہے لیکن میرے لئے کچھ الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں۔"

فرید نے ذرا غور سے اسے دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کے چہرے سے بھی پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔

"وہ کیسی الجھنیں ہیں؟ مجھے بتاؤ شاید میں تمہارے کام آسکوں.........."

وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"یہ۔ فرید۔ یہ ہمارا میل جول محلے والوں کو کھٹک رہا ہے۔ تم صبح شام یہاں آتے تھے کئی لوگوں نے خالو سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو اور یہاں کیوں آتے ہو؟"

"اوہ!" فرید کو صدمہ پہنچا کہ اس کی وجہ سے صباحت بدنام ہو رہی ہے۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ ماحول ہمارے مزاج کے خلاف ہے' اگر یہ مکان سوسائٹی کے علاقہ میں ہوتا تو کوئی ہماری طرف انگلی نہ اٹھاتا۔ بہرحال اب ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔"

"یعنی اب ہم روزانہ نہیں مل سکیں گے؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "ہاں!"

فرید نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"یہ کس دل سے کہہ رہی ہو صباحت۔ اس ایک ہفتہ میں تم جتنی دور رہی ہو اتنی ہی اور قریب آگئی ہو۔ میں نے سوتے جاگتے تمہاری کمی محسوس کی ہے۔ تمہارے بغیر میں جہاں بھی گیا' وہ جگہ ویران نظر آئی۔ کیا تمہارے دل نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی؟"

"میں اپنے دل کا حال بیان نہیں کرسکتی۔" وہ جذباتی انداز میں کسی قدر لرزتی ہوئی بولی۔ "عورت' بہت سی خواہشوں' آرزوؤں اور محبتوں کو اپنے اندر کچل کر رکھتی ہے۔ میں بھی عورت ہوں' صبر کرسکتی ہوں لیکن حرفِ مدعا زبان پر لا نہیں سکتی۔ میں تم سے بھی یہی کہوں گی کہ صبر کرو۔ ہم ایک دوسرے سے کہیں دور تو نہیں جا رہے ہیں۔ اسی شہر میں ہیں کبھی کبھی مل لیا کریں گے اور کبھی کی کیا بات ہے۔ کل غفار سیٹھ کے ہاں پارٹی ہے۔ وہاں تو ہم ساتھ رہیں گے۔"

"ہاں۔ رضوانہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں تمہیں اپنی گاڑی میں لے آؤں۔ مگر اب یہاں سے میں تمہیں کیسے پک اپ کروں گا؟"

"میں کل شام کو یہاں سے ٹیکسی میں جاؤں گی اور نرسری کے اسٹاپ پر پہنچ کر تمہارا انتظار کروں گی۔"

"نہیں صباحت! تم کالونی گیٹ تک ٹیکسی میں آؤ میں وہاں تمہارا انتظار کروں

گا۔ چار بجے..........."

"چار بجے؟ اتنی جلدی؟"

"ہاں۔ میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنا چاہتا ہوں۔"

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی خاموشی ہی اقرار بن جایا کرتی تھی۔ فرید نے پوچھا۔

"کیا اب بھی تم کسی الجھن میں ہو؟"

"نن۔ نہیں تو!"

"پھر اتنی خاموشی کیوں؟ میں نے اتنی دیر میں ایک بار بھی تمہیں مسکراتے نہیں دیکھا ہے۔"

وہ فوراً ہی مسکرانے لگی۔

مگر وہ مسکراہٹ بھی کچھ الجھی ہوئی سی تھی۔ اس میں اداسی کا ہلکا سا شائبہ تھا۔ فرید کے لئے یہی کیا کم تھا کہ وہ اس کی خاطر مسکرا رہی ہے۔

☆=====☆=====☆

غفار سیٹھ کے ہاں وہ تمام نوجوان لڑکے' لڑکیاں' کچھ بوڑھی عورتیں اور کچھ بوڑھے مرد نظر آ رہے تھے' انہیں صباحت نے پچھلے ماہ بیگم شباب کے ہاں دیکھا تھا' ڈرائنگ روم میں کھانے پینے کا معقول انتظام تھا۔ جو پینے کے شوقین تھے وہ وہسکی کا جام ہاتھ میں لئے گھوم رہے تھے۔ جو پرہیز کرتے تھے وہ کافی کی پیالیوں کو اپنے لئے کافی سمجھ رہے تھے۔ نعیم کے جسم پر ٹیرون کا ایک نیا سوٹ نظر آ رہا تھا۔ بیگم شباب اسے ساتھ لئے گھوم رہی تھیں ان کے چہرے پر واقعی شباب کی رونق آ گئی تھی لیکن نعیم کچھ پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔

دوسری طرف فہمیدہ بھی کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔ حالانکہ وہ لباس اور سج دھج کے اعتبار سے محفل میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ رضوانہ نے صباحت کے پاس آ کر سرگوشی میں کہا۔

"دیکھ رہی ہو فہمیدہ کو۔ آج کسی ریاست کی شہزادی نظر آ رہی ہے۔ یہ سونے کے زیورات' یہ لباس' یہ سینڈل اور کشمیری شال' یہ سب کچھ غفار سیٹھ کی مہربانیوں سے نصیب ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ..........."

اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ اسی وقت بیگم شباب نے تالی بجائی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں آپ کو ایک خوش خبری سناتی ہوں۔ مس فہمیدہ اور ہمارے غفار سیٹھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے ہیں۔ کورٹ میرج کے بعد کل شام کو پھر یہاں شادی کی پارٹی ہو گی۔"

چاروں طرف سے تالیوں کا شور گونجنے لگا۔ عورتیں فہمیدہ کو اور مرد غفار سیٹھ کو مبارک باد دینے لگے۔ فہمیدہ کے ہونٹوں پر بے نام سی مسکراہٹ تھی۔ وہ شرمانے کے بہانے صوفے پر بیٹھی یوں اپنے آپ میں سمٹ رہی تھی جیسے مبارکباد قبول کرنے سے کترا رہی ہو۔

فرید نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔

"غفار سیٹھ! شادی کل ہو گی۔ پارٹی بھی کل ہو گی لیکن دستور یہ ہے کہ خوشخبری سناتے وقت لوگوں کا منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ابھی مٹھائی منگواؤ۔ کنجوسی سے کام نہیں چلے گا۔"

"واقعی یہ تو دستور ہے۔" دوسرے لوگ فرید کی حمایت میں بولنے لگے۔ غفار سیٹھ نے کہا۔

"ارے سبھی' کتنی مٹھائیاں کھاؤ گے۔ من دو من' چار من جتنی کہو' اتنی مٹھائیاں آ جائیں گی لیکن میرے دونوں ملازم ڈنر تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ میں فرید سے درخواست کروں گا کہ وہ اسپورٹس مینس اسپرٹ کا مظاہرہ کریں اور مٹھائیوں کا آرڈر دے آئیں۔ دکاندار خود ہی یہاں پہنچا دے گا۔"

"یہ کون سا بڑا کام ہے۔ میں یہ گیا اور یہ آیا۔ آؤ صباحت چلیں..........." اس نے صباحت کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہائیں!" غفار سیٹھ نے تعجب سے کہا۔ "اتنے سے کام میں بھی صباحت ساتھ ہو گی۔ بھئی معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ گمبھیر ہے۔" ایک نے کہا۔

صباحت کے رخسار حیا سے تمتمانے لگے۔ ایک بوڑھی عورت نے کہا۔

"لڑکی شرما رہی ہے۔"

دوسری عورت نے لقمہ دیا۔

"فرید نے اتنی لڑکیوں میں ایک صباحت کا ساتھ مانگا ہے ضرور کوئی بات ہے۔"

"بات کیا ہے مجھ سے پوچھو۔" ایک نوجوان نے کہا۔ "میں نے ایک بار ان دونوں کو کلفٹن میں دیکھا ہے۔ دوسری بار اسکالا میں۔ کیا اتنی گواہی کافی نہیں ہے۔"

"ہپ ہپ ہرا۔" دوسرے نوجوان نے کہا۔ "اسٹرینجران دی مون لائٹ کی تفریح اپنا کام دکھا رہی ہے۔"

تمام لوگ ہنسنے لگے۔ صباحت شرم سے رضوانہ کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ غفار سیٹھ نے کہا۔

"چاند رات کے دو اجنبی شناسا بن گئے۔ اس خوشی میں فرید اور صباحت کی طرف سے ایک شاندار پارٹی ہونی چاہئے۔"

"پارٹی؟" صباحت کا کلیجہ دھک سے ہو گیا کہ وہ پارٹی کیسے دے گی؟ اس کے پاس نہ کوئی ہے نہ..........."

اسی وقت کسی لڑکی نے اس کے قریب آکر کہا۔

"مبارک ہو صباحت! تمہارا آئیڈیل لاجواب ہے۔ ایک پارٹی آئیڈیل کی طرف سے اور دوسری تمہاری طرف سے ہونی چاہئے۔"

دوسری لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پارٹیاں اتنی ہو رہی ہیں کہ ان کی تاریخیں یاد رکھنے کے لئے باقاعدہ ڈائری مینٹین کرنی ہوگی۔"

"پہلے تاریخ مقرر ہونے دو۔ پھر ہم ڈائری میں لکھ لیں گے۔"

فرید نے بڑے پیار سے صباحت کو دیکھا۔ پھر بڑی فراخدلی سے بولا۔

"میری طرف سے اگلے ہفتے انٹرکان میں ڈنر پارٹی ہوگی۔ جن کی یادداشت کمزور ہے وہ نوٹ کرلیں۔" رضوانہ نے صباحت کی طرف جھک کر آہستگی سے کہا۔

"تم بھی کچھ بولو۔ تم اتنی اسمارٹ ہو کر جاہل لڑکیوں کی طرح کیوں شرما رہی ہو؟"

"مم۔ میں کیا بولوں؟ کیا۔ کیا پارٹی دینا ضروری ہے؟"

"بالکل ضروری ہے۔ انسان کی حیثیت پیسے اور پارٹیوں سے پہچانی جاتی ہے۔ کیا

تم اپنی پوزیشن گرانا چاہتی ہو؟" دور بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا۔

"یہ تم دونوں چپکے چپکے شاید پارٹی کا بجٹ بنا رہی ہو؟"

رضوانہ نے اس طنز پر مشتعل ہو کر کہا۔

"ہم تمہاری طرح کنجوس نہیں ہیں کہ ایک معمولی سی پارٹی کا بجٹ بنائیں۔ ہم تو کسی اچھے ہوٹل کے متعلق سوچ رہی ہیں۔ ویسے چائنیز ڈنر کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"بہت ہی نیک خیال ہے۔ اس کے لئے چنگ واہ بہترین ریسٹورانٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" رضوانہ نے بڑے تاؤ سے کہا۔ "صباحت کی طرف سے پرسوں چنگ واہ میں ڈنر پارٹی ہے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی؟"

تمام لوگ قہقہے لگانے لگے۔ صباحت کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ رضوانہ سے کہنا چاہتی تھی کہ تم نے پرسوں کی تاریخ کیوں دی؟ لیکن اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ بات زبان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ پارٹی پرسوں ہو یا اور دو روز کے بعد۔ وہ اس سے انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے دم سادھے بیٹھی رہی۔ فرید پھر اس کے قریب آگیا اور بولا۔

"آؤ صباحت' مٹھائیوں کا آرڈر دے آئیں۔"

"تم جاؤ!" وہ مُردہ سی آواز میں بولی۔ "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"بہت خوب!" وہ ذرا اور قریب ہو کر آہستگی سے بولا۔ "محبت کا راز فاش ہو گیا ہے تو پریشان ہو رہی ہو۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ یہ بات آج نہیں تو کل سب ہی کو معلوم ہو جاتی۔ بہرحال میں نے سب کے سامنے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا اور اپنے ساتھ چلنے کی فرمائش کی تھی۔ اگر تم انکار کرو گی تو بڑی بڑی سبکی ہوگی۔"

صباحت نے نظر اٹھا کر اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا۔ اپنے خوبرو آئیڈیل کو عین نگاہوں کے سامنے دیکھ کر اسے اس لڑکی کی بات یاد آگئی کہ تمہارا انتخاب لاجواب ہے۔ ہاں اس کا فرید لاجواب تھا۔ ہزاروں لاکھوں میں ایک تھا۔ یہ پارٹی کیا چیز ہے؟ اس کے لئے وہ بڑی سے بڑی آزمائش سے گذر سکتی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ فرید نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اچھا ہوا کہ ہاتھ تھام لیا ورنہ وہ سہارے کے بغیر دروازے تک پہنچتے پہنچتے لڑکھڑا جاتی۔

وہ دروازے سے باہر آئی تو دل نے اسے تسلی دی۔ "گھبراتی کیوں ہو؟ بعض اوقات بڑے بڑے لکھ پتی اور کروڑ پتی کے ہاں بھی نقد رقم نہیں ہوتی۔ وہ بھی کسی سے ادھار لیتے ہیں۔ تم بھی ادھار لے کر اس آزمائش سے گذر سکتی ہو۔"

مگر اتنی جلدی ادھار کہاں سے ملے گا۔ پرسوں پارٹی دینا ہے اس کے لئے ایک دن پہلے چنگ واہ میں پیشگی دے کر آرڈر بک کرنا ہوگا اور پھر پتہ نہیں کتنی رقم خرچ ہوگی۔ وہ خیال ہی خیال میں اپنے مہمانوں کے سر گننے لگی۔

مہمان پچیس ہوں یا پچاس۔ انہیں گنتے رہنے سے بات نہ بنتی۔ اصل مسئلہ پیسوں کا تھا کہ پیسے کہاں سے حاصل کئے جائیں؟ اس نے فرید کی جانب دیکھا۔ وہ ویسپا اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر گاڑی کا انجن سرد ہو گیا تھا۔ صباحت کے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ فرید سے کچھ دنوں کے وعدے پر قرض مانگ سکتی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ اپنی برتری اور خود نمائی مجروح ہونے لگی۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ پیسوں کے لئے زبان کھولے اور خود کو اپنے محبوب کی نظروں میں گرالے۔

پھر کیوں نا رضوانہ سے کہا جائے۔ اسی نے پرسوں کی تاریخ دے کر اسے مصیبت میں پھنسا دیا تھا' مصیبت میں ڈالنا سب کو آتا ہے۔ نکالنا کسی کو نہیں آتا۔ صباحت اس حقیقت کو جانتی تھی کہ رضوانہ کتنے پانی میں ہے وہ جو ہر ماہ ایک نئے ماڈل کی کار میں آتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ پیسے والی ہے اور ہر ماہ کار کے ماڈلز بدلتی رہتی ہے۔ اس کا بھائی کاروں کا دلال ہے۔ ایک کار کے پیچھے اسے ہزار پانچ سو روپے مل جاتے ہیں۔ رضوانہ کسی پارٹی یا سوشل گیدرنگ میں شریک ہونے کے لئے گیراج سے کار نکال کر لے آتی ہے اور صبح ہونے سے پہلے اسے گیراج میں واپس پہنچا دیتی ہے۔ جہاں تک نقد رقم کا سوال ہے۔ اس کے پرس میں بیس پچیس روپے سے زیادہ رقم نہیں ہوتی.......... صباحت کا دل ڈوبنے لگا۔ صرف کل شام تک کا وقت رہ گیا تھا۔ آرڈر بک کرانے کے لئے پیشگی رقم کہیں سے بھی حاصل کرنا تھی' قرض نہ ملے تو گھر کا کوئی سامان بیچ کر۔ بیچنے کے لئے تو بہت سامان تھا۔ میز کرسیاں' صوفے' پلنگ اور ٹی وی وغیرہ۔ مگر یہ چیزیں فوراً ہی فروخت نہیں ہو جاتیں۔ صرف سونا ہی ایک ایسی چیز ہے جو وقت پر پیسے دے جاتا ہے۔ اس کے پاس زیورات تو تھے مگر سونے کے نہ تھے۔

اسے اپنے آس پاس ایسا کوئی ذریعہ نظر نہیں آرہا تھا' جہاں سے وہ فوری طور پر روپے حاصل کرتی۔

اتنے میں گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ فرید نے کہا۔

"آؤ۔ کیا سوچ رہی ہو؟ جب سے تم حیدر آباد سے آئی ہو ہمیشہ گم صم رہتی ہو۔ بھئی میں نے تو وعدہ کیا ہے کہ اب تمہارے دروازے پر نہیں آؤں گا۔ محلے والے اب تمہارے خالو کو کچھ نہیں کہیں گے۔ آؤ بیٹھو۔"

صباحت کے جی میں آیا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ بہت دور بھاگتی چلی جائے۔ فرید سے دور۔ کلبوں اور ہوٹلوں کی پارٹیوں سے دور۔ اونچی سوسائٹی کی رنگینیوں سے دور لیکن بھاگنے کا خیال بہت دیر میں آیا۔ اس وقت تک پاؤں میں زنجیریں پڑ چکی تھیں۔ وہ اس سوسائٹی کو چھوڑتی تو فرید کا ساتھ بھی چھوٹ جاتا۔

وہ چپ چاپ سر جھکا کر آگے بڑھی اور فرید کے پیچھے بیٹھنے لگی۔ پیچھے بیٹھتے ہی اس کا ہاتھ فرید کی پشت پر آیا۔ وہاں سے پھسلتا ہوا کمر تک پہنچا۔ پھر اچانک ہی اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس لئے نہیں کہ فرید نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھائی تھی بلکہ اس لئے کہ اس کی پتلون کی بیک پاکٹ سے سو سو روپے کے نوٹ جھانک رہے تھے۔

بیٹھنے کی پوزیشن میں جیب پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے وہ نوٹ آدھے کے قریب اوپر ابھر آئے تھے۔ ان نوٹوں کی تہہ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کم از کم پانچ سو روپے ہیں۔ صباحت کی دونوں آنکھیں ان نوٹوں پر اس طرح جم گئی تھیں جیسے دو مکھیاں شہد پر آکر بیٹھ گئی ہوں۔

ناہموار راستوں پر گاڑی ہولے ہولے جھٹکے کھا کر اچھل رہی تھی۔ نوٹ بھی نگاہوں کے سامنے ہمک رہے تھے اور ان کے ساتھ صباحت کا دل بھی اچھلتا جا رہا تھا۔

ہاں۔ یہ وہی روپے ہیں۔ وہی روپے ہیں۔ جو اتنی دیر سے دل میں چبھ رہے تھے اور کہیں سے ہاتھ آتے ہوئے نظر نہیں آرہے تھے اور اب بڑی آسانی سے جھانک کر پکار رہے تھے۔ "صباحت! ہم یہاں ہیں.........."

مگر۔ مگر یہ تو فرید کے روپے ہیں۔

تو کیا ہوا؟ فرید اپنا ہے تو روپے بھی اپنے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ یہ

روپے مانگ کر نہیں لئے جا سکتے تھے۔ بھرم کھلنے کا اندیشہ تھا۔ ہم اپنے عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کے جس ماحول میں رہتے ہیں اس ماحول میں کسی سے بھی قرض مانگو تو عزت ہلکی ہو جاتی ہے۔ چرالو تو ان کی نظروں میں وقار بڑھ جاتا ہے کہ واہ واہ چائنیز ریسٹورنٹ میں پارٹی دی ہے۔

گاڑی تیزی سے بھاگتی جا رہی تھی۔ فٹ پاتھ کے قمقمے، دکانوں کی روشنیاں اور نیون سائن کی رنگینیاں ان نوٹوں کو چوم رہی تھیں۔ کبھی ان پر سبز روشنی پڑتی تھی، کبھی سرخ اور کبھی دودھیا روشنی میں وہ مسکراتے تھے اور کبھی سائے میں چھپ جاتے تھے۔ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے کہ آؤ۔ ہمیں پکڑلو.........

ایک بادشاہ زادی تھی۔

وہ قسمت کی ماری ایک بار اپنی کنیزوں اور محافظوں سے بچھڑ کر جنگل جنگل بھٹکتی کسی دوسرے ملک میں پہنچ گئی۔ بھوک اور تھکن سے بیچاری کا برا حال تھا۔ شہر کے دروازے پر ایک نانبائی کی دکان نظر آئی تو تازہ گرما گرم روٹیاں دیکھ کر بھوک سے اور برا حال ہو گیا مگر پرس میں پیسے نہیں تھے ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے توہین ہوتی تھی۔ بھلا بادشاہ کی بیٹی کہیں بھیک مانگتی ہے؟

مگر پیٹ روٹی مانگ رہا تھا۔ ایسی روٹی مانگ رہا تھا جس سے بادشاہ زادی کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔ ایسی روٹی ملے کہ اپنی آن برقرار رہے۔ شاہانہ عظمت پر حرف نہ آئے۔ اس نے.......... اس نے روٹی چرالی۔

چوری سے پیٹ بھی بھر گیا۔ عزت بھی رہ گئی اور بیچارے اس نانبائی کو خبر تک نہ ہوئی۔

مٹھائیاں آئیں اور سب نے کھائیں اور کھاتے کھاتے میٹھی زبان سے دوبارہ غفار سیٹھ اور فہمیدہ کو نئے رشتے کی مبارکباد دی پھر اسٹرینجران دی مون لائٹ کی تفریح کے لئے وہ لوگ باغیچہ میں جانے لگے۔

اسی وقت فرید گھبرایا ہوا صباحت کے پاس آیا اور مردہ سی آواز میں بولا۔

"میں واپس جا رہا ہوں؟"

"کہاں جا رہے ہو؟" صباحت اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "کیوں جا رہے ہو؟"

"میرے روپے کہیں گم ہو گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے گم ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے پچھلی جیب میں رکھے تھے۔ پھر سوچتا ہوں کہ شاید گھر میں بھول آیا ہوں۔ ہاں یہی ہو سکتا ہے میں گھر میں چھوڑ آیا ہوں ورنہ روپے جیب سے نہیں جا سکتے.........."

صباحت کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس سے نظریں ملا سکتی۔ فرید نے اس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو یہاں سے واپس جانے میں تمہیں کنوینس کی دشواری نہیں ہو گی۔ یہ پارٹی رات کے دو تین بجے تک رہے گی۔ میں کسی وقت بھی آکر تمہیں لے جاؤں گا تم کسی سے نہ کہنا کہ میں پیسوں کے لئے پریشان ہو کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ ان لوگوں کی نظروں میں پیسوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ میری پریشانیوں کا مذاق اڑائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

صباحت دھپ سے صوفے پر یوں گر پڑی جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے شراب کے جام، کافی کی پیالیاں اور مٹھائی کی پلیٹیں نگاہوں کے سامنے یہاں سے وہاں ڈول رہی تھیں اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند۔ سوچ کے دروازے بند۔ ضمیر کی آواز بند۔ ہاں پردے گرا دو۔ دروازے بند کر دو کوئی اجنبی شناسا بن کر نہ آئے۔ مجھے کسی سے محبت نہیں ہے۔ محبت مجھے وہ سوشل اسٹیٹس نہیں دے سکتی۔ وہ عزت اور تعریفی جملے نہیں دے سکتی جو چائنیز ڈنر کے وقت مجھے ملیں گے۔ یہ محبت کا درد نہیں ہے۔ یہ جیب کتری محبت کی لاش پر کھڑے ہو کر اپنی حیثیت کو اونچا کرنے کا دور ہے۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس تنہائی میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے چلتی باہر جانے لگی۔

باہر کی تازہ ہوا میں ذہن کو سکون پہنچانے والی ٹھنڈک تھی اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو چودھویں کا چاند آنکھوں کی پتلیوں میں اتر آیا۔ اس کی نظریں فوراً ہی جھک گئیں۔ شاید چاند رات کا اجنبی یاد آ گیا تھا۔

دور دور تک اجنبی جوڑے نظر آ رہے تھے۔ کوئی شبنم آلود گھاس کے فرش پر

ٹہل رہا تھا اور کوئی پھولوں کی انجمن میں کسی سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وہ کوٹھی کے دائیں طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ ایک مور پنکھی کے پیچھے سرگوشیاں سنائی دیں لیکن اسے کسی کی سرگوشیاں سننے کا ارمان نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ آگے ایک درخت کی آڑ میں ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ہنسی صباحت کے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہی تھی۔ خوشی کی تلاش میں بھٹکنے والی کو دوسروں کی خوشی کاٹ رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے؟ چمن کے کس گوشے میں سکون تلاش کرے۔ مگر وہ چلتی رہی چلتی رہی۔ پھر ایک جگہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ ایک جھاڑی کے پیچھے کسی لڑکی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے کسی کی ہنسی نے نہ روکا کسی کے آنسوؤں نے روک لیا۔

کون رو رہی ہے؟ صباحت کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ وہ جھاڑی کے ذرا قریب چلی گئی۔ اسی وقت ایک مرد کی سرد آہ سنائی دی۔

"ہم دونوں نے اپنی مرضی سے فیصلہ کیا ہے۔ اب رونے سے کیا فائدہ؟" یہ نعیم کی آواز تھی۔

پھر فہمیدہ کی آواز سنائی دی۔

"آنسو آپ ہی آ رہے ہیں۔ میں رونا نہیں چاہتی۔ مگر رو رہی ہوں۔ شاید اس لئے کہ برسوں کا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔"

"پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ نہیں بھولو گی تو وقت بھلا دے گا۔ کل تم اس کوٹھی کی مالکہ کہلاؤ گی۔"

"ہاں تم بھی تو بیگم شبانہ کی کوٹھی کے مالک بن رہے ہو۔ ہم کتنی محبتوں اور کتنے جذبوں کو کچل کر اتنے اونچے مقام پر پہنچے ہیں۔"

"ہاں۔ کار کوٹھی اور تگڑے بینک بیلنس کے لئے انسان جھوٹ بولتا ہے۔ دھوکہ دیتا ہے۔ اپنا ایمان بیچتا ہے۔ اپنی پوری قوم کو تباہ کر دیتا ہے۔ ہم نے تو کسی کو تباہ نہیں کیا۔ صرف ایک دوسرے سے طلاق لی ہے۔"

صباحت کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ارے تو کیا یہ دونوں میاں بیوی تھے؟ کیا ایک بیوی نے کوٹھی کی مالکہ بننے کے لئے طلاق لی ہے اور ایک خاوند نے بینک بیلنس بنانے

کے لئے طلاق دی ہے؟

ارے میں کس دنیا میں آ گئی ہوں؟ کیا یہ مہذب انسانوں کی دنیا ہے؟ کیا یہ میری اور میرے فرید کی دنیا ہے؟ نہیں۔ اس باغیچے کا چاند ان اجنبیوں کے لئے ہے جو صرف اپنے لئے جیتے ہیں اور دوسروں کے لئے ہمیشہ اجنبی بن جاتے ہیں۔ جیسے میں ابھی فرید کے لئے اجنبی بن گئی تھی۔

فرید اتنی شدت سے یاد آیا کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پیروں میں اتنی سکت نہ رہی کہ وہ کھڑی رہ سکتی۔ وہ آہستہ آہستہ دو زانو ہو کر شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر بیٹھ گئی۔

☆======☆======☆

فرید ایک چھوٹی سی موم بتی روشن کئے اپنے کمرے کا سامان الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ جہاں جہاں وہ اپنے روپے اور ضروری کاغذات رکھا کرتا تھا وہ ساری جگہیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ روپے نہ ملے۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ آخر وہ کہاں چلے گئے؟ کس کے ہاتھوں میں پہنچ گئے؟ وہ اس کڑوی سچائی پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جو اپنے ہوتے ہیں' بالکل اپنے ہوتے ہیں۔ وہی بعض اوقات لوٹ لیتے ہیں۔

اس نے جھنجھلا کر موم بتی کو فرش پر پٹخ دیا۔ ننھی سی لو بجھتے ہی کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ وہ اس تاریکی میں تھوڑی دیر تک گم صم کھڑا رہا۔ پھر تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا اس کمرے میں آگیا جو ڈرائنگ روم کی طرح سجا ہوا تھا۔

وہاں بھی اندھیرا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے سے آنگن نظر آرہا تھا۔ آنگن کی دیوار پر چاندنی ایک چھوٹے سے دھبے کی طرح لگی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ پورے آنگن پر چھانے والی تھی۔ سامنے برآمدے کی طرف کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ باہر کی ہلکی گھٹی گھٹی سی روشنی ڈرائنگ روم کے سامان کو کسی حد تک واضح کر رہی تھی۔

وہ ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

اگر روپے ڈوب چکے ہیں تو میں بھی ڈوب جاؤں گا۔

اب مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ قرض لے لے کر اپنی مستحکم مگر جھوٹی حیثیت کا مظاہرہ کرتا رہوں۔ اب تو پانی سر سے گذر گیا ہے۔ میں واقعی ڈوب چکا ہوں۔

یہ جو میرے پاس ویسپا ہے' کنگ سائز ریکارڈ پلیئر ہے اور بھاری بھرکم فریج ہے' وہ سب میرے دوست کی امانت ہے۔ وہ حکومت کی طرف سے ایک سال کے لئے جرمنی گیا ہے۔ ٹریننگ مکمل کرکے واپس آئے گا اور اپنا سامان اٹھا کر لے جائے گا۔

جو چیز ہماری نہیں ہوتی ہم اس پر اتراتے ہیں۔ اونچی کوالٹی کی مسرتوں کے پیچھے

بھاگتے ہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں ہماری زندگی مسکراتی ضرور ہے مگر ایک بازاری عورت کی طرح بھیک مانگنے والی مسکراہٹ۔

میں اب بھی ایسی زندگی گذارنا چاہتا ہوں دوسروں کی نظروں میں جو حیثیت بنا چکا ہوں' اب اس حیثیت سے نیچے نہیں گرنا چاہتا۔ مگر.......... مگر میں کیا کروں؟ یہ صباحت کی محبت میرے سوچنے کا انداز بدل رہی ہے۔ یہ لڑکی کہاں سے زندگی میں آگئی؟ اگر نہ آتی تو اچھا ہوتا۔ میں ہر ماہ اسٹرینجران دی مون لائٹ کی تفریح سے بہلتا رہتا۔ کبھی شادی اور ازدواجی زندگی کے متعلق نہیں سوچتا۔ مگر یہ صباحت کی محبت مجھے سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اب اگر میں شادی کی بات کروں گا تو یہ بھید کھل جائے گا کہ میرے پاس کوٹھی بنانے کے لئے تو کیا ایک جھگی خریدنے کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔

میں صباحت کے سامنے اپنے جھوٹ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا اور اپنی صباحت کو مزید فریب دینا بھی نہیں چاہتا۔ یا اللہ! یہ کیسی کشمکش ہے۔ نہ اس پہلو سے قرار آتا ہے۔ نہ اُس پہلو سے۔ میں کیا کروں؟

اس کے خیالات کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دروازے پر آہٹ سن کر اس نے نظریں اٹھائیں تو وہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جو تاریکی میں واضح نہیں تھی لیکن اسے ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

"صباحت۔ تم؟"

"ہاں!" وہ کمرے میں داخل ہو کر بولی۔ "لائٹ آن نہ کرنا' میں جو بات کہنے آئی ہوں۔ اس کے لئے یہ اندھیرا سازگار ہے۔"

لائٹ آن نہیں ہوگی۔ میں نے بجلی کا بل نہیں دیا ہے۔ اس لئے کنکشن کٹ گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اندھیرے ہیں۔ تم نے ٹھیک ہی کہا۔ ایسی باتوں کے لئے اندھیرا سازگار ہے۔ بعض اوقات روشنی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔"

وہ نیم تاریکی میں چلتی ہوئی قریب آئی اور ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"یہ لو!"

"کیا ہے؟"

"تمہارے چھ سو روپے۔"

وہ چونک کر اندھیرے میں گھورنے لگا۔ بڑے غور سے کبھی صباحت کے چہرے کو اور کبھی اس کے ہاتھ کو تکنے لگا۔ وہ نظر آرہی تھی۔ روپے بھی نظر آرہے تھے۔ اب پہلے جیسی تاریکی نہیں تھی۔ نہ جانے کہاں سے روشنی چھپ چھپ کر آرہی تھی۔

اس نے روپے کی بجائے صباحت کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بڑی نرمی سے بولا۔

"بیٹھو.........!"

صباحت نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ نوٹ ان کے درمیان بکھر گئے اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔

"میں جھوٹی ہوں......... میں ہمیشہ جھوٹ بولتی رہی......... آج اس جھوٹ نے مجھے چوری سکھا دی۔ پھر یہ چوری مجھے نہ جانے اور کون سے جرم پر مجبور کر دیتی مجھے معاف کر دو فرید......... مجھے معاف کر دو؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرید نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔

"چپ ہو جاؤ صباحت.........! ہم دونوں ہی جھوٹے ہیں۔ ہیں نہیں تھے......... اب تو سچ بول رہے ہیں۔ چپ ہو جاؤ۔ آؤ یہاں بیٹھو۔"

وہ اسے کھینچتا ہوا صوفے تک لے آیا۔ مگر اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"میں......... میں نے......... تم سے صرف جھوٹ نہیں کہا بلکہ تمہیں دھوکہ بھی دیا ہے۔ میں حیدر آباد نہیں گئی تھی۔ صوفے اور ٹی وی کی قسطیں سر پر آگئی تھیں اس لئے دن رات گھر میں بیٹھی کپڑے سیا کرتی تھی۔ ایک ڈرائنگ روم کی سلامتی کے لئے......... اس شہر کے تمام گھروں میں ایک ڈرائنگ روم ہی ایسا ہوتا ہے جسے ہم سجا بنا کر رکھتے ہیں۔ اس ڈرائنگ روم کے پیچھے کسی بھی کمرے میں جاؤ تو وہاں کی غریبی اور غلاظت دیکھ کر ابکائی آنے لگتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ شکیلہ بار بار کپڑوں کا رنگ بدلتی ہے۔ رضوانہ بھائی کی منتیں کر کے گیراج سے کار نکال لاتی ہے اور میں کارخانے سے جو نئے نئے کپڑے لاتی ہوں۔ انہیں سینے کے بعد پہلے خود پہنتی ہوں ان پر داغ دھبہ لگنے نہیں دیتی۔ دوسرے دن ان پر استری چلا کر کارخانے پہنچا دیتی ہوں۔

"میں نے بڑے جتن کئے۔ میں نے بڑی محنت کی لیکن اتنا ہی پایا، جتنی محنت کی آج کے بعد اگر چوری سیکھ لیتی تو یقیناً جلد ہی کسی کوٹھی کی مالکہ بن جاتی۔ مگر میں انسانیت سے گر کر اونچے مقام تک پہنچنا نہیں چاہتی میں ایک یتیم لڑکی ہوں۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ کوئی بھائی مسقط میں نہیں رہتا۔ میری خالہ نے میری پرورش کی ہے۔ میری اور حمیدہ کی محنتوں سے وہ گھر چلتا ہے۔ کارخانہ جاتے وقت صرف حمیدہ برقع نہیں پہنتی۔ میں بھی پہنتی ہوں۔ کئی بار میں تمہارے سامنے سے گذری مگر تم نے مجھے حمیدہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

"ایک روز تم نے کہا تھا کہ جو عورت میدانِ عمل آتی ہے کارخانوں، ملوں اور دوسرے کاروباری اداروں میں کام کرتی ہے اسے پردہ نہیں کرنا چاہئے۔ آج میں کہتی ہوں کہ پردہ کرنا چاہئے۔ مجھ جیسی عورتیں یہ برداشت نہیں کرسکتیں کہ جس اونچی سوسائٹی میں ہم بیٹھتے ہیں اس سوسائٹی کے لوگ ہمیں پیدل چلتے یا بسوں میں سفر کرتے ہوئے دیکھیں......... تم نے بھی مجھے بارہا پیدل چلتے اور بسوں میں چڑھتے ہوئے دیکھا لیکن پہچان نہ سکے۔ برقع بہت اچھی چیز ہے۔ یہ غریبی اور محتاجی کو چھپاتا ہے۔ اندر پھٹے پرانے کپڑے ہوں تو اوپر سے نظر نہیں آتے۔ کریم، پاؤڈر اور لپ اسٹک وغیرہ کی بچت ہوتی ہے نقاب کے پیچھے کوئی نہیں جھانکتا۔ یہ برقع اونچے طبقہ اور متوسط طبقہ کے درمیان ایک پردہ ہے۔ بڑا ہی رازدار اور بڑا ہی غریب نواز پردہ ہے حالانکہ صاف اور سچی تہذیب کو کبھی چھپنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ برقع کی ضرورت صرف پھٹی پرانی تہذیب کو ہوتی ہے......... اور آج سے میں اس پردے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گی۔"

فرید نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں۔ نہ پردہ ہوگا، نہ ہم اپنے اصلی چہرے چھپائیں گے۔ میں ابھی اس الجھن میں مبتلا تھا کہ کس طرح تم پر اپنی اصلیت ظاہر کر دوں۔ میں ایک معمولی اکاؤنٹنٹ ہوں۔ میری تنخواہ ساڑھے پانچ سو روپے ہے؟"

"اور مجھے ہر ماہ چھ سو روپے ملتے ہیں۔" صباحت نے کہا۔

"اچھا تو سب ملا کر ساڑھے گیارہ سو روپے ہوئے ناں؟"

"ہاں......... ہم دونوں مل کر......... ساڑھے گیارہ سو........."

فرید نے بچوں کی طرح خوش ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے صوفے سے اٹھا کر بولا۔

"ادھر آؤ صباحت............ میں بہت دیر سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے اندھیرے گھر میں روشنی ہو رہی ہے۔ وہ دیکھو............ ادھر آؤ............!" وہ اسے کھینچتا ہوا کمرے سے آنگن میں لے آیا۔ "ہم خواہ مخواہ عالیشان کوٹھیوں کے باغیچوں میں بھٹکتے رہے۔ چاندنی تو ہمارے آنگن میں بھی ہے۔"

"ہاں............ یہ صاف اور سچی چاندنی ہمارے دلوں میں بھی ہے۔"

"اور............ اب ہم وہ اجنبی نہیں ہیں جو چاندنی راتوں میں بھٹک جاتے ہیں۔"

صباحت کی آنکھوں میں زندہ مسرتوں کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ ذرا گردن جھکائی پھر بڑے پیار سے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

☆======☆======☆

نوشتۂ کردار

تقدیر کا لکھا مٹ سکتا ہے' کردار کا لکھا کبھی نہیں مٹ سکتا۔ جو لکھنے میں ذرا بھی بھول کرے' تقدیر اسے ٹھوکروں میں اڑا دیتی ہے۔

کبھی وہ الوداع کہہ کر گیا تھا تو بشریٰ کا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ آج وہ الوداع کہنے آئی تھی اور وسیم احمد کا دل رو رہا تھا۔ پہلے بشریٰ نے صبر کیا تھا۔ اپنے آنچل سے آنسو پونچھ لئے تھے۔ وسیم کے پاس آنسو پونچھنے کے لئے ایک رومال تک نہ تھا۔

وہ دونوں سمندر کے کنارے ٹھنڈی ریت پر چل رہے تھے۔ بشریٰ نے کہا۔ "یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر سامنا ہوا تو اجنبی بن جانا۔ میں بھی تمہیں پہچاننے سے انکار کردوں گی۔" اس نے کہا۔

"ایسا نہ کہو بشریٰ! عورت صبر کرلیتی ہے۔ انتقام نہیں لیتی مگر تم لے رہی ہو۔ مجھے میری بے وفائی کی سزا دے رہی ہو۔"

"میری شادی ہونے والی ہے اور تمہاری بے وفائی کا اب مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"تم چاہو تو شادی سے انکار کرسکتی ہو۔ گھر میں تمہاری بات چلتی ہے کوئی تمہارے انکار کے آگے دم نہیں مارے گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ چلتی رہی۔ پھر بولی۔ "یاد ہے کچھ عرصہ پہلے میں نے بھی تم سے یہی بات کہی تھی۔ گھر میں تمہاری بات چلتی تھی۔ تم شادی سے انکار کرسکتے تھے مگر تم نے کیا جواب دیا تھا۔ یاد ہے؟"

اب اسے چپ لگ گئی وہ چلتے چلتے منہ پھیر کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی خواہش تھی کہ سمندر کی شور مچاتی ہوئی لہریں بشریٰ کے اس سوال کو بہا کر لے جائیں اور اسے جواب نہ دینا پڑے۔

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "بڑی مشکل ہے کہ مرد اپنی بات بھول جاتے ہیں یا بھول جانا چاہتے ہیں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مجھے یاد ہے مگر پچھلی باتیں دہرانے سے کیا فائدہ؟"

"آدمی جسے دہرانا نہیں چاہتا' وقت اسے دہرا دیتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے اچھی خاصی آمدنی کی ضرورت ہے۔ تمہیں ملازمت نہیں ملتی تھی۔ تم کاروبار کرنا چاہتے تھے۔ کاروبار کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور رقم کے لئے تمہارے گھر والوں نے تمہاری شادی شیبا سے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ تم بے چارے کتنے مجبور تھے۔"

"طعنے نہ دو بشریٰ! اونچی سطح پر خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے ہر شخص کسی نہ کسی طور جوا کھیلتا ہے۔ میں نے بھی اپنی اور تمہاری محبت کو داؤ پر لگا دیا تھا لیکن جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔"

"یہ تو نہ کہو کہ تمہیں غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ تو حالات نے ٹھوکر ماری۔ شیبا کا باپ اسمگلر کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ سرکار نے تمام مال پر قبضہ کرلیا۔ تمام بینک بیلنس پر مہر لگا دی۔ شیبا کا خاندان اونچے طبقہ سے گر کر متوسط طبقہ میں آ گیا۔ تمہیں کاروبار کے لئے رقم نہیں مل سکتی تھی۔ اس لئے بیک ٹو پویلین کے مصداق تم میری طرف لوٹ آئے۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ اگر تم یہی سمجھتی ہو تو یہ اور سمجھ لو کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"اسے بھولا نہیں کہتے تو بھولا اور معصوم بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"بشریٰ! تم مجھ سے اتنی بیزار نہیں ہو' جتنا کہ ظاہر کر رہی ہو۔"

"میں بیزار ہوتی تو تمہارے ساتھ اتنی دور ٹہلنے نہ آتی۔ کبھی ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھے رہے تھے۔ اس اچھائی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔"

"جسے فراموش نہ کیا جاسکے' اس کے لئے دل میں ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔"

"ہاں مگر گنجائش کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ تمہارے لئے میرے دل میں مسکرا کر باتیں کرنے کی حد تک گنجائش ہے۔ اس کے آگے دوستی اور شناسائی کی حد ختم ہو جاتی ہے۔"

"محبت تو بے حد ہوتی ہے۔ تم اس کی حدیں مقرر کر رہی ہو۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم بھی دولت کی خاطر سادات سے شادی کر رہی ہو؟"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ سمندر کی لہریں اس کے قدموں کو چھو ر

بہت دور اس کی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی بہن ساحلی دیوار پر بیٹھے سمندر کی لہروں کا نظارہ کر رہے تھے۔

بشریٰ ایک پتھر پر آکر بیٹھ گئی۔ پھر کہنے لگی۔ "میں لباس کے ڈیزائن تیار کرتی ہوں اور سلائی کرتی ہوں۔ اللہ کے فضل سے مارکیٹ میں سب سے زیادہ میرے تیار کئے ہوئے ڈیزائن پسند کئے جاتے ہیں۔ جب تم نے میرا ساتھ چھوڑا اس وقت میں ماہانہ ڈھائی ہزار روپے کما لیا کرتی تھی۔ اب میں ماہانہ چھ ہزار روپے حاصل کر لیتی ہوں کیا میں بھی یہی سمجھوں کہ تم میری ماہانہ آمدنی دیکھ کر میری طرف واپس آئے ہو؟"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں لالچی نہیں ہوں تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنا مستقبل شان دار بنانے کے لئے شیبا سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ محبت تو تم سے تھی اور تم سے ہی رہے گی۔"

"اپنی ہی باتوں کی روشنی میں سمجھ لو کہ میں بھی لالچی نہیں ہوں۔ میں بھی اپنے مستقبل کو شان دار بنانے کے لئے سادات سے شادی کر رہی ہوں۔ اس کے کارخانے میں تیار ہونے والے ریڈی میڈ گارمنٹس یورپ اور امریکہ تک جاتے ہیں۔ جب سادات نے بتایا کہ وہ میرے ڈیزائن کی نقلیں بھی باہر بھیجتا ہے اور بیرون ملک میری صلاحیتوں کا چرچا ہے تو میں نہیں بتا سکتی کہ مجھے کتنی خوشی حاصل ہوئی۔ اب وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرے سامنے بہت دور تک مستقبل روشن ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا میں روشنی سے پلٹ کر تاریکی میں آجاؤں؟"

"کیا ماہانہ چھ ہزار تمہارے لئے کافی نہیں ہے؟"

"میرے لئے تو چھ سو روپے بھی کافی ہیں مگر ہماری سوسائٹی میں ہمارے معاشرے میں عورت ایک ناپائیدار ہستی ہے۔ شادی کے بعد اس کی محبت اور آمدنی کو دھکا پہنچتا ہے۔ کبھی شوہر اسے گھر میں قید کرتا ہے۔ کبھی وہ خود بچوں کی پرورش اور ذاتی طور پر توجہ دینے کے لئے قید ہو کر رہ جاتی ہے۔ اصل میں عورت کا شان دار مستقبل اس کا مرد ہوتا ہے۔ دنیا مرد کی مٹھی میں ہوتی ہے اور وہ اسی مٹھی سے شان دار مستقبل نکال کر اپنی عورت کو دیتا ہے۔"

وسیم سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح

بشریٰ کو قائل کرے کہ وہ سادات سے شادی نہ کرے۔ اس کی طرف لوٹ آئے۔ وہ پتھر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "چلو! امی انتظار کر رہی ہیں۔"

"بشریٰ! میں نے شیبا کی طرف جا کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ وہی غلطی تم سادات کی طرف جا کر نہ کرو۔"

"نہ تم نے غلطی کی' نہ میں کر رہی ہوں۔ دنیا میں سب ہی خوب سے خوب تر زندگی گزارنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ کتنے ہی مرد دولت مند لڑکی اور جہاز بھر جہیز کی تمنا کرتے ہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں دولت کمانے والے مردوں سے شادی کرنا چاہتی ہیں' سب ہی کو اپنے طور پر پسند کرنے اور شادی کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہم ایک دوسرے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ غلطی کر رہے ہیں یا لالچ میں آکر شادی کر رہے ہیں۔ جب تک دولت کمانے کی دوڑ جاری رہے گی۔ تب تک یہ غلطی' غلطی نہیں اور لالچ' لالچ نہیں ہے۔"

وہ اتنی دیر تک بولتی رہی کہ فاصلہ طے ہو گیا۔ وہ دونوں ساحلی دیوار کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں ان کے گھر والے بیٹھے ہوئے تھے۔ وسیم نے کہا۔ "میرے اور تمہارے گھر والوں کی یہ شدید خواہش ہے کہ ہماری شادی ہو جائے۔"

وہ بولی۔ "تمہاری خالہ میری امی لگتی ہیں۔ اگر میری امی تمہاری خالہ لگتیں تو مجھے سادات سے بیاہنا چاہتیں۔ جو اپنی ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کو اونچے محلوں میں دیکھنا پسند کرتی ہیں۔"

ساحلی دیوار پر بیٹھے ہوئے بچے انہیں آتے دیکھ کر تالیاں بجانے لگے۔ وسیم کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی ڈولی کہہ رہی تھی کہ بشریٰ باجی ہماری بھابی بن جائیں گی۔"

بشریٰ کی امی نے بھی مسکرا کر تائید کی۔ "ہاں ابھی پپو آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دو طرف سے لا کر ملا رہا تھا اور کہہ رہا تھا' شادی ہو جائے گی۔ شادی ہو جائے گی۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ دونوں انگلیاں مل گئیں۔ کیوں پپو! تم نے فال کھولا تھا۔ شادی ہو جائے گی نا؟"

پپو نے "ہاں۔ ہاں" کہہ کر سر کو زور زور سے ہلایا۔ وسیم نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اسے اچھال کر کیچ کرتے ہوئے کہا۔ "معصوم بچوں کی

زبان سے نکلی ہوئی بات ضرور پوری ہوتی ہے۔ بشریٰ میری دلہن بنے گی.........."

☆======☆======☆

شادی ہوگئی۔ بشریٰ دلہن بن کر سادات کے گھر آگئی۔ اس نے تقریباً چھ ماہ تک سادات کو دیکھا سمجھا تھا۔ تب کہیں اسے جیون ساتھی بنانے کے لئے پسند کیا تھا۔ یہ غلط ہے کہ محبت ایک ہی بار کسی سے ہوتی ہے' فی زمانہ بار بار ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فی زمانہ بے وفائی سستی ہے۔ گھر گھر ملتی ہے۔ اس لئے ایک جگہ ٹھوکر کھا کر دوسری جگہ سنبھلنا پڑتا ہے اور سنبھلنے کے لئے کسی دوسری بہتر محبت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

سادات سے بھی ایسی ہی محبت ہوئی' جیسی کبھی وسیم سے ہوئی تھی۔ وہ وسیم کی طرح اس سے بھی ہنستی بولتی تھی۔ رات کو جب اپنے بستر پر تنہا ہوتی تو کروٹیں بدل بدل کر سادات کے بارے میں سوچتی تھی اور آپ ہی آپ مسکراتی رہتی تھی۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ محبت ایک عمل ہے۔ اس عمل سے ایک خوشگوار زندگی کی تعمیر ہوتی رہتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ تعمیری مقصد صرف وسیم ہی سے پورا ہوتا ہو۔ یہ سادات سے بھی ہو سکتا تھا اور ہو رہا تھا لیکن اس کے لئے دیانت داری شرط ہے۔

بشریٰ کی دیانت داری یہ رہی کہ اس نے شادی سے بہت پہلے ہی سادات کو بتا دیا کہ وہ وسیم کو بے حد چاہتی تھی۔ اس چاہت نے اسے سکھادیا کہ محبت میں ایک ذرا اپنی زندگی کو سنوارنے کا انداز بھی ہونا چاہئے۔ وسیم اپنی زندگی کو سنوارنے کے لئے ایک کروڑ پتی گھرانے کی لڑکی کی طرف مائل ہوا تو وہ پہلے اپنی بے قدری پر کڑھتی رہی پھر عقل آگئی۔ اب وہ سادات سے شادی کرکے اپنی قدر و اہمیت بڑھانا چاہتی ہے۔

اس کی صاف گوئی نے سادات کو خوش کر دیا۔ اس نے کہا۔ "بشریٰ! ہمارے ملک کی اکثر لڑکیاں شادی سے پہلے اپنے شوہر کو نہیں جانتیں۔ لہٰذا شادی سے پہلے کبھی رومانس نہیں ہوتا لیکن شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کو یوں چاہتی ہیں کہ سانس اسی کے لئے لیتی ہیں۔ انشاء اللہ تم بھی رفتہ رفتہ مجھے اسی طرح چاہنے لگو گی۔"

سادات کا یہ اعتماد درست ثابت ہوا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اس کی دیوانی ہونے لگی۔ دیوانگی اس لئے بھی بڑھتی گئی کہ وہ کاروباری معاملات میں رات دن سادات کے ساتھ رہتی تھی۔ بشریٰ کو زنانہ ملبوسات کے نت نئے ڈیزائن بنانے اور انہیں تراشنے

میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ بعض اوقات وہ ایسے ڈیزائن تیار کرتی تھی کہ ملبوسات کی دنیا میں کہرام سا مچ جاتا تھا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ فلمی اداکارائیں اس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے اس سے ملاقات کا وقت مقرر کرکے اس کے پاس آتی تھیں۔ ملک سے باہر مڈل ایسٹ اور فار ایسٹ میں سب سے زیادہ ان کے تیار کردہ ملبوسات فروخت ہوتے تھے۔

جب میاں بیوی کی منزل ایک ہو' مزاج ایک ہو اور کاروباری سُوجھ بُوجھ بھی ایک جیسی ہو تو قدم قدم پر کامیابی انعام کی طرح ملتی ہے۔ ایک سال کے بعد ہی بشریٰ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں نے طے کرلیا کہ آئندہ چار سال تک ایک دوسرے سے پرہیز نہ کرنے کے باوجود بچوں سے پرہیز کرتے رہیں گے۔ ایک ہی بچے کی آمد نے بشریٰ کی گھریلو مصروفیات اس قدر بڑھادی تھیں کہ کاروباری معاملات ادھورے رہ جاتے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے ندیم کے لئے ایک گورنس کو مقرر کیا۔ ابتدا میں وہ ڈیزائن تیار کرنے کا کاروبار گھر پر ہی کرتی تھی۔ پھر جب ندیم گورنس سے اچھی طرح مانوس ہوگیا تو وہ دفتر جانے لگی۔

آئندہ تین برس تک ان کے آگے خوشحالی کے دروازے کھلتے ہی رہے۔ جب زندگی یکسانیت سے ہنستی گاتی رواں دواں رہے تو کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آتا۔ زندگی اپنے پیچھے کوئی یادگار کہانی نہیں چھوڑتی بس ترقی ہوتی رہتی ہے۔ عزت اور شہرت ملتی ہے۔ اتنی ملتی ہے کہ آدمی کو یاد نہیں رہتا کہ وہ کبھی رویا بھی تھا۔ ہمارے ہاں کے خوشحال لوگ تو تعجب کرتے ہیں کہ غریب طبقہ روتا کیوں ہے؟ آنسو کیسے نکل آتے ہوں گے؟

سادات کو بشریٰ سے ایک ہی شکایت تھی۔ وہ اسے ہمیشہ زیورات پہننے سے منع کرتا تھا اور بشریٰ کو جنون کی حد تک زیورات کا شوق تھا۔ وہ چھوٹی بڑی تقریبات میں زیورات کی سج دھج کے ساتھ شریک ہوتی تھی۔ بلکہ دفتر میں بھی ایک آدھ ہیرے کا لاکٹ پہن کر ضرور آتی تھی۔ سادات اکثر کہا کرتا تھا۔ "میری جان! تمہارا حسن زیورات کا محتاج نہیں ہے۔ بس کبھی کبھی کسی خاص تقریب میں جاتے وقت پہن لیا کرو۔"

"اور عام تقریبات میں پہننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"لوگوں کی نظر لگتی ہے۔ تم پر نہیں، تمہارے زیورات پر۔ تمہیں یاد ہے پچھلے ماہ راحت کا اغوا ہوا تھا۔"

"یاد ہے۔ اس کا شوہر لیڈر تھا۔ مخالف گروہ کے لوگ انہیں پریشان کر رہے تھے۔"

"بشریٰ! یہ سیاست کی نہیں، دولت کی بات ہے۔ عورت کا پہناوا دیکھ کر چور اچکے اس کے شوہر کی مالی حالت کا اندازہ لگاتے ہیں۔"

"کیا مصیبت ہے۔ اب چوروں کے ڈر سے زیورات پہننا بھی چھوڑ دوں۔ آخر یہ پولیس والے کس دن کے لئے ہیں؟"

"جب چور اپنا کام کر کے نکل جاتے ہیں۔ کوئی قتل ہو جاتا ہے یا کوئی اور جرم معاشرے کو تھوڑا اور کھوکھلا کر دیتا ہے۔ تب پولیس والے حرکت میں آتے ہیں۔ جب کوئی ہمارے ہاں ڈاکا ڈال کر چلا جائے گا۔ تب تم پولیس والوں کو بلا کر کیا کرو گی؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ پہلے سے ہی محتاط رہا جائے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے آج رات ہم گھر میں بیٹھ کر ان چیزوں کی فہرست بنائیں گے جنہیں ہم چوروں کے ڈر سے استعمال نہیں کر سکتے۔ سر فہرست.......... آپ کی کار لکھی جائے گی کیونکہ نئے ماڈل کی اس مرسیڈیز کو دیکھ کر بھی چور اچکے ہماری دولت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے اپنا سر کھجانے لگا۔ "بھئی! تم عورتوں سے بحث میں جیتنا بہت مشکل ہے۔ تمہاری جو مرضی ہو کرو۔ میں کار کے بغیر دفتر نہیں آسکتا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "سیدھی طرح ہار مان جائیں۔ عورت ذات کو بدنام نہ کریں۔ میں جا رہی ہوں۔ شام کے سات بجے تک آپ گھر آجائیں آپ کا سوٹ تیار رہے گا اسے پہن کر گل احمد صاحب کے ہاں پارٹی میں جانا ہے۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا۔" اس نے مسکرا کر اسے بازوؤں میں لیا۔ پھر پیار سے اسے رخصت کیا۔ پیار دل سے ہو تو دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ وہ شام تک اس پیار کے تصور میں کھویا رہا۔ بڑی خوش مزاجی سے کاروباری معاملات کو سنبھالتا رہا۔ شام کے چھ بجتے ہی وہ دفتر سے نکلا۔ اپنی کار میں بیٹھنے کے لئے پارکنگ ایریے میں پہنچا۔ وہاں دو آدمی اچانک ہی دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک نے کہا۔ "ہیلو مسٹر ذرا سنئے۔"

دوسرے نے پوچھا۔ "کیا آپ کا نام احمد سادات ہے؟"

"جی ہاں۔" سادات نے کہا۔ "فرمایئے۔ آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟"

"آپ کی بیوی۔" ایک نے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ ہم آپ کو شاک نہیں پہنچانا چاہتے مگر بتانا ضروری ہے۔ آپ کی بیگم ایک حادثہ میں بری طرح زخمی ہو گئی ہیں۔"

سادات کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دوسرا شخص کہہ رہا تھا۔ "ہم ایمرجنسی وارڈ میں تھے۔ آپ کی بیگم آپ کا نام اور پتہ بتا رہی تھیں۔ اس کار کا نمبر بھی نوٹ کرایا۔ ہم سیدھے ہسپتال سے ادھر آرہے ہیں، اب آپ دیر نہ کریں۔ راستے میں باتیں ہو جائیں گی۔"

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ایک شخص اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا۔ دوسرا پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ پھر گاڑی فوراً ہی اسٹارٹ ہوئی۔ سادات اسے پارکنگ ایریے سے نکال کر آندھی طوفان کی رفتار سے چلانے لگا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ "کون سا ہسپتال ہے؟"

جواب میں ایک ریوالور کی نال اس کی گردن سے لگ گئی۔

☆======☆======☆

بشریٰ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بناؤ سنگھار کا جائزہ لے رہی تھی اور اس خیال سے مسکرا رہی تھی کہ سادات آتے ہی اس کے حسن کی کیسی کیسی تعریفیں کرے گا۔ یہ قیامت کا روپ سنگھار دیکھ کر اسے گلے لگا لے گا نتیجہ کے طور پر سنگھار پھر بگڑے گا۔ اسے پھر سے سنورنا ہوگا۔ وہ جھگڑے گی ذرا غصہ دکھائے گی۔ مگر اندر سے مارے خوشی کے برا حال ہوگا۔ آخر وہ سنگھار ہی کیا جو اپنے مرد کو لوٹ مچانے پر مجبور نہ کر دے۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ اب سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سادات مقررہ وقت پر گھر نہ آیا ہو۔ کسی وجہ سے نہ آتا ہوتا تو وہ فون پر اطلاع دے دیتا تھا۔ سات بجے بشریٰ نے خود ہی دفتر کے نمبر پر فون کیا تھا۔ سیکرٹری نے اطلاع دی تھی کہ وہ چھ بجے ہی دفتر سے جا چکا ہے۔ بشریٰ نے یہ سوچ کر اطمینان کر لیا کہ وہ اپنے مال کے ہول سیلر سے ملنے گیا ہوگا۔

آٹھ بجے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس کا بیٹا ندیم کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ہو بہو

باپ کی طرح تھا۔ بشریٰ کو یوں لگا جیسے سادات آگیا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کو بانہوں میں اٹھالیا۔ سینے سے لگا لیا۔ پھر اسے چومتے ہوئے بولی۔ "سادات صاحب! آپ کہاں رہ گئے ہیں۔ اب تو آجائیں۔"

یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑی۔ ندیم نے کہا۔ "امی! مجھے جلدی سے چھپا لیجئے۔ میڈم مجھے سلانے کے لئے ڈھونڈ رہی ہیں۔"

وہ گورنس کو میڈم کہا کرتا تھا۔ بشریٰ نے کہا۔ "یہ تو بری بات ہے بیٹے! اچھے بچے وقت پر کھاتے' وقت پر پڑھتے اور وقت پر سوتے ہیں۔"

"ابھی نہیں امی! میں ابو کی پپی لے کر سوؤں گا۔"

"تمہارے ابو آئیں گے تو میں تمہاری پپی انہیں پہنچا دوں گی چلو میں تمہیں سلادوں۔"

اسی وقت گورنس کی آواز سنائی دی۔ ندیم نے ماں کے سینے میں منہ چھپالیا۔ ماں نے کہا۔ "میڈم! آج میں اپنے بیٹے کو سلاؤں گی تم جاؤ۔"

گورنس چلی گئی۔ بشریٰ اپنے بیٹے کو لے کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ آہستہ آہستہ تھپک کر لوری سنانے لگی۔ وہ اپنے بیٹے کو اتنا چاہتی تھی کہ ہزار مصروفیات کے باوجود کبھی گورنس کو چھٹی دے کر صبح سے شام تک اس کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ اسے یہ احساس نہیں ہونے دیتی تھی کہ ماں نے اسے بھلا دیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ماں کے گلے میں ننھی بانہیں ڈالے گہری نیند میں ڈوب گیا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ اس نے ننھی بانہوں کو گردن سے الگ کیا۔ اسے سادات کے سوا کوئی فون نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ کسی سے ایسے مراسم نہیں تھے جو رات آٹھ بجے کے بعد یوں کال کرتا لیکن اسے ریسیور پر کسی اجنبی کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو کیا بیگم سادات ہیں؟"

"ہاں' میں بیگم سادات بول رہی ہوں۔"

"بہت اچھے کیا مسٹر سادات غائب ہیں؟"

"کیا بکتے ہو؟ غائب ہونے سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"یہی کہ وہ اب تک تمہارے پاس نہیں پہنچے اور اس لئے نہیں پہنچے کہ ہمارے پاس پہنچے ہوئے ہیں۔"

"دیکھو سیدھی طرح بات کرو مجھے پریشان نہ کرو۔"

"سیدھی بات یہ ہے کہ تمہارا شوہر ہماری قید میں ہے۔ پہلے اس کی آواز سن لو پھر کام کی باتیں ہوں گی۔"

چند ساعتوں تک ریسیور خاموش رہا اس ریسیور سے بشریٰ اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سنتی رہی۔ پھر سادات کی آواز سنائی دی۔ "بشریٰ! میری جان! تم زیادہ پریشان نہ ہونا.........."

"یہ کیا ہے؟ آپ کہاں ہیں سرتاج؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ شاید.........."

بات پوری ہونے سے پہلے سادات کی کراہیں سنائی دیں۔ کسی نے اسے تکلیف پہنچائی ہوگی۔ بشریٰ تڑپ کر اسے آوازیں دینے لگی۔ پھر اسی اجنبی آواز نے ڈانٹ کر کہا۔ "شور نہ مچاؤ۔ ورنہ تمہارا شوہر تمہیں مُردہ ملے گا۔"

"نن نہیں۔ میں چپ ہوں۔ خاموش ہوں۔"

وہ ایک ہاتھ سے منہ دبا کر رونے لگی۔ ریسیور سے آواز آرہی تھی۔ "اب تو تمہیں اطمینان ہوگیا کہ تمہارا شوہر ہمارے پاس ہے کیا تم اسے واپس لینا چاہتی ہو؟"

"تم کیسے پاگل ہو۔ میں اپنا سہاگ واپس نہیں مانگوں گی تو اور کون تمہارے آگے ہاتھ پھیلائے گا۔ تمہیں اللہ رسولؐ کا واسطہ۔"

"بکواس مت کرو۔ ہمارے کاروبار میں اللہ اور رسولؐ کا نام نہیں آتا۔ ہم پچیس لاکھ روپے کا مطالبہ کررہے ہیں۔"

"پچیس لاکھ؟" وہ حیرت سے چیخ پڑی۔ "یہ مطالبہ نہیں مذاق ہے۔ تم نے ہمارے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ ہماری حیثیت پچیس لاکھ نہیں' پچیس ہزار کی ہے۔"

"مجھے تمہاری حیثیت معلوم ہے۔ تمہارے بدن پر جو سونے اور ہیرے کے زیورات ہوتے ہیں ان کی مالیت لاکھوں روپے تک ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایک ہفتہ کی مہلت دے رہا ہوں۔"

"میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں اپنی گاڑی اور تمام زیورات بیچ کر اور بینک کی رقم نکلوا کر بھی پچیس لاکھ جمع نہیں کرسکوں گی۔ جتنی بھی رقم جمع کرسکوں گی۔

وہ تمہارے آگے لاکر رکھ دوں گی۔ اللہ کے لئے انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔"

"ہم زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری دو باتوں کو اچھی طرح اپنے آنچل میں باندھ لو۔ ایک تو یہ کہ پولیس والوں کو اغوا کی اطلاع نہ دینا۔ دوسرے یہ کہ رقم پچیس لاکھ سے کم نہ ہو۔ تم اپنی کوٹھی بیچ دو۔ اپنے آپ کو بیچ دو مگر رقم وہی رہے گی ہماری یہ دو باتیں پوری نہ ہوئیں تو ہم تمہارے شوہر کی لاش تمہارے پاس پہنچا دیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی ادھر سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ وہ ہیلو ہیلو کہہ کر پکار رہی تھی۔ پھر ریسیور اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسے وقت بد حواسی میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا چاہئے۔ بس یوں لگتا ہے کہ روتے رہنے سے مشکل آسان ہو جائے گی۔ آنسو آسمان کو ہلا دیں گے اور دشمن مہربان ہو جائیں گے۔ وہ بہت دیر تک کبھی ندیم کو سینے سے لگا کر روتی رہی۔ کبھی بستر سے اٹھ کر ٹہلتی رہی۔ ٹیلیفون کا ریسیور نیچے لٹک رہا تھا۔ اتنی دیر میں اسے پہلی بار عقل آئی کہ ریسیور کو کریڈل پر ہونا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ اغوا کرنے والے پھر رابطہ قائم کریں۔

اس نے جلدی سے ریسیور کو اس کی جگہ رکھ دیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ سینے کے اندر دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں۔ اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر کہنا شروع کر دیا۔ "ہاں میں بیگم سادات ہوں۔ یہ ریسیور ٹیلیفون سے الگ پڑا رہ گیا تھا۔ آپ کو بار بار رِنگ کرنے کی زحمت اٹھانی پڑی ہوگی۔ مجھے افسوس ہے۔ ویسے میں جانتی تھی کہ آپ اپنے مطالبہ میں کمی کریں گے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ایک بار مجھے سادات سے بات کر لینے دیں۔ پلیز ایک بار........."

دوسری طرف سے جنرل منیجر خالد صاحب کی متحیر آواز سنائی دی۔ "آپ یہ کیا فرما رہی ہیں؟ کیا سادات صاحب گھر میں موجود نہیں ہیں؟"

"آں؟" بشریٰ ایک لمحہ کے لئے ساکت ہوئی۔ پھر جیسے اپنے سامنے کسی ہمدرد کو دیکھ لیا ہو۔ وہ یکبارگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوسری طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ "بیگم صاحبہ کیا ہو گیا؟ آپ تو رو رہی ہیں۔ خدا خیر کرے۔ میں۔ میں۔ ابھی آ رہا ہوں؟"

پتہ نہیں وہ کب تک روتی رہی۔ وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلا۔ گورنس نے آ کر اطلاع دی کہ خالد صاحب آئے ہیں۔ اس نے اپنی خواب گاہ میں انہیں بلا لیا۔ وہ

ٹیلیفون کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ خالد صاحب نے آتے ہی سلام کیا۔ پھر رونے کی وجہ دریافت کرنے لگے۔ بشریٰ ہچکچانے لگی۔ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اغوا کی واردات کو راز میں رکھا جائے یا بیان کر دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ بات پھیلے اور مجرم سادات کو کوئی نقصان پہنچائیں۔

اسے چپ دیکھ کر خالد صاحب نے پوچھا۔ "سادات صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ پتہ نہیں۔ شاید کسی کام سے کہیں رہ گئے ہیں۔"

"آپ فون پر کہہ رہی تھیں کہ آپ کو سادات صاحب سے بات کرنے دی جائے' آپ خوشامدانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔ کیا سادات آپ سے ناراض ہیں؟ بات کرنا نہیں چاہتے؟"

"آں۔ ہاں۔ نن نہیں۔ وہ مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتے۔"

وہ پھر دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ خالد صاحب نے کہا۔ "ضرور کوئی بات ہے۔ آپ کہنا نہیں چاہتیں۔ میرا مشورہ ہے کہہ ڈالیں۔ دل کا بوجھ اتر جائے گا۔ میں نے فون پر مطالبہ والی بات سنی ہے۔ آخر ان باتوں کا مطلب کیا ہوا؟"

وہ ایک دم سے سینہ پیٹ کر بولی۔ "میں لٹ رہی ہوں خالد صاحب! کچھ لوگوں نے ندیم کے ابو کو کہیں قید کر رکھا ہے۔ وہ لوگ پچیس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے بڑی سختی سے دھمکی دی ہے کہ پولیس کو اطلاع نہ دی جائے ورنہ ورنہ........."

وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ خالد صاحب شدید حیرانی سے منہ پھاڑے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "پولیس کو تو اطلاع دینا ہی چاہئے۔"

"نہیں کبھی نہیں۔ وہ لوگ انہیں مار ڈالیں گے۔"

"بیگم صاحبہ ذرا عقل سے کام لیں۔ وہ لوگ محض دھمکی دے رہے ہیں۔ سادات صاحب کو جانی نقصان پہنچا کر انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ انہیں زندہ رکھ کر آپ سے پوری رقم نہ سہی آدھی رقم وصول کرنے کی آس لگائے رکھیں گے۔ آپ اس وقت بہت زیادہ بدحواس ہو گئی ہیں۔ آپ میرے مشورہ پر عمل کریں۔"

"میں سادات کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ لوگ اگر ایک بار مجھے

ان سے باتیں کرنے کا موقع دے دیں تو میں وہی کروں گی جس میں ان کی سلامتی ہو گی۔"

"پچیس لاکھ بہت ہوتے ہیں، بیگم صاحبہ! آپ شاید کار اور کوٹھی بیچ کر بھی پچیس لاکھ روپے جمع نہ کرسکیں گی۔"

وہ کاغذ قلم لے کر حساب کرنے بیٹھ گئی۔ بینک میں کتنی رقم ہے؟ زیورات کتنی مالیت کے ہوں گے؟ کار اور کوٹھی بیچنے سے کتنی رقم حاصل ہوسکتی ہے؟ کوٹھی کی تعمیر میں آٹھ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ بارہ لاکھ میں فروخت ہوسکتی تھی۔ کار بیچنے سے تقریباً ایک لاکھ مل سکتے تھے۔ دو تین لاکھ کے زیورات تھے۔ بینک میں تقریباً ستر یا اسی ہزار روپے ہوں گے یعنی سترہ لاکھ روپے سے زیادہ جمع نہیں کرسکتی تھی۔

خالد صاحب نے کہا۔ "مجھے تو وہ مجرم پاگل خانے کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کیا سوچ کر انہوں نے اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کیا ہے؟ مجھے یوں لگتا ہے کہ انہیں رقم کا اتنا لالچ نہیں ہے۔ لالچ ہوتا تو دو چار لاکھ میں خوش ہوجاتے۔ وہ محض آپ کو پریشان کررہے ہیں۔"

بشریٰ نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے مطالبہ میں کمی کریں گے۔ نہیں کریں گے تب بھی میں اپنا سب کچھ لٹا کر انہیں واپس لاؤں گی۔"

"بیگم صاحبہ! ہمیں ہر پہلو سے کوشش کرنی چاہئے۔ آپ اپنے طور پر کوشش کریں۔ میں اپنے طور پر پولیس والوں سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ پولیس والے آپ سے دور رہیں گے۔ مجرموں کو شبہ نہیں ہوگا کہ آپ نے قانون کا سہارا لیا ہے۔"

وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں جارہا ہوں، صبح آؤں گا۔ اگر رات کو ان کا فون آئے تو آپ مجھے بلوالیں اور پورے ہوش و حواس میں رہ کر بات کرنے والے کے لب و لہجہ کو اچھی طرح ذہن نشین کریں۔ پوری دانائی سے کام لینے کے لئے ضروری ہے کہ آپ سونے کی کوشش کریں۔"

وہ بہت سی باتیں سمجھا کر چلے گئے۔ سونا بشریٰ کے اختیار میں نہیں تھا۔ نیند آنکھوں سے اڑ گئی تھی وہ بار بار ٹیلیفون کی طرف دیکھتی رہی۔ دعا مانگتی رہی کہ یکبارگی فون کی گھنٹی نہ چیخے۔ نہیں تو یکبارگی دم نکل جائے گا۔ رات کے سناٹے میں

گھنٹی چیختی ہوئی سی لگتی ہے۔ ایک بجے وہ چونک گئی۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے خالد صاحب بول رہے تھے۔ "ہیلو بیگم صاحبہ میں نے تھانہ میں رپورٹ درج کرادی ہے۔ یہاں آپ کا تحریری بیان ضروری ہے۔ انشاء اللہ کل تک مجرم گرفتار ہوجائیں گے اور سادات صاحب بخیریت واپس آجائیں گے۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے۔ میں تھانے میں نہیں جاؤں گی۔ ہوسکتا ہے کہ مجرم چھپ کر میری نگرانی کررہے ہوں۔"

"آپ گھر میں بیٹھ کر علاقہ کے تھانیدار کے نام اغوا کی رپورٹ تفصیل سے لکھ کر دستخط کردیں۔ میں وہ رپورٹ یہاں پہنچادوں گا۔"

بشریٰ نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ رات کے دو بجے خالد صاحب ایک سادہ لباس والے کے ساتھ آئے۔ وہ سادہ لباس والا علاقہ کا ایس ایچ او تھا۔ اس نے بشریٰ کو تسلی دی۔ "آپ کا محتاط رہنا اچھی بات ہے۔ ہم بھی پوری احتیاط سے مجرموں تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ کاش! ایک بار میں اس کی آواز فون پر سن لیتا۔ پھر اس کمینے تک پہنچنا میرے لئے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ہم انشاء اللہ کل تک کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل کرلیں گے۔"

وہ اور خالد صاحب اسے تسلیاں دے کر چلے گئے۔ آخر شب سوا تین بجے پھر فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ اس بار فون پر سادات کی آواز سنائی دی۔ وہ درد بھری سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ "کیسی ہو بشریٰ!"

"میں ہر سانس میں مر رہی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟ آپ کب آرہے ہیں؟"

"جان! مجھے بھول جاؤ میں نے تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی ہے نا؟ اگر بھولے سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہو تو............"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کو واپس لانے کے لئے کار اور کوٹھی وغیرہ سب کچھ بیچ دوں گی۔"

"تم اپنا اور ندیم کا خیال رکھنا۔ کچھ بھی ہوجائے اپنا کاروبار کسی دوسرے کے حوالے نہ کرنا۔ میرے بیٹے کو خوب پیار کرنا تم تو بہت دلیر عورت ہو............"

ٹیلیفون کا سلسلہ اچانک منقطع ہوگیا۔ وہ کریڈل پر ہاتھ مار مار کر چیخنے لگی۔ "ہیلو سادات! ہیلو ہیلو جان میری جان آپ کہاں گم ہوگئے۔ جواب دیجئے خدا کے لئے

جواب دیجئے۔"

اس نے جواب سننے کے لئے توقف کیا تو پتہ چلا کہ دوسری طرف ریسیور رکھ دیا گیا ہے۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر سے کوئی چیز نکل کر دور ہوتی جا رہی ہے۔

صبح پانچ بجے پھر ٹیلیفون چیخنے لگا۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ اجنبی آواز نے پوچھا۔ "کون؟ بیگم سادات؟"

"ہاں میں بول رہی ہوں اللہ کے واسطے اپنے مطالبہ میں کچھ کمی کر دو۔ میں..........."

"شٹ اپ۔ اب مطالبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم پولیس والوں سے نمٹ نہیں سکتے۔ اس لئے تمہارا شوہر تمہیں واپس کیا جا رہا ہے۔ پاور ہاؤس کے سامنے وہ فٹ پاتھ پر ملے گا۔"

ریسیور رکھ دیا گیا۔ وہ خوشی سے چیخ پڑی اس نے خالد صاحب کو فون کیا۔ انہیں پاور ہاؤس کے سامنے فوراً پہنچنے کو کہا۔ پھر ریسیور رکھ کر بستر پر آئی۔ ندیم کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ "بیٹے! تمہارے ابو آ رہے ہیں۔ میں ابھی تمہارے ابو کو لے کر آتی ہوں۔"

بچہ نیند میں ڈوبا رہا۔ وہ اسے چوم کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس نے ڈرائیور کو جگایا۔ پھر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر پاور ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی۔

خالد صاحب اس سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے اور سادات کی لاش کے پاس سر جھکائے کھڑے ہوئے تھے۔

☆======☆======☆

بشریٰ اس بات کا جیتا جاگتا نمونہ تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہنستا بستا گھر کیسے اجڑ گیا ہے۔ سیاہ ماتمی لباس میں اس کا سوگوار حسن دیکھ کر دل سے درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں اور دعا لب پر آتی تھی کہ کوئی یوں نصیبوں کی ماری بھری جوانی میں بیوہ نہ ہو۔ بھلے دوسری مصیبتیں نازل ہو جاتیں مگر ایسی کچی عمر میں جوانی بہت رلاتی ہے اور شوہر کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔

چالیس دنوں تک اس گھر میں قرآن خوانی ہوتی رہی۔ بشریٰ کے میکے والے

وہاں آ کر رہنے لگے تاکہ تنہائی میں اس کا دل نہ گھبرائے۔ اس کے میکے والوں کے طفیل وسیم احمد کی آمد و رفت بھی وہاں شروع ہو گئی۔ بشریٰ نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اسے اپنے ماتمی حالات سے باہر جھانک کر دیکھنے کا ہوش نہ تھا۔

رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ وہ ایک بھولا ہوا چہرہ اپنے گھر میں دیکھتی رہتی ہے۔ یہ بات اسے گراں گزری کہ شوہر کا ماتم ہو اور اسی گھر میں محبوب کا سایہ پڑتا رہے۔ وہ کبھی محبوب تھا اب تو نہیں تھا۔ وہ دونوں الگ راہوں پر چل پڑے تھے۔ یہ کیسا مذاق تھا دو مختلف سمتوں میں جانے والے راستے پھر ایک دوراہے پر آ کر ملنا چاہتے تھے وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے اپنی امی سے کہا۔ "آپ اپنے بھانجے کو یہاں آنے سے منع کر دیں۔ اگرچہ یہ بداخلاقی ہو گی لیکن میں مجبور ہوں۔ وسیم کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

دوسرے دن سے وسیم وہاں نظر نہیں آیا۔ بشریٰ کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ اس نے اپنی ساری محبتیں اور ساری توجہ ندیم کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس طرح وہ بیٹے کو سینے سے لگا کر اس کے باپ تک پہنچ جاتی تھی۔ آنسو بھری آنکھوں کے سامنے اس کے بچپن کی تصویر کو دیکھ لیتی تھی۔ یہ درست ہے کہ ہزار محبت کے باوجود کوئی مرنے والے کے ساتھ نہیں مرتا اور نہ ہی ساری عمر کوئی ماتم کرتا ہے۔ بشریٰ رفتہ رفتہ کاروباری مصروفیات میں گم ہونے لگی۔

پولیس والے اب تک تفتیش میں مصروف تھے۔ مجرموں نے کوئی ایسا سراغ نہیں چھوڑا تھا کہ قانون کے محافظ وہاں تک پہنچ سکتے۔ بشریٰ نے تو صبر کر لیا تھا۔ مجرموں کے گرفتار ہونے نہ ہونے سے اس کا سہاگ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔ ویسے دانشمندی سے یہی سوچنا چاہئے کہ مجرم کیفرِ کردار کو پہنچیں' ورنہ ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

وہ حسبِ دستور شام کو دفتر سے گھر آئی تو گورنس رو رہی تھی اس نے بتایا کہ ندیم لاپتہ ہے۔ یہ سنتے ہی بشریٰ جیسے پاگل ہو گئی۔ چیخ چیخ کر گورنس کو نوچ کھسوٹ ڈالا۔ ملازموں کو گالیاں سنا دیں۔ گورنس نے رو رو کر بتایا کہ ندیم لان میں سائیکل چلانے کی ضد کر رہا تھا۔ وہ ندیم کو وہاں چھوڑ کر کوٹھی کے اندر سائیکل لانے گئی۔ اسٹور روم کی چابی نہیں مل رہی تھی۔ چابی تلاش کرنے میں پندرہ منٹ گزر گئے آخر

وہ ناکام ہو کر لان میں واپس آئی تو وہاں ندیم نہیں تھا۔ پورے گارڈن میں اور کوٹھی کے اندر اسے تلاش کیا گیا۔ ملازم کوٹھی کے آس پاس دور تک گئے مگر وہ نظر نہیں آیا۔

بشریٰ چکرا کر گر پڑی۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب بیٹے کی باری ہے۔ ملازم اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔ اسی وقت اسے ندیم کی آواز سنائی دی۔ ”امی!“

اس میں پھر سے جان آگئی۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے دیکھا۔ ندیم کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ وسیم نے اسے گود سے اتارا تو وہ دوڑتے ہوئے آکر ماں کی گردن سے لپٹ گیا۔ وسیم غصہ میں کہہ رہا تھا۔ ”تم کیسی ماں ہو؟ کیا ایک بچے کی نگرانی نہیں کر سکتیں؟ یہ ایک غبارے والے کے پیچھے چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔“

گورنس نے کہا۔ ”لیکن جناب! یہ بچہ ایک غبارے والے کے پیچھے کتنی دور جا سکتا ہے۔ ہم تو دور دور تک دیکھ آئے تھے۔“

وسیم نے کہا۔ ”تم سب اس وقت تلاش کرنے گئے جب میں ندیم کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ یہ سمجھانے کے لئے کہ میری جگہ کوئی دوسرا اسے لے جاتا تو اس کی ماں کو بیٹا کہاں سے ملتا۔ تم لوگوں کی غفلت اور لاپرواہی مجرموں کے حوصلے بڑھاتی ہے۔“

بشریٰ اسے احسان مندی سے دیکھتے ہوئے فرش پر سے اٹھ گئی۔ وسیم نے اسے دیکھا تو اس کی نظریں جھک گئیں۔ وسیم نے ملازموں سے جانے کے لئے کہا۔ جب وہ چلے گئے تو کہنے لگا۔ ”تم نے بہت دولت کمائی ہے مگر اولاد سے بڑی دولت کوئی نہیں ہوتی۔ اس کی حفاظت کرو۔“

یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔ بشریٰ نے کہا۔ ”سنو!“

وہ رک گیا۔ وہ بولی۔ ”چائے پی کر جاؤ۔“

”نہیں بشریٰ اس گھر سے نکالے جانے کے بعد مجھے یہاں کا پانی بھی نہیں پینا چاہئے۔“

”تم ناراض ہو۔ میں ان دنوں مجبور تھی۔ وہ مارے گئے تھے اور تم نظر آرہے تھے۔ پتہ نہیں کیوں میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔“

”اور میں تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لئے ترستا رہتا ہوں۔ تم نہیں جانتیں کہ

جب تم صبح یہاں سے دفتر جاتی ہو اور شام کو واپس آتی ہو تو میں اس سامنے والے کیفے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا تمہیں دیکھتا رہتا ہوں۔ تم نے کون سے دن کون سا لباس پہنا تھا۔ وہ سب مجھے یاد ہے۔“

بشریٰ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ پھر گردن جھکالی۔ اسے یاد آگیا کہ حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وسیم تو شروع ہی سے دیوانہ وار اسے چاہتا ہے۔ وہ بولا۔ ”میں تمہیں دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ اسے میری مکاری سمجھو یا محبت کہ میں نے ندیم کو آدھ گھنٹہ تک اپنے پاس بہلائے پھسلائے رکھا۔ تمہاری آمد کے بعد اسے یہاں پہنچایا تاکہ تم سے دو باتیں کرنے کا بہانہ مل جائے۔“

وہ ندیم کو سینے سے لگائے چپ کھڑی رہی۔ وسیم نے پوچھا۔ ”کیا اب بھی ناراض ہو؟“

”ہاں تمہیں ندیم کو اتنی دیر اپنے پاس نہیں رکھنا چاہئے تھا۔“

”یہ میری غلطی تھی لیکن یہ درست ہے کہ کوئی بھی ندیم کو اس طرح اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ یہ غبارے والے کے پیچھے جا رہا تھا۔ تب ہی میں نے کیفے سے نکل کر اسے گود میں اٹھالیا۔“

”آؤ چائے پی لو۔“

”آج نہیں پیوں گا کیونکہ تم احسان کا بدلہ چکاؤ گی کبھی محبت سے پلاؤ گی تو آکر زہر بھی پی لوں گا۔“

”جیسے تم چاہتے ہو‘ ویسے نہیں بلا سکتی۔ میں اندر سے مرچکی ہوں۔ صرف بیٹے کے لئے عمر کی کڑی دھوپ میں جل رہی ہوں۔“

”تم مُردہ ہو تم نہیں بلا سکتیں مگر میں بلا سکتا ہوں۔ کل میری طرف سے ڈنر کی دعوت قبول کرو۔“

”یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ مجھے مجبور نہ کرو۔“

”میں مجبور نہیں کروں گا۔ یہ تو اپنے من کی موج ہوتی ہے۔ میں کنول ریسٹورنٹ کے ڈائننگ کیبن میں کل رات آٹھ بجے انتظار کروں گا اور جب تک ریسٹورنٹ والے بیٹھنے کی اجازت دیں گے‘ وہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا رہوں گا۔“

وہ جواب سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ بشریٰ نے اسی وقت طے کرلیا تھا کہ وہ

دعوت قبول نہیں کرے گی۔ وسیم کل رات ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہ جائے گا۔ وہ ندیم کو سینے سے لگائے اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ اس نے اپنی دانست میں وسیم کو نظرانداز کردیا تھا لیکن رات کو کھانے کے دوران یاد آیا کہ وہ کوٹھی کے سامنے والے کیفے میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیٹھا رہتا ہے۔

کھانے کے بعد جب وہ ندیم کے کمرے میں گئی تو گورنس اسے تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ بچے کو دیکھ کر پھر یاد آیا کہ وسیم کی جگہ کوئی دوسرا اسے اٹھا کر لے جاتا تو ابھی وہ اتنے سکون سے نہ رہتی۔ بلاشبہ وسیم نے اس کے بیٹے کو اغوا ہونے سے بچا کر بہت بڑا احسان کیا تھا۔

رات کو وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ چونکہ وسیم کو نظرانداز کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس لئے کروٹیں بدلنے والی بے چینی سمجھ میں آئی۔ صبح وہ تیار ہو کر دفتر جانے کے لئے کار میں بیٹھنے لگی تو وہ کیفے یاد آیا۔ وہ کیفے کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

شام کو دفتر سے واپس آئی تو اس نے کار کی کھڑکی سے دور کیفے کی کھڑکی کو دیکھا وہ دور سے بھی ہزاروں کی بھیڑ میں اسے پہچان سکتی تھی۔ وہ بیٹھا ہوا اس کی کار کی جانب دیکھ رہا تھا۔ رات کو ملازمہ نے کھانے کے لئے پوچھا تو وہ اپنے سر کو تھام کر بولی "میں نہیں کھاؤں گی میرے سر میں درد ہے۔ میں ذرا ہوا خوری کے لئے جا رہی ہوں۔"

اس نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لئے کہا۔ اس وقت کیفے کی کھڑکی خالی تھی۔ وہ کار میں بیٹھ کر کنول ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ وسیم ایک کیبن کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ کیبن کے اندر آکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔ مگر آگئی۔ تم نے میرے بچے کو میری گود میں پہنچا کر مجھے نئی زندگی دی ہے۔ اسی لئے میں تمہیں.........."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے اور نہ ہی تم یہاں آکر مجھ پر احسان کرو۔ محبت کسی پر احسان نہیں کرتی۔"

"میں سادات کے سوا کسی سے محبت نہیں کرسکتی۔ کیا تم مجھے گمراہ کرنا چاہتے ہو؟"

"تعجب ہے کہ تم تعلیم یافتہ ہو کر ایسی بات کہہ رہی ہو۔ اگر میں تمہارے شوہر کی زندگی میں ایسا کرتا تو مجھ پر گمراہ کرنے کا الزام درست ثابت ہوتا لیکن میں مناسب وقت پر اپنی کھوئی ہوئی محبت کا مطالبہ کررہا ہوں اور یہ میرا حق ہے۔"

"اپنا حق مجھ سے نہیں کسی اور سے مانگ لو۔"

"کسی سے مانگنا ہوتا تو اب تک شادی کرچکا ہوتا بشریٰ! میں بھی انسان ہوں۔ میں بھی غلطی کرسکتا ہوں' شیبا کی طرف جاکر جو غلطی میں نے کی' اس کی سزا اب تک پا رہا ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ اس وقت تک سزا پاتا رہوں گا جب تک تم مجھے معاف نہیں کروگی؟"

"میں.........." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ بیرا آرڈر لینے آیا تھا۔ وسیم نے مینو دیکھ کر کھانے نوٹ کرائے۔ جب وہ چلا گیا تو بشریٰ نے کہا۔ "میں بھلا تمہیں معاف کرنے والی کون ہوتی ہوں؟"

"یہ تمہاری بے نیازی ہے۔ ورنہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ میں سچائی ہے میں تم سے ٹوٹ کر محبت کرتا آرہا ہوں۔ میری ایک غلطی کو سالہا سال تک معاف نہ کرنا زیادتی ہے بشریٰ۔"

وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ وسیم اس کی اندرونی کشمکش کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میری ایک بری عادت ہے کہ دل میں کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتا۔ اب یہی دیکھو کہ میں تمہارے اندر کی کش مکش کو سمجھ رہا ہوں اور یہ اس طرح کہ تمہیں کالج کے زمانے سے اب تک سمجھتا آرہا ہوں' بعض اوقات کوئی بات کہنے سے پہلے سمجھ لیتا ہوں کہ تم کیا جواب دوگی۔ حالانکہ عورت کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم اس کی اندرونی کشمکش کو سمجھ رہے ہیں مگر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ جو بات منہ میں آتی ہے کہہ جاتا ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی خاموشی توڑتے ہوئے بولی۔ "میں بھی تمہیں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تمہارا دل آئینہ ہے۔ تم اپنی ایک غلطی پر کس طرح پچھتا رہے ہو۔ اس کا احساس مجھے ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہاری طرف سے میرا دل صاف ہوگیا ہے۔ لیکن.......... میں اب کسی کو اپنی محبت اور توجہ نہیں دے سکتی۔"

"کیوں نہیں دے سکتیں؟"

"میرا دل نہیں مانتا۔"

"آج نہیں مانتا' کل مان جائے گا۔ ایک برس بعد یا بیس برس کے بعد مان جائے گا۔ مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ایک لمبی زندگی پڑی ہے تم بڑھاپے میں بھی مسکراؤ گی تو میں اس مسکراہٹ سے شادی رچالوں گا۔"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ تقریباً دو برس کے عرصہ میں پہلی بار اس کے لبوں پر ہنسی آئی تھی۔ وسیم بڑی حسرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اچانک ہی ہنسی رک گئی۔ بیرا کیبن میں داخل ہوا تھا.......... تب بشریٰ کو خیال آیا کہ وہ سوگوار بیوہ ہے۔ اسے ہنسنا نہیں چاہئے لیکن اس کے اندر کی بشریٰ نے بغاوت کردی کہ دو برس گزر چکے ہیں۔ آخر سوگواری کب تک رہے گی۔ غم کی اور خوشی کی اور ہر جذبے کی ایک حد ہوتی ہے۔ اب ماتمی زندگی کی حد ختم ہو چکی ہے۔ اب خوشیاں ایک بار پھر نعمت کی طرح ملنے والی تھیں اور نعمت کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہوتا ہے۔

وہ تذبذب میں پڑگئی۔ بیرے کے جانے کے بعد وسیم نے کہا۔ "ماحضر تناول فرمائیں کس سوچ میں پڑگئیں؟"

"کچھ نہیں۔ بس یونہی۔ مم۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ دیکھو بشریٰ! انسان لاکھ اپنے اوپر سوگواری طاری کرلے مگر زندگی اسے گدگداتی ضرور ہے اسے ہنسنے کا اشارہ دیتی ہے' جو لوگ زندگی کے اشارے پر چلتے ہیں ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ جو نہیں چلتے وہ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح گدلے اور مغموم رہ جاتے ہیں۔ میں پیار سے حکم دے رہا ہوں کہ کھانا شروع کرو۔ ورنہ میں بھی بھوکا رہ جاؤں گا۔"

وہ کھانے کی ڈش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں بھوکا نہیں رکھنا چاہتی۔ چلو ساتھ دے رہی ہوں۔"

عورتوں کے نخرے اسی طرح سمجھ میں آتے ہیں کہ ایک کام انہیں کرنا ہوتا ہے مگر وہ مردوں پر احسان جتا کر کرتی ہیں۔ اسے بھوک لگ رہی تھی مگر شرما رہی تھی۔ اپنی سوگواری کا بھی بھرم رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے وسیم پر بات ڈال کر کھانا شروع کردیا۔

☆======☆======☆

یوں اس کے گھر میں وسیم کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ وہ اکثر بشریٰ کی امی یا اپنے گھر والوں کے ساتھ آیا کرتا تھا تاکہ دنیا والے ایک نوجوان بیوہ کو بدنام نہ کریں۔ پھر کبھی کبھی وہ تنہا آنے لگا۔ کبھی ضد کر کے بشریٰ کو اپنے ساتھ تفریح کے لئے لے جانے لگا۔ اپنوں کی ہی ضد پوری کی جاتی ہے۔ بشریٰ کو خیال نہیں رہتا تھا کہ وہ بے دھیانی میں اسے اپنا سمجھ کر اس کی ضد پوری کرتی ہے۔

پھر دبی دبی زبان سے ان کے میل ملاپ کا چرچا ہونے لگا۔ یہ ایسی بدنامی ہوتی ہے کہ محبت کا نام ہوتا ہے اور تہذیب کی رسوائی ہوتی ہے۔ بشریٰ گھبرا گئی۔ سادات کے ساتھ رہ کر جو دولت' عزت اور شہرت حاصل کی تھی۔ اب اس میں فرق آرہا تھا۔ دولت ویسی ہی تھی۔ عزت پر حرف آرہا تھا اور شہرت کو بھی نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس نے پھر وسیم سے میل جول ختم کردیا۔

وسیم نے سمجھایا کہ شادی کرلی جائے لیکن سادات کے وسیع کاروبار اور دولت نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ وہ سادات کے گھر بیٹھ کر دوسرے شوہر کے تصور سے گھبراتی تھی۔ وسیم نے فون پر رابطہ قائم کیا۔ اسے پھر سمجھانے لگا۔ "بشریٰ! وہ گھر اب تمہارا ہے۔ سادات کا حصہ ختم ہوچکا ہے۔ شادی کے بعد عورت کو جو گھر ملتا ہے وہ اس کا اپنا ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ تم نے سادات کے گھر کو اب تک اپنا نہیں سمجھا اور اگر اب بھی سمجھنا نہیں چاہتی ہو تو مجھ سے شادی کرکے میرے گھر کو اپنالو۔"

"میں سادات کے گھر کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"عورت شادی کے لئے اپنی پیدائشی جگہ کو اپنے بچپن کی یادوں کو اپنے ماں باپ کے گھر بار اور پیار کو چھوڑ دیتی ہے۔ تم نے بھی یہی کیا تھا۔ دوسری بار شادی کے لئے پھر تمہیں یہی کرنا چاہئے۔"

"میں ایسا نہیں کرسکتی۔ ضد نہ کرو۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ بے شک وسیم کو چاہتی تھی لیکن وسیم تک پہنچنے کے راستے کو اپنے لئے دشوار بنا رہی تھی۔ ایک رات اچانک ہی اسے ذہنی جھٹکا پہنچا۔ ایک مدت کے بعد پھر کسی اجنبی نے اسے فون پر ہیلو کہا۔ "ہیلو بیگم سادات! تم نے قرض چکانے سے پہلے پولیس سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آگیا۔ پولیس کے باپ دادا ابھی تک میری گردن تک نہیں پہنچ سکے۔"

بشریٰ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟ اب کیا چاہتے ہو؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟"

"صرف اس لئے کہ مطلوبہ رقم اب تک وصول نہیں ہوئی۔ تمہارا بیٹا تو اب سات برس کا ہو گیا ہو گا۔ تمہارے بغیر رہ جاتا ہو گا؟"

"نہیں۔" وہ چیخ کر بولی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

جواب نہیں ملا۔ ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ وہ بار بار کریڈل پر ہاتھ مار کر ہیلو ہیلو پکارنے لگی لیکن جان بوجھ کر رابطہ ختم کر دیا گیا تھا۔ وہ ڈر کر ندیم کے کمرے میں گئی۔ وہ آرام سے گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے دشمن ادھر چلے آ رہے ہوں اور صبح ہونے سے پہلے اس کے بیٹے کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ وہ پھر دوڑتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں آئی۔ پھر ریسیور اٹھا کر پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کیا۔ "انسپکٹر! پھر اسی شخص نے اغوا کی دھمکی دی ہے۔"

"کس نے دھمکی دی ہے؟ آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں۔ پہلے تعارف تو کرائیں۔"

"اوہ سوری! میں بہت پریشان ہوں۔ میرا نام بیگم بشریٰ سادات ہے۔ میں گلشن اقبال کے بنگلہ ڈی ون سے بول رہی ہوں۔ تین برس پہلے اغوا کرنے والے نے میرے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔ اب آپ کو یاد آیا؟"

"جی ہاں۔ سب کچھ یاد آگیا۔ اچھا تو اب وہی بدمعاش پھر فون کر رہا ہے؟"

"جی ہاں۔ ابھی وہ کہہ رہا تھا کہ تین برس پہلے والی مطلوبہ رقم نہیں ملی ہے۔ اس لئے اب وہ میرے بیٹے کو........"

وہ بات پوری نہ کر سکی، رونے لگی۔ انسپکٹر نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ اس بار وہ قاتل بدمعاش ضرور پکڑا جائے گا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

ریسیور رکھ دیا گیا۔ وہ بھی ریسیور رکھ کر خواب گاہ سے باہر آئی۔ تمام ملازموں اور گورنس کو جگا کر خطرے سے آگاہ کیا۔ پھر ایک ملازم کو وسیم کے گھر دوڑایا کہ اسے بلا کر لے آئے۔ کوٹھی کے اندر اور باہر کی تمام بتیاں جلا دی گئیں تاکہ کہیں اندھیرا نہ رہے۔ کوئی چھپ کر نہ آسکے۔

آدھ گھنٹہ بعد جب وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی پولیس انسپکٹر سے باتیں کر رہی

تھی۔ تب وسیم آگیا۔ انسپکٹر بشریٰ کو مشورہ دے رہا تھا۔ "بیگم صاحبہ! اگر آپ تحفظ چاہتی ہیں تو اپنے ہاں ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگوالیں۔ آپ کے ہاں نائٹ چوکیدار ہوتا ہے۔ سپاہی بھی رہے گا تو کوئی اجنبی احاطہ میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔"

بشریٰ راضی ہو گئی۔ وسیم نے کہا۔ "سپاہی نوکری سمجھ کر نگرانی کرے گا لیکن اپنوں سے زیادہ کوئی دوسرا فرض شناس نہیں ہوتا۔ میں ندیم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اسے دن رات اپنے پاس رکھوں گا۔ کوئی قاتل بدمعاش میری لاش پر سے گذر کر ہی ندیم تک پہنچ سکے گا۔"

انسپکٹر نے ناگواری سے کہا۔ "اگر سب ہی رشتے دار اتنے فرض شناس ہو جائیں تو اس ملک میں پولیس والوں کی ضرورت نہ رہے۔ بے شک آپ کا فرض ہے آپ حفاظت کریں۔"

بشریٰ نے اس ناگواری کو محسوس کیا۔ وہ قانون کے دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "نہیں انسپکٹر صاحب! میں اپنے بچے کے ساتھ قانون کی حفاظت میں رہنا چاہتی ہوں۔ یہاں ایک مسلح سپاہی کے جو اخراجات ہوں گے۔ وہ میں ادا کروں گی۔"

وسیم نے کہا۔ "تم اس گھر کی اور بچے کی مالک و مختار ہو۔ میں بھلا بیچ میں بولنے والا کون ہوتا ہوں؟"

"وسیم ناراض نہ ہو........ میں تمہارے نیک جذبات کو سمجھتی ہوں۔ میری اور ندیم کی حفاظت تم سے زیادہ کوئی نہیں کر سکے گا مگر ہم سے تم سے زیادہ قانون کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں اور مجرم قانون سے دہشت زدہ ہوتے ہیں۔"

اسی وقت بات طے پا گئی اور ایک سپاہی کی ڈیوٹی وہاں لگا دی گئی۔ انسپکٹر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بشریٰ نے کہا۔ "وسیم! میں نے دوسری بار تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا اور اب خود ہی تمہیں بلوایا ہے۔ آج یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ بچہ باپ کے بغیر اور بیوی شوہر کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم ایسا سوچ رہی ہو۔"

"ہاں مجھے تحفظ کی ضرورت ہے۔ میں ندیم کے لئے بہت پریشان ہوں اور تمہاری حفاظت میں رہنا چاہتی ہوں۔"

وہ خوشی سے کھل گیا۔ ”بشریٰ! مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا ہے کہ تم میرے حق میں فیصلہ سنا رہی ہو۔“

وہ ذرا چپ رہی۔ شاید شرما رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”لیکن تمہاری حفاظت میں آنے سے پہلے میں سادات کی تمام دولت اور جائیداد اس کے وارث ندیم کے نام کردوں گی۔ ہم تم صرف اپنی محنت سے کمائیں گے کھائیں گے۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”میں شادی سے پہلے ایسا ہی شریفانہ معاہدہ چاہتا تھا۔ تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ سادات نے اپنی زندگی میں جو کچھ چھوڑا ہے' اس پر صرف ندیم کا حق ہوگا۔ بشریٰ! میں صرف تمہیں چاہتا ہوں تمہیں۔ تم مل جاؤ گی تو مجھے ساری دنیا مل جائے گی۔“

اس نے نظریں جھکا کر سر پر آنچل رکھ لیا۔ وسیم نے پوچھا۔ ”میرے ایک مشورہ پر عمل کرو گی؟“ پھر وہ جواب سنے بغیر بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرنے کے سلسلے میں کسی سے مشورہ نہ لو مجھے ڈر لگتا ہے۔ کسی نے تمہیں میرے خلاف بہکایا تو تم پھر فیصلہ بدل دو گی۔“

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔“

”پھر بھی کسی سے مشورہ لینا کیا ضروری ہے۔ زندگی ہمیں گزارنی ہے اور ہم ایک دوسرے کو ایک عرصے تک سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں کسی سے مشورہ نہیں لوں گی۔“

”ہم اپنے بزرگوں کی موجودگی میں چپ چاپ نکاح پڑھائیں گے۔ پھر گرمیاں گزارنے مری چلے جائیں گے۔ دو ماہ بعد واپس آکر شادی کا اعلان کریں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“

اس نے خاموشی سے تائید میں سر ہلا دیا۔

☆======☆======☆

وہ وسیم کی دلہن بن کر مری پہنچ گئی۔ وہ بیٹے کو جان سے لگا کر رکھتی تھی۔ اس لئے ندیم اور گورنس کو بھی ساتھ لے آئی۔ اس کا کاروبار اتنا وسیع تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک کراچی سے باہر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے وہ مری پہنچتے ہی کاروبار کے سلسلے میں فکر مند رہنے لگی۔ وسیم نے کہا۔ ”فکر کیوں کرتی ہو۔ وہاں تمہارے جنرل منیجر خالد صاحب موجود ہیں۔ وہ سارا کام سنبھال لیں گے۔“

”وہ کاروبار سنبھال سکتے ہیں مگر نئے ڈیزائن تیار نہیں کرسکتے۔ پھر یہ کہ منیجریا دوسرے ملازموں کے بھروسے پر کاروبار چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔“

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”ہم ایک ہفتہ میں واپس چلے جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ اب تم میرے دفتر جاکر سادات کی کرسی سنبھالو گے۔ ہمارے کاروبار کو سمجھو گے۔“

”اور میں جو ملازمت کر رہا ہوں؟“

”اسے چھوڑ دو۔ تم ماہانہ ایک ہزار روپے پاتے ہو۔ ہمارے ادارے سے تمہیں ماہانہ تین ہزار ملیں گے۔“

”یہ تو بہت ہیں۔“

”سادات چھ ہزار روپے ماہانہ لیا کرتے تھے۔ جب تم کاروبار کو ہینڈل کرنے کے قابل ہو جاؤ گے تو تمہیں بھی چھ ہزار ملا کریں گے۔“

”کیا بیوی کے کاروباری ادارے میں ملازمت کرنا مناسب ہوگا؟“

”میں صرف گھر میں بیوی ہوں اور باہر دوست۔ سادات کے ساتھ بھی میری ایسی دوستی تھی۔“

وہ ایک ہفتہ بعد کراچی واپس آگئے۔ وہاں انہوں نے کاروباری حلقوں میں اپنی شادی کا اعلان کرنے کے لئے پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ اسی دعوت میں یہ بھی بتایا

گیا کہ وسیم دفتر میں بھی سادات کی جگہ سنبھالے گا۔ سب لوگوں نے پُر شور تالیوں کی گونج میں اسے مبارک باد دی۔

اس دعوت میں بڑے بڑے سرمایہ دار شریک ہوئے تھے۔ ان میں ایک شخص خستہ حالت میں نظر آیا۔ وہ معمولی لباس اور چپل پہنے ہوئے تھا۔ اس نے وسیم کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب! آپ نے تو مجھے بھلا دیا مگر میں ابھی تک مفلوک الحال ہوں۔ اس لئے آپ کو بھلا نہیں سکتا۔“

وسیم اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”تم۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”جیب خالی ہے۔“

وسیم نے اپنی جیب سے سو سو کے نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو اور بھاگ جاؤ یہاں سے۔“

”ٹھہرو بھائی صاحب! گننے تو دو۔“

وہ نوٹوں کو تھوک لگا لگا کر گننے لگا۔ ”پورے ایک ہزار ہیں بس اتنی رقم ہر مہینے دے دیا کرنا۔“

”کیا تم مجھے۔“ وسیم غصہ میں بلند آواز سے کہتے کہتے ٹھٹک گیا۔ پھر ایک دم سے سرگوشی میں غرایا۔ ”تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟“

”ارے توبہ کرو۔ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں اور بہت کم مانگ رہا ہوں۔ بھائی صاحب!“

وسیم کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت گارمنٹس کا ایک ڈیلر آکر اسے مبارک باد دینے لگا۔ وسیم جبراً مسکراتے ہوئے اس سے رسمی باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بلیک میل کرنے والا جا چکا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔

دو مرد ازل سے ایک عورت کے لئے لڑتے اور مرتے آئے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ہر دور میں یہ ایک نئی کہانی بن جاتی ہے۔ ہر دور کے لوگ فخر کرتے ہیں کہ وہ پچھلے زمانے کے لوگوں سے بہتر اور ترقی یافتہ ہیں لیکن ہر دور کے لوگ پچھلے لوگوں کی تاریخ دہراتے ہیں۔ لباس اور فیشن بدل جانے سے انسانی فطرت نہیں بدل جاتی۔

وسیم ابتدا ہی سے بشریٰ کا دیوانہ تھا۔ وہ شیبا کی طرف دولت کے لالچ میں گیا تھا مگر دل بشریٰ کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ محبت میں اس کی سوچ کا انداز غلط تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ شیبا کو بیوقوف بنا کر کاروبار کے لئے رقم حاصل کرے گا یا اس لڑکی کے ذریعے مڈل ایسٹ جا کر خوب دولت کمائے گا اور بشریٰ کی طرف لوٹ آئے گا۔ اسے یقین تھا کہ بعد میں بشریٰ اسے قبول کرلے گی۔

لیکن نوشتۂ تقدیر اور نوشتۂ کردار میں بڑا فرق ہے۔ تقدیر کا لکھا کبھی مٹ جاتا ہے مگر ہم اپنے کردار سے جو لکھ جاتے ہیں وہ انمٹ ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا انجام دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر ہمارے لکھنے میں ذرا بھی لغزش ہو جائے تو آنے والا وقت ہمیں ٹھوکروں میں اڑا دیتا ہے۔ پہلے وسیم نے اپنے کردار سے بشریٰ کا نام مٹا کر شیبا کا نام لکھا تو بعد میں شیبا کو بھی اپنی زندگی سے مٹانا پڑا۔ بشریٰ بھی ہاتھ نہ آئی۔ اس کے لئے وہ چار برس تک تڑپتا رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ جنون کی حد تک بشریٰ سے محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت میں جنون تھا۔ اسی جنون میں اس نے سادات کو قتل کر دیا تھا۔

بڑی پُر تکلف دعوت تھی۔ کھانے کے بعد ناچ گانے کا پروگرام شروع ہوا۔ بشریٰ عورتوں کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ وسیم اپنے دماغ سے سوچ کا غبار نکالنے کے لئے تنہائی چاہتا تھا لیکن نئے کاروباری لوگوں سے تعارف حاصل ہو رہا تھا۔ نئے تعلقات قائم ہو رہے تھے اس لئے تنہائی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ آخر وہ دردِ سر کا بہانہ کرکے ناچ گانے کی محفل سے اٹھ گیا۔ بشریٰ کی نظروں سے بچتے ہوئے کوٹھی کے اندر گیا۔ پھر وہاں سے چھت پر پہنچ گیا۔

ادھر تنہائی میں بیٹھ کر وہ سوچنے لگا کہ جو غلطی وہ کر چکا ہے، اس کی سزا سے وہ کیسے بچ سکے گا۔ حالانکہ قانون سزا نہیں دے رہا تھا لیکن اس کے دو ساتھی رازدار تھے۔ وہی دو ساتھی، جنھوں نے سادات تک یہ جھوٹی خبر پہنچائی تھی کہ بشریٰ زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئی ہے۔ پھر انھوں نے کار میں بیٹھ کر ریوالور کے ذریعہ بیچارے کو اغوا ہونے پر مجبور کیا تھا۔

ان دو میں سے ایک ساتھی برابر ٹیلیفون پر بشریٰ سے رابطہ قائم کرتا رہا۔ وہ دونوں ساتھی اس بات کے خلاف تھے کہ پچیس لاکھ جیسی خطیر رقم کا مطالبہ کیا جائے۔ لاکھ دو لاکھ روپے کافی ہیں۔ وسیم کو تو پچیس پیسے کا بھی لالچ نہ تھا۔ اس نے اتنا بھاری

مطالبہ محض اسی لئے کیا تھا کہ مطالبہ پورا نہ ہو سکے۔ اغوا محض ایک بہانہ تھا بنیادی مقصد سادات کو اپنے راستے سے ہٹانا تھا۔ سو اس نے ہٹا دیا تھا۔

اگرچہ اس منصوبے پر عمل کرنے میں چار سال کا عرصہ گزر گیا تھا لیکن کامیابی ہوئی تھی۔ اس نے بشریٰ کو حاصل کر لیا تھا۔ خیال تھا کہ اب باقی زندگی سکون سے اس کی زلفوں کی چھاؤں میں گزر جائے گی مگر آج تک کوئی ببول کے کانٹے بو کر گلاب نہیں اگا سکا۔ وہ کامیابی کے نشے میں بھول گیا تھا کہ اس کے دو رازدار ہیں' جو اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ اگر وہ ان دونوں کی زبان بند رکھنے کی کوشش نہ کرتا رہا تو کسی دن بشریٰ کے سامنے سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

وہ تیر اور تلوار کے زخم سہہ سکتا تھا مگر بشریٰ کی نفرت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہی پریشانی اسے چھت پر لے آئی تھی۔ وہ تنہائی میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح اسے ہمیشہ بشریٰ کا پیار ہی پیار ملتا رہے؟ کس طرح دو رازداروں کی زبانیں بند رکھ سکتا ہے؟ اس کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ ان کی جیبیں بھری جائیں' یا اور کوئی مطالبہ ہو تو اسے پورا کیا جائے لیکن بلیک میلروں کے مطالبات شیطان کی آنت کی طرح لمبے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آخری سانس تک ختم ہونے میں نہیں آتے۔

ان رازدار ساتھیوں میں ایک کا نام بابو جان تھا اور دوسرے کا شمو۔ ابھی شمو اس سے ایک ہزار روپے لے کر گیا تھا اور وسیم مالی طور پر اتنا مستحکم نہیں تھا کہ ہر ماہ دونوں کو دو ہزار روپے دے سکتا۔ وہ چھت پر بڑی رات تک بیٹھا رہا اور اسی نتیجہ پر پہنچتا رہا کہ بابو جان اور شمو سے خفیہ طور پر ملنا ہو گا اور ان سے کسی طرح سمجھوتہ کرنا ہو گا۔

وہ چھت سے اتر کر نیچے آیا تو محفل برخاست ہو چکی تھی۔ مہمان واپس جا رہے تھے۔ وہ انہیں رخصت کرنے لگا۔ بشریٰ نے پوچھا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں بڑی دیر تک تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔"

"میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس لئے میں چھت پر چلا گیا تھا۔"

رات کو بستر پر سوتے وقت بشریٰ نے کہا۔ "لاؤ سر دبا دوں تمہارا۔"

"نہیں۔ میں اب ٹھیک ہوں۔"

"تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"نہیں میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"خاک ٹھیک ہو کتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں ماتھے پر شکنیں ڈالے نہ جانے کیا سوچے جا رہے ہو۔"

"وہ۔" وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی ایک غلطی کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔"

"کیا پھر تم نے کوئی غلطی کی ہے؟"

"ن۔ نہیں۔ میں اپنی پہلی غلطی کی بات کر رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ شیبا کی طرف جا کر میں تم سے کتنا دور ہو گیا تھا۔ اگر تقدیر مہربان نہ ہوتی تو تم مجھے کبھی نہ ملتیں۔"

"صرف تقدیر کی مہربانی نہیں تمہاری بھی کارستانی ہے۔"

اس نے ایک دم سے چونک کر دیکھا جیسے بھید کھل گیا ہو۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم شادی کے لئے میرے پیچھے ہی پڑ گئے تھے۔ کیسی کیسی لفاظی سے مجھے پگھلاتے رہے۔ آخر شادی کر ہی لی۔"

وہ ہنسنے لگی۔ وسیم نے اسے کھینچ کر اپنی آغوش میں بھر لیا۔ یہ وہ عورت تھی' جو اس کے دل کی پہلی اور آخری تمنا تھی۔ شیبا کی طرف جاتے وقت اس نے سوچا تھا کہ بشریٰ جیسی بہت مل جاتی ہیں۔ شیبا کی طرف سے لوٹ کر معلوم ہوا کہ بہت سی مل جاتی ہیں مگر بشریٰ جیسی نہیں ملتی۔

اسے بشریٰ کی دولت نہیں چاہئے تھی۔ اس کی عزت اور شہرت سے وسیم کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کار کوٹھی اور بنک بیلنس پر تھوک کر صرف بشریٰ کو چاہتا تھا.......... اگر وہ بابو جان اور شمو کو ساری دولت دے سکتا تو سب کچھ دے کر صرف بشریٰ کو اپنے پاس رکھ لیتا۔ یہ وہ عورت تھی جس کے لئے وہ قاتل بن چکا تھا۔ وقت اور نہ آزمائے ورنہ اس کے لئے وہ اور بھی دو چار قتل کر سکتا تھا۔

دوسرے دن وہ دفتر کی نئی مصروفیات سے وقت نکال کر بابو جان سے ملنے گیا۔ بابو جان نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "میں جانتا تھا کہ سونے کی چڑیا پھنس گئی ہے۔ تم پچھلا حساب چکانے آؤ گے۔"

اس نے بابو جان کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "آئندہ میری بیوی کے متعلق

سوچ سمجھ کر الفاظ استعمال کرنا۔ ورنہ زبان کھینچ لوں گا۔"

"یار گریبان تو چھوڑو۔ میں بھول گیا تھا کہ جسے پھانسا جاتا ہے۔ اس کے پھنسنے کے بعد اسے چڑیا نہیں بیوی کہتے ہیں۔"

اس نے آہستگی سے گریبان چھوڑ دیا۔ ایک دم سے نرم پڑ کر بولا۔ "بابو جان! میں بہت پریشان ہوں میری پریشانی تم ہی ختم کر سکتے ہو۔"

"میں تو تمہارا خادم ہوں۔ بولو پھر کسی کو اٹھانا ہے کیا؟"

وہ تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "نہیں۔ جو غلطی کر چکا ہوں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میری توبہ قبول ہو جائے۔"

"ارے پھر مسجد میں جاؤ ادھر تو مطلب کی بات کرو۔"

"میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ سمجھ لو کہ میں تم لوگوں سے کبھی نہیں ملا تھا۔"

"واہ کیسے سمجھ لوں؟ تمہارے جیسا شریف تو ہم نے دیکھا نہیں۔ پچیس لاکھ روپے کا احمقانہ مطالبہ کیا۔ پھر مطالبہ پورا ہونے کا انتظار کئے بغیر شکار کو ختم کر دیا۔ ہمیں ایک ایک ہزار روپے دے کر ٹال دیا۔"

"آہستہ بولو بابو جان۔"

"آہستہ ہی بول رہا ہوں۔ ہم نے تم سے یہ سن کر صبر کر لیا کہ آئندہ اس کے بچے کو اغوا کیا جائے گا مگر تمہارے تو دن ہی پھر گئے بچے کی ماں کو ہی ہڑپ کر لیا۔ اتنی دولت اور جائیداد کے مالک بن گئے ہو۔ اب تو ہمارا بقایا ادا کر سکتے ہو۔"

"تمہارا حساب کیا ہے؟"

"تم نے مجھے اور شمو کو ایک ایک لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا اب تو دو لاکھ ملنے چاہئے۔"

"میں اس دولت مند عورت کا شوہر ہوں۔ خود دولت مند نہیں ہوں۔"

"یہ سب بے ایمانی کی باتیں ہیں۔ شمو بتا رہا تھا کہ تم نے کل اسے ہزار روپے دے کر دھتکار دیا۔ ہم کتے نہیں ہیں۔"

"یہی میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ ہم کتے نہیں ہیں اور انسانوں کی طرح رہیں گے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ دیانتداری سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میں تم دونوں

کو پانچ پانچ ہزار روپے دوں گا۔ اس کے بعد تم لوگ مجھے بھول جاؤ۔"

"بھئی تم تو دیانت دار بنو گے کیونکہ تمہیں سب کچھ حاصل ہو چکا ہے۔ بے ایمانی تو ہم لوگ کریں گے اس لئے کہ جہاں کچھ نہیں ملتا وہیں بے ایمانی ہوتی ہے۔ میں آخری بات بولتا ہوں۔ میرے کو پچاس ہزار دے دو۔ پھر میں تم دونوں کو نہیں پہچانوں گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میں اپنی بیوی کی دولت کو اپنے لئے حرام سمجھتا ہوں۔"

"ہمارے لئے تو حرام نہ سمجھو۔ میں تم کو ایک ہفتہ کا ٹائم دیتا ہوں۔ ایک ہفتہ کے اندر شرافت چھوڑ دو۔ میرے کو پچاس ہزار دے دو۔ نہیں تو مجھ کو جو کرنا ہو گا کر گزروں گا۔"

وسیم اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگا۔ بابو جان نے کہا۔ "شمو کے پاس جاؤ گے تو یہی جواب ملے گا۔ کل رات ہم نے یہی فیصلہ کیا تھا جو تمہیں سنا دیا۔"

اس کے باوجود وسیم وہاں سے شمو کے پاس گیا۔ اس نے بھی ایک ہفتہ کی مہلت دی۔ مطلوبہ رقم نہ ملنے کی صورت میں دھمکی دی کہ بشریٰ کو اس کا اصلی چہرہ دکھا دیا جائے گا۔ وسیم نے کہا۔ "اگر اغوا اور قتل کا راز کھلے گا تو تم دونوں میرے ساتھ قانون کی گرفت میں آؤ گے۔"

شمو نے کہا۔ "ہم ایسا وقت نہیں آنے دیں گے خود کو منظرِ عام پر نہیں لائیں گے۔ کہیں سے فون پر تمہاری بیوی کو صرف اتنا بتا دیں گے کہ تم کون ہو؟"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے وہ جرم کیا تھا؟"

"ہمارے پاس ایک دوسرے کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے مگر ہم تمہاری بیوی کو تمہاری طرف سے بدگمان کر سکتے ہیں۔"

"وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ مجھ پر شبہ نہیں کرے گی۔"

"جب اتنا اعتماد ہے تو گھر جا کر بیٹھو اور تماشا دیکھو کہ بدگمانی کیسے ہوتی ہے؟"

"نہیں میں اندیشوں میں گھر کر نہیں رہنا چاہتا۔ میں دو ہزار روپے ماہانہ سے زیادہ ادا نہیں کر سکتا۔ جب دونوں کے پچاس ہزار پورے ہو جائیں گے تو میری طرف سے ادائیگی ختم ہو جائے گی۔ تم بابو جان سے مشورہ کر لینا۔ میں پھر آؤں گا۔"

وہ ان کے پاس سے چلا آیا۔ رات کو پھر بشریٰ نے اس کی پریشانیوں کو محسوس کیا۔ "وسیم! تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

"کوئی بات ہو تو چھپائی جا سکتی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

"دو دنوں میں تمہارا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ تم اگر پریشان نہیں ہو تو پھر بیمار ہو۔"

اس نے بہانہ کیا۔ "ہاں میرے آدھے سر میں درد ہے۔ کچھ کمزوری محسوس ہوتی ہے۔"

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ کیا میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔ کیا تمہاری جیب میں ڈاکٹر کی فیس کی رقم نہیں ہوتی؟ کیا ہم کنگال ہیں؟"

"اوہ تم نے تو سوالات کی بوچھاڑ کر دی کل ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"کل کیوں؟ آج کیوں نہیں؟"

"اتنی رات ہو گئی ہے۔"

"جہاں دولت ہو' وہاں رات نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر کی نیند اڑ جاتی ہے۔ دیکھو میں ابھی بلاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ٹیلی فون کی طرف گئی۔ واقعی آدھ گھنٹے کے بعد ڈاکٹر حاضر ہو گیا۔ اس نے اچھی طرح وسیم کا معائنہ کیا۔ بہت سے سوالات کئے۔ پھر نسخہ لکھ کر دیتے وقت بتایا۔ "آپ کے شوہر بہت زیادہ سوچتے ہیں۔ ان کے اعصاب متاثر ہیں میں اعصابی سکون کے لئے یہ گولیاں دے رہا ہوں۔ یہ ایک گولی کھانے کے بعد انہیں نیند آجائے گی۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد بشریٰ نے ناراض ہو کر کہا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ کوئی پریشانی نہیں ہے تم کچھ نہیں سوچتے ہو۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں سوچتا نہیں ہوں۔ انسان جب تک سانس لیتا ہے' سوچتا رہتا ہے۔"

"مگر یوں نہیں سوچتا کہ بیمار پڑ جائے۔ کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے ہو؟"

"میں تو تمہیں اپنے سے زیادہ اپنا سمجھتا ہوں میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لئے اتنے پاپڑ بیلے ہیں کہ.......... کہ.........."

وہ جتنے پاپڑ بیل چکا تھا' انہیں یاد کر کے گڑبڑا گیا۔ بشریٰ نے اس کی گردن میں

باہیں ڈال کر کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ تم میرے لئے دن رات تڑپتے رہے تھے۔ اگر میں مطالبہ کرتی کہ تمہاری جان چاہئے تو تم اپنے آپ کو بھی ہلاک کر دیتے۔"

بشریٰ نے یہ بات بڑی محبت سے کہی تھی مگر محبت سے خنجر بھی لگتا ہے۔ بشریٰ نے ابھی جان دینے کا مطالبہ اس سے نہیں کیا تھا مگر وہ اس کے پہلے سہاگ کی جان لے چکا تھا وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر نے مجھے نیند کی گولی دی ہے مجھے کھلا دو مجھے سلا دو۔"

بشریٰ نے گولی آگے بڑھا دی۔ اس نے گولی کو نگلنے کے بعد تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بشریٰ نے پھر اسے مخاطب نہیں کیا۔ اسے سو جانے کا موقع دیا اور وہ سو گیا۔

خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ کیا چاہتا تھا اور اسے کیا مل رہا ہے۔ وہ زندگی دینے والے پروردگار کو ساری زندگی واپس دے کر صرف بشریٰ کی محبت کا ایک لمحہ چاہتا تھا۔ جہاں محبت میں ایسی دیوانگی ہو۔ وہاں دیوانگی جرائم کی طرف لے جاتی ہے۔ اس نے غلط طریقۂ کار سے بشریٰ کو حاصل کیا تھا۔ اب اس غلطی کو صحیح بنانا چاہتا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ غلطی درست ہونے سے پہلے تلافی چاہتی ہے۔ پہلے اسے بلیک میلروں کو جرمانہ ادا کرنا تھا۔ پھر ذہنی اذیتوں کی سزا بھگتنی تھی۔ اس کے بعد تلافی ہوتی۔

نیند کی گولی اتنا پُرسکون بنا دیتی ہے کہ سکون کی انتہا پر خواب بھی نظر نہیں آتے لیکن اس کا ذہن پراگندہ تھا۔ وہ مختلف پریشانیوں میں الجھا ہوا تھا۔ نیند کی دوا نے اسے تھپک کر سلا تو دیا تھا مگر چونکہ وہ بشریٰ کا مجرم تھا۔ اس لئے بشریٰ کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے خود کو دیکھ رہا تھا۔

وہ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا۔ "بشریٰ مجھے معاف کر دو۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ ایک غلطی کے بعد بے شمار غلطیاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ میں نے شیبا کی طرف جا کر تمہیں کھو دیا تھا۔ تمہیں دوبارہ پانے کے لئے میں نے تمہارے شوہر کو اغوا کیا۔"

بشریٰ نے کہا۔ "نہیں وسیم ایسا نہ کہو تم ایسا ذلت آمیز جرم نہیں کر سکتے۔"

"میں نے کیا تھا۔ میں نے پچیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا اس لئے کیا تھا کہ تم مطالبہ پورا نہ کر سکو۔"

"پھر تمہیں مطالبہ کا فائدہ کیا پہنچا؟"

"میں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اغوا اور بلیک میلنگ کا کیس ہے۔ تمہارے شوہر سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ حالانکہ ذاتی دشمنی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہتا' میں تمہیں حاصل نہ کر سکتا۔ تم بیوی کی حیثیت سے وفادار تھیں۔ میں تمہیں محبوبیت کی طرف لانا چاہتا تھا۔ میں ذلیل ہوں بشریٰ میں ذلیل ہوں' مجھے معاف کر دو۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے میں کس بات پر معاف کر دوں؟"

"اس بات پر بھی کہ میں تمہارے بیٹے کو بھی اغوا کرنا چاہتا تھا مگر تمہیں شوہر کا ماتم کرتے دیکھا تو دل ٹکڑے ہو گیا۔ آہ سیاہ ماتمی لباس میں تم کتنی حسین اور مظلوم لگ رہی تھیں۔ وہ سیاہ لباس میں نے ہی تمہیں پہنایا تھا۔ پھر مجھ میں حوصلہ نہ ہوا کہ میں تمہیں مزید غم دوں اور تمہیں سینہ کوبی کرتے دیکھوں' میں کیسا احمق ظالم ہوں کہ تمہیں چاہا اور تمہیں رلایا۔ مجھے معاف کر دو۔"

"تم نے معافی مانگنے والا کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے تم بڑبڑا رہے ہو۔"

"یہ بڑبڑاہٹ نہیں میرے ضمیر کا بخار ہے' جو میرے اندر سے نکل رہا ہے۔ میں نے اپنے کردار سے اپنے عمل سے اپنے لئے جو پریشانیاں لکھی ہیں۔ انہیں تم ہی معاف کر کے مٹا سکتی ہو۔ ورنہ میں تمام عمر پچھتاوے کی جہنمی آگ میں جلتا رہوں گا۔"

"انسان اپنے عمل سے لکھی ہوئی پریشانیاں اپنے نیک عمل سے ہی مٹا سکتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے معافی نہ مانگو۔ اپنی پریشانیاں آپ مٹانے کی کوشش کرو۔"

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا دن نکل آیا تھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو دن کے دس بجے رہے تھے۔ بشریٰ اس کے پہلو میں نہیں تھی۔ وہ صبح اٹھنے کی عادی تھی۔ دفتر چلی گئی ہوگی۔ وہ غسل سے فارغ ہو کر لباس بدلنے کے بعد ڈائننگ روم میں آیا تو ایک ملازم نے بتایا کہ بیگم صاحبہ ندیم کو کسی بورڈنگ میں داخل کرنے گئی ہیں۔

وسیم کو کچھ عجیب سا لگا۔ ندیم کے معاملہ میں بشریٰ نے اس سے مشورہ نہیں لیا تھا۔ اچانک کسی بورڈنگ میں اسے رکھنے لے گئی تھی۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ اس نے دل میں سہم کر سوچا۔ "کیا بشریٰ کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں اس کے بیٹے کو اغوا کرنا چاہتا

تھا۔ نن نہیں۔ بھلا اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

اس نے رات خواب میں دیکھا تھا کہ وہ بشریٰ سے معافی مانگ رہا ہے۔ "کہیں میں سچ مچ تو نیند میں نہیں بڑبڑا رہا تھا اور بشریٰ نے سب کچھ سن لیا ہو اور سب سے پہلے اپنے بیٹے کی سلامتی کے لئے قدم اٹھایا ہو۔ پھر وہ پولیس والوں سے رابطہ قائم کرے گی۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی کرے مگر میں اس کی نفرت بھری نظریں کیسے برداشت کروں گا۔ میں تو اس کی محبت کے لئے جیتا ہوں۔ نفرت ملے گی تو مر جاؤں گا۔"

اسی وقت پورچ میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ بشریٰ واپس آ گئی تھی۔ وہ ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ کسی ملازم سے باتیں کرتے ہوئے ڈائننگ روم کی طرف آ رہی تھی اور غصہ سے کہہ رہی تھی۔

"مجھ سے پوچھے بغیر تم لوگوں نے وسیم کو ناشتہ کیوں دیا۔ جاؤ دور ہو جاؤ میرے سامنے سے..........."

وسیم کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا۔ اس گھر کا رزق اس پر سے اٹھایا جا رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں آیا۔ وہاں بشریٰ موجود تھی۔ اس نے کہا۔ "تم نے باہر جانے کے لئے یہ لباس نکالا ہے مگر تم اس گھر سے قدم نہیں نکال سکتے۔"

"کک کیوں؟" اس نے ہکلا کر پوچھا۔ "کیا پولیس آنے والی ہے؟"

"پولیس؟" بشریٰ نے حیرانی سے پوچھا۔ "پولیس کیوں؟"

"تم مجھے گھر میں قید کیوں کر رہی ہو؟"

"ڈاکٹر نے کہا ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

وسیم نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تمہیں آرام اور سکون کی ضرورت ہے اور تم ناشتہ میری مرضی سے کرو گے۔ یعنی چائے بند' آج سے دودھ پینا ہو گا مگر تم پولیس کی بات کیا کر رہے تھے؟"

"اوہ۔ وہ میں مذاق کر رہا تھا کہ گھر میں قید کیا ہے تو پولیس کے حوالے بھی کر دو گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم نے بڑی سنجیدگی سے مذاق کیا تھا۔"

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "تم میرا کتنا خیال رکھتی ہو۔ اس قدر دل کی گہرائیوں سے چاہنے والی بیوی مجھ جیسے خوش نصیب کو ہی ملتی ہے۔"

وہ فی الحال مطمئن ہوگیا اس نے بشریٰ کی ہدایات پر عمل کیا۔ چائے چھوڑ دی۔ دودھ پی کر گزارا کرلیا۔ وہ دفتر چلی گئی۔ وہ گھر میں رہا۔ سوچتا رہا کہ خواب میں بشریٰ نے اس کے مجرم ہونے کا یقین نہیں کیا تھا۔ اب بھی وہ معصومیت سے اس پر اعتماد کررہی تھی۔ پھر وہ کیوں پریشان ہے؟

ضمیر پریشان کررہا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ آدمی یا تو بالکل ہی بدمعاش ہو۔ یا بالکل پارسا ہو۔ جو تھوڑا بدمعاش اور تھوڑا پارسا ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر اسی طرح پریشان کرتا ہے۔ کچوکے دے دے کر بدمعاشی ختم کردیتا ہے۔ وسیم کی شرافت اسے پھانسی کے پھندے تک لے جانا چاہتی تھی۔

شام تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ شرافت مہنگی پڑے گی۔ بابو جان اور ثمو کو سمجھانا پڑے گا کہ وہ ماہانہ دو ہزار روپے لینے پر آمادہ ہوجائیں۔ اس سے زیادہ وہ نہیں دے سکے گا۔ دوسرے دن وہ ان دونوں سے ملنے گیا۔ صبح سے دوپہر تک انہیں سمجھاتا رہا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم تھے۔ وہ پچاس ہزار فی کس چاہتے تھے۔ ماہانہ قسطوں کی صورت میں ادائیگی پسند نہیں تھی۔

وسیم جھنجلا کر واپس آنے لگا تو بابو جان نے کہا۔ "ہم آج رات بیگم صاحبہ سے فون پر بات کریں گے۔"

اس نے غصہ سے پوچھا۔ "کیا بات کرو گے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ میں صرف اپنی آواز سناؤں گا۔ بیگم صاحبہ میری آواز کو بھولی نہیں ہوں گی۔"

"تم میری بیوی سے فون پر بات نہیں کرسکتے۔"

"میں تو کروں گا تم روک سکتے ہو تو روک لو۔"

"ٹھیک ہے میں ایک ہفتہ کے اندر مطالبہ پورا کردوں گا۔"

"پھر ہم ایک ہفتہ تک فون نہیں کریں گے۔"

وہ واپس آگیا۔ اب ایک ہفتہ کے اندر دونوں کے پچاس پچاس ہزار کا بندوبست کرنا تھا اور یہ اس کے لئے ناممکن سی بات تھی۔ دراصل اس نے ایک ہفتہ تک انہیں خاموش رکھنے کے لئے جھوٹا وعدہ کرلیا تھا۔ رات کو بشریٰ نے اسے نیند کی گولیاں کھلائیں۔ تب بھی وہ گہری نیند نہ سو سکا۔ آدھی رات کے بعد آنکھ کھل گئی۔

بشریٰ اس کے پہلو میں گہری نیند سو رہی تھی۔ خوابیدہ حسن میں بلا کی کشش تھی۔ جی میں آیا کہ جھک کر اسے چوم لے۔ وہ اس پر جھکا مگر ٹھٹک گیا۔ بشریٰ کے تکیے کے نیچے سے چابیاں جھانک رہی تھیں۔ وہ آہنی تجوری کی چابیاں تھیں۔ تکیے کے نیچے سے جیسے زبان نکال کر چڑا رہی تھیں کہ آؤ ہمت ہے تو ہمیں اٹھالو اور اپنا بیڑہ پار کرلو۔

وہ شش و پنج میں کبھی بشریٰ کو اور کبھی چابیوں کو دیکھنے لگا اسے معلوم تھا کہ تجوری میں لاکھوں روپے کے زیورات ہوتے ہیں۔ کچھ نقد رقم بھی ہوتی ہے۔ ایک ہی بار ہاتھ کی صفائی دکھانے سے بابو جان اور ثمو سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ سکتا تھا۔

وہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اپنا ایک ہاتھ دھیرے دھیرے تکیے کی طرف بڑھانے لگا۔ پھر اس نے دو انگلیوں کی قینچی بنا کر ایک چابی کو گرفت میں لے لیا۔ جیسے جیب کترے دو انگلیوں سے جیب کے اندر کی چیزوں کو گرفت میں لیتے ہیں۔ وہ ایک چابی کو اپنی طرف آہستہ آہستہ کھینچنے لگا۔ اس کے ساتھ دوسری چابیاں تکیے کے نیچے سے نکل کر اس کی طرف جانے لگیں۔

اسی وقت بشریٰ کے گلابی لبوں پر تبسم آیا۔ اس نے ایک دم سے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ایسا لگا جیسے وہ آنکھیں بند رکھنے کے باوجود اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کے جرم پر مسکرا رہی ہے۔ پھر وہ خوابوں کے دریچے سے جھانک کر کہنے لگی۔ "وا۔ سی۔ یم میں تمہے جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ تم میری پہلی آخری محبت ہو۔"

واقعی پہلی محبت وہی تھی۔ درمیان میں سادات آگیا تھا۔ اب آخری محبت بھی وہی تھا۔ بشریٰ خواب میں بھی اس کا کلمہ پڑھتی تھی۔ وسیم محبت سے عقیدت سے اور ندامت سے چور چور ہوکر اس سے لپٹ گیا اور بے اختیار اسے چومنے لگا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو وہ ذرا بوکھلائی پھر سب کچھ سمجھ کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیا۔

صبح تک اس کی سمجھ میں آگیا کہ اب وہ بشریٰ کی لاعلمی میں بھی ایسی کوئی غلطی نہیں کرسکتا جس پر اس کا ضمیر بعد میں ملامت کرے۔ اس نے اسی دن بابو جان اور ثمو سے ملاقات کی ان سے صاف صاف کہہ دیا۔ "دیکھو میں یکمشت تم لوگوں کا

مطالبہ پورا نہیں کرسکوں گا۔ ماہانہ دو ہزار طے کرلو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو میرے خلاف جو کرنا چاہتے ہو کرتے رہو۔"

بابو جان نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ پھر چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے بڑے دلیر بن کے آئے ہو؟"

شمو نے کہا۔ "میں سب سمجھتا ہوں۔ ہمارے پاس کسی کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لئے اکڑ رہے ہو۔"

"وسیم نے کہا یہی سمجھ لو۔ میری بیوی مجھ پر اندھا اعتماد کرتی ہے۔ وہ مجھے مجرم سمجھ ہی نہیں سکتی۔"

"شبہ تو کرسکتی ہے؟"

"میں رفتہ رفتہ اس کا شبہ دور کردوں گا۔ تم لوگ میری فکر نہ کرو۔ اپنا معاملہ طے کرو۔"

"ہم نہ تو بلیک میلر ہیں نہ بھکاری ہیں کہ ہر ماہ تم سے ایک مقررہ رقم کی خیرات لیتے رہیں۔ ہم یکمشت رقم لیں گے۔"

"میرے پاس نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ جواب سنے بغیر چلا آیا۔ اس کا دل اندر سے ڈر رہا تھا اور وہ خود کو تسلیاں دے رہا تھا بشریٰ ٹھوس ثبوت کے بغیر اسے مجرم نہیں سمجھے گی۔ اس دن سے وہ انتظار کرنے لگا کہ بابو جان اور شمو اس کے خلاف جانے کب کون سا قدم اٹھائیں گے اور بشریٰ پر اس کا ردعمل کیا ہوگا؟

ایک دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ پھر وہی اعصابی کھنچاؤ کا شکار ہوگیا۔ دوسرا دن بھی گزر رہا تھا اور وہ دونوں اس کے خلاف کوئی حرکت نہیں کررہے تھے۔ یوں کہنا چاہئے کہ اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا کر سب سے بڑا قدم اٹھا رہے تھے۔ اسے انتظار' بے چینی' کرب اور اعصاب کشیدگی کی سزا دے رہے تھے۔

دوسری رات وہ بشریٰ کے ساتھ سونے کے لئے خواب گاہ میں آیا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ بشریٰ نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ وہ ایک سگریٹ سلگاتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ بشریٰ فون پر باتیں کرتے ہی سہم گئی ہے۔ وہ

پوچھ رہی تھی۔ "کون ہو تم؟"

وسیم کی انگلیوں میں سگریٹ کانپنے لگا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے بشریٰ کو دیکھا۔ وہ بھی ریسیور کان سے لگائے اسے دیکھ رہی تھی اور کسی کی باتیں سن رہی تھی۔ پھر اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہی آواز ہے۔ یہ وہی ہے جس نے سادات کو اغوا اور قتل کیا تھا۔"

وسیم اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ جلدی سے بولا۔ "مت سنو اس کی باتیں۔ ریسیور رکھ دو ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہئے۔"

بشریٰ نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ دوڑ کر وسیم سے یوں لپٹ گئی جیسے وہ قاتل چلا آرہا ہو۔ "وسیم میرا بیٹا بورڈنگ میں ہے۔ وہ لوگ اسے نقصان تو نہیں پہنچائیں گے؟"

"وہ نہیں جانتے ہیں کہ ندیم کہاں ہے؟"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ندیم کے بارے میں نہیں جانتے ہیں؟"

اتنے میں پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وسیم نے بشریٰ کو اپنے سے الگ کیا پھر ریسیور اٹھا کر دھاڑتے ہوئے بولا۔ "تم کون ہو؟ کیا بکواس کررہے ہو؟ یاد رکھو اب اس گھر میں وسیم رہتا ہے۔ تمہارے جیسے کمینے میری بیوی اور بچے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

جواب میں سنائی دیا۔ "استاد بڑی اچھی ایکٹنگ کررہے ہو مگر کب تک کرتے رہو گے؟"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بشریٰ نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہے گا کیا؟ میری آواز سنتے ہی ریسیور رکھ کر بھاگ گیا ہوگا۔ آئندہ تم اس کی آواز سنتے ہی ریسیور رکھ دیا کرو۔ بار بار پریشان کرے تو کہنا کہ وہ مرد ہے تو مجھ سے باتیں کرے۔ بہرحال تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔"

اس نے بشریٰ کو خوب سمجھایا۔ خوب تسلیاں دیں۔ اسے اتنا پیار دیا کہ وہ مطمئن ہوکر سوگئی۔ وسیم کو بھی پہلی بار اطمینان ہوا کہ بابو جان اور شمو کھل کر سامنے نہ آسکیں گے۔ کیونکہ وہ بھی مجرم تھے اور ایک مجرم کی نشان دہی کرکے خود بھی گرفت میں آسکتے تھے۔ باقی رہی فون پر چھیڑنے کی بات تو اس نے طے کرلیا کہ ہمیشہ بشریٰ کے ساتھ رہے گا اور اسے ان شیطانوں کا فون اٹینڈ کرنے نہیں دے گا۔

اسے اطمینان اور خوشی کے مارے نیند نہیں آرہی تھی۔ ایک گھنٹہ تک نیند کا انتظار کرنے کے بعد اس نے دو خواب آور گولیاں کھائیں' پانی پیا۔ پھر بشریٰ کو اپنے پاس سمیٹ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایسی گہری نیند آئی کہ فون کی چیختی ہوئی گھنٹی کی آواز سن کر بھی آنکھ نہ کھلی۔ بشریٰ نے نیند میں کسمسا کر کروٹ بدلی۔ پھر ریسیور اٹھاتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ "کیا مصیبت ہے رات کو سونے بھی نہیں دیتے۔"

اس نے ریسیور کو کان سے لگایا۔ نیم غنودگی کی حالت میں سرگوشی سنائی دی۔ "قاتل تمہارے پاس ہے۔ تمہارا دوسرا شوہر تمہارے پہلے شوہر کا قاتل ہے۔ قاتل ہے۔ قاتل ہے اور تمہارے پاس ہے.........."

بشریٰ نیند میں ڈوبی ہوئی سانسیں لینے لگی۔ وہ سو رہی تھی اور جاگ رہی تھی۔ بعض حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ ہم سونے اور جاگنے کی حالت کا تعین نہیں کر سکتے یا ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعوری طور پر جو بات ہوتی ہے وہ غیر شعوری طور پر خواب کی دنیا میں پھیلتی جاتی ہے۔

ریسیور سے جو بھی آواز آرہی ہو مگر بشریٰ خواب میں دیکھ رہی تھی کہ وسیم سادات کا گلا گھونٹ رہا ہے اور کہتا جا رہا ہے۔ "بشریٰ میری ہے۔ بشریٰ میری ہے۔ تو کانٹا ہے۔ میں تجھے دور پھینک رہا ہوں۔ بشریٰ صرف میرے لئے پیدا ہوئی ہے۔ وہ میری ہی آغوش میں رہے گی۔"

بشریٰ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہی تھی۔ "نہیں وسیم میرے سادات کو چھوڑ دو۔ میں تمہیں اپنی جان بیچ کر بھی پچیس لاکھ روپے دے دوں گی مگر میری جان کو چھوڑ دو۔"

لیکن وسیم نے اسے ختم کر دیا۔ خواب کے دوسرے منظر میں وہ دلہن بنی ہوئی تھی اور وسیم فاتحانہ انداز میں اسے آغوش میں لے کر ایک تمغے کی طرح سجا رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو رہی تھی ٹیلی فون ریسیور اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک گم صم سی سوچتی رہی کہ ریسیور اس کے پاس کیسے آیا؟ کب آیا؟

پھر کچھ دھندلا سا خیال آیا کہ رات کو کسی کا فون آیا تھا مگر کس کا فون آیا تھا؟ اس نے یاد کیا تو نیند میں سنائی دینے والی سرگوشی یاد آئی۔ اس کے ساتھ ہی خواب یاد آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بے اختیار وسیم سے ذرا دور بستر پر کھسک گئی۔ جیسے سانپ ڈسنے

والا ہو۔

ابھی وسیم سے ڈرنے کا جواز نہ تھا۔ ابھی تو وہ اپنے خواب سے ڈر رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ خواب کہاں تک سچے ہو سکتے ہیں؟ خواب تو الٹے سیدھے بھی ہو سکتے ہیں۔ وسیم ایسا نہیں ہو سکتا۔

اسے فون کرنے والا بابو جان ماہرِ نفسیات نہیں تھا۔ محض اتفاقاً اس نے رات کے اس حصے میں فون کیا تھا' جب بشریٰ بیداری اور غنودگی کے درمیان تھی۔ بیداری وقتی تھی غنودگی کے عالم میں وہ جو کچھ سنتی رہی' اسے خواب میں دیکھتی رہی اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی کی چغلی اتنی اثر نہیں کرتی' جتنا کہ خواب اثر دکھاتے ہیں۔ بظاہر بشریٰ نے اسے خواب سمجھ کر اس وقت نظرانداز کر دیا مگر غیر شعوری طور پر وہ بات اس کے دماغ میں نقش ہو گئی تھی۔

اس روز وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وسیم سے ذرا کھنچی کھنچی سی رہی۔ دفتر میں اس نے اپنی سیکرٹری سے پوچھا۔ "کیا خواب درست ہوتے ہیں؟"

سیکرٹری نے جواب دیا۔ "میری امی کہتی ہیں کہ صبح اذان کے وقت جو خواب نظر آتے ہیں' سچے ہوتے ہیں۔"

بشریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو اس وقت اذان کی آواز سنائی دی تھی۔ توہمات اسی طرح گھیرتے ہیں۔ خواب کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ اس نے ندیم کو بورڈنگ سے بلایا۔ رات کو وسیم کے ساتھ خواب گاہ میں نہیں سوئی بیٹے کے ساتھ رات گزارنے کے بہانے دوسری خواب گاہ میں جا کر صبح کر دی۔ ناشتہ کرنے کے بعد ندیم کو اپنے ساتھ دفتر لے جانا چاہتی تھی۔ وسیم نے پوچھا۔ "کیا حماقت ہے؟ تم اتنی محتاط کیوں ہو گئی ہو؟"

"کیا مجھے محتاط نہیں رہنا چاہئے؟"

"ضرور مگر گھر کی چار دیواری میں نہیں۔"

"کیوں۔ گھر میں چور نہیں ہوتے کیا؟"

بشریٰ کے جواب دینے کے انداز نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا وہ پریشان ہو کر بولا۔ "آں۔ گھر میں بھی چور ہوتے ہیں۔ تمہیں کس پر شبہ ہے؟"

"ابھی سوچ رہی ہوں۔ وسیم میں .ت پریشان رہتی ہوں۔ میں اپنے بیٹے کی

حفاظت کے لئے جو کچھ بھی کروں۔ اس پر تم اعتراض نہ کیا کرو۔"

وہ بیٹے کو اپنے ساتھ دفتر لے گئی۔ تین دن کے بعد اسے دفتر کے پتے پر ایک خط ملا۔ اس میں سادات کے اغوا اور قتل کی پوری تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ خط کے آخر میں وسیم سے یہ سوال کرنے کے لئے کہا گیا تھا کہ جن دنوں اغوا اور قتل کی واردات ہوئی ان دنوں وسیم کہاں تھا؟

اس خط نے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ وہ خواب جو دماغ کے چور خانہ میں چنگاری کی طرح تھا۔ اب شعلہ بن گیا۔ وہ اپنے بیٹے کو میجر خالد صاحب کے ہاں لے گئی۔ اسے وہاں اپنی امانت کے طور پر رکھا اور تاکید کردی کہ جب تک وہ خود بیٹے کو لینے نہ آئے اس وقت تک اسے کسی اور کے حوالے نہ کیا جائے۔ خواہ وہ وسیم ہی کیوں نہ ہو۔

وسیم دفتری کاموں میں مصروف تھا۔ اسے اتنا معلوم تھا کہ وہ ندیم کو لے کر کہیں گئی ہے۔ واپسی پر اسے تنہا دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "ندیم کہاں ہے؟"

"وہ جہاں بھی ہے' محفوظ ہے۔ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ وسیم نے اسے لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ خط کھولنے اور پڑھنے کے دوران وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی۔ وسیم نے خط شروع کرتے ہی چونک کر بشریٰ کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ۔ یہ کیا بکواس ہے؟ یہ کس نے لکھا ہے؟"

"لکھنے والے کا نام نہیں ہے لیکن اس نے قاتل کی نشاندہی کی ہے۔ پہلے پورا خط پڑھ لو۔"

وہ پڑھنے لگا۔ بشریٰ اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت کو پڑھنے لگی۔ دونوں اندر سے سہمے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جرم ثابت نہ ہو۔ یہ سوچ رہی تھی کہ اس کا وسیم مجرم نہ نکلے۔ ایسا ہوا تو محبت پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔

وسیم نے خط کو مٹھی میں بھینچتے ہوئے کہا۔ "یہ بکواس ہے۔ میں اسے پھاڑ ڈالوں گا۔"

وہ خط کو پھاڑنا چاہتا تھا بشریٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اس سے وہ کاغذ لیتے ہوئے بولی۔ "اسے پھاڑ کر اپنی کمزوری ظاہر نہ کرو۔"

"کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو؟"

"میری اپنی رائے محفوظ ہے۔ میں تمہاری زبان سے اس خط پر تبصرہ سننا چاہتی ہوں۔ صرف بکواس کہہ دینے سے بات ختم نہیں ہوگی۔"

"پتہ نہیں خط لکھنے والے کو مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ وہ مجھ پر اتنا سنگین الزام کیوں لگا رہا ہے' یہ میں نہیں جانتا۔ اگر تم مجھے مجرم سمجھ رہی ہو تو ابھی مجھے قانون کے حوالے کردو۔"

"میں ابھی یہ نہیں جانتی کہ میں کیا کروں گی لیکن تمہیں حیران کردینے والی بات بتاؤں کہ ایک رات میں نے خواب میں تمہیں اغوا کرنے والے اور قتل کرنے والے کے روپ میں دیکھا تھا' یہ خط اس خواب کو سچ ثابت کررہا ہے۔ خط لکھنے والے کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے۔ پھر دونوں باتیں ایک جیسی کیوں ہوگئیں؟"

اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "تم نے خواب میں مجھے قاتل کی حیثیت سے دیکھا تھا مگر کیوں؟ کیا پہلے سے مجھ پر شبہ کررہی ہو؟"

"نہیں صرف تین چار دنوں سے شبہ کررہی ہوں۔ اسی لئے آج میں نے ندیم کو ایک محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔ جب تک قاتل سامنے نہیں آئے گا۔ میں اپنے بیٹے کو تمہارے سامنے نہیں لاؤں گی۔"

"کیا تم مجھے اتنا کمینہ سمجھتی ہو کہ میں اپنے ندیم کو............"

"وہ تمہارا نہیں سادات کا خون ہے اور سادات کا خون اچھالا گیا ہے۔ اب میرے پاس اس کا جو خون ہے۔ میں آخری سانس تک اس کی حفاظت کروں گی۔"

دونوں کے درمیان تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر وسیم نے کہا۔ "تم سمجھ دار ہو۔ اگر میں مجرم ہوں تو یہ کیسے توقع کرتی ہو کہ اپنے جرم کو تسلیم کرلوں گا۔"

"وسیم ہم عدالت میں نہیں ہیں۔ وہاں دلائل اور گواہوں سے جرم ثابت کیا جاتا ہے۔ میں یہ سوال نہیں کروں گی کہ تم ان دنوں کہاں تھے جن دنوں اغوا اور قتل کی واردات ہوئی تھی۔ اس لئے کہ میں کوئی عدالت قائم نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیا تم اپنے سہاگ کے قاتل کو سزا نہیں دلاؤ گی؟"

"اگر کوئی اور ہے تو اسے قانون کے حوالے ضرور کروں گی۔" وہ اپنی جگہ سے

اٹھ کر بولی۔ "اگر تم ہو تو میں تمہیں تمہارے ضمیر کی عدالت میں چھوڑ کر قطع تعلق کرلوں گی۔ میں گھر جارہی ہوں تم یہاں بیٹھ کر سوچو سمجھو پھر فون پر اقبال جرم کرلینا............"

یہ کہہ کر چلی گئی۔ وہ اسے روک نہ سکا' اس کا آخری جملہ کہ "فون پر اقبال جرم کرلینا۔" دل کو لگا تھا۔ کیونکہ وہ سچ مچ اس کے روبرو اقبال جرم سے شرمارہا تھا۔ ندامت سے مراجارہا تھا۔

بشریٰ نے گھر آکر خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر بستر پر گر کر رونے لگی۔ وسیم کی باتوں سے اور ہچکچاہٹ سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ مجرم ہے۔ آج وہ وسیم کو بہت بڑی خوش خبری سنانے والی تھی۔ "وسیم! پتہ ہے میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں تمہارے بچے کی ماں............"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "ہائے کیا ہے میرے مقدر میں؟ تھوڑی سی مسرتوں کے بعد رونا ہی لکھا ہے۔ پہلے وسیم کی محبت ملی بہار آئی۔ پھر دغا ملی تو آنسوؤں کی برسات ہوئی۔ اس کے بعد سادات نے مسرتوں کے پھول کھلائے اور خود مرجھا کر زندگی سے ٹوٹ گیا آنسو پھر مقدر بن گئے۔ جیسے موسم بدلتے ہیں۔ ویسے ہی مقدر بدلتا ہے۔ وسیم نے پھر محبت کا سہارا دیا۔ اب یقین تھا کہ زندگی میں کوئی الم ناک واقعہ نہیں آئے گا۔ مگر گڑے مُردے اکھڑ گئے۔ پولیس قاتل تک نہیں پہنچ سکی تھی اور بشریٰ خواب اور خط کے ذریعے پہنچ رہی تھی اور رو رو کر ہلکان ہورہی تھی۔

شام کے سات بجے فون کی گھنٹی بجی۔ "بشریٰ! کیا جب تک قاتل سامنے نہیں آئے گا تم ندیم سے دور رہوگی؟"

"ہاں۔ تم ندیم کی نہیں اپنی بات کرو۔ وسیم' تم نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی اور دھوکا بھی دیا۔ اس بار بھی جھوٹ بول کر دھوکا نہ دینا۔ اسی لئے میں نے تمہیں ضمیر کی عدالت کے حوالے کردیا ہے۔"

"تم مجھے سزا کیوں نہیں دلاؤ گی۔ قانون کے حوالے کیوں نہیں کروگی؟"

وہ چپ رہی اس نے اصرار کیا۔ "جواب دو بشریٰ۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میں ماں بننے والی ہوں۔"

"سچ؟" وسیم نے خوشی سے چیخ کر پوچھا۔ "کیا لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں؟"

"ہاں میں ایک ایسے بچے کی ماں ہوں جس کا باپ مقتول تھا۔ اب ایک ایسے بچے کی ماں بننے والی ہوں جس کا باپ قاتل ہوگا۔ میں دونوں بچوں سے کیسے کہوں گی کہ کس کا باپ کون تھا؟ اور کیسا تھا؟ تم میرے ہونے والے بچے کے باپ ہو' میں کس دل سے تمہیں قانون کے حوالے کروں گی۔ تم مرد ہو۔ فیصلہ کرو کہ تمہاری سزا کیا ہو؟"

"میں بڑی سے بڑی سزا پانے کے لئے تیار ہوں مگر تم سے الگ رہنے کی سزا برداشت نہیں کرسکتا۔"

"جب تک تمہارے ضمیر کی عدالت کوئی معقول فیصلہ نہ سنائے میں تم سے الگ رہوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے ہونے والے بچے پر تمہارا سایہ پڑے۔"

"وہ میرا بھی ہے۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ اس کے باپ کے نام کے ساتھ قاتل کا لفظ آئے؟"

وہ جواب نہ دے سکا۔ ریسیور رکھ کر رابطہ ختم کردیا۔ بشریٰ ریسیور تھامے انتظار کرتی رہی پھر وہ بھی فون کے پاس سے ہٹ کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا سر بھاری ہورہا تھا۔ دل پر بھی بوجھ سا محسوس ہورہا تھا۔ رہ رہ کر سادات کا مظلوم چہرا آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا اور وہ بے اختیار رونے لگی تھی۔

اس رات وسیم نہیں آیا۔ دوسرے دن دفتر میں بھی نہیں آیا۔ بشریٰ کے دل میں یہی بات آئی کہ اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کہیں بھاگ گیا ہے لیکن دوسری رات پھر فون پر اس کی آواز سنائی دی۔ "بشریٰ اللہ تعالیٰ کے دربار میں تین بار توبہ قبول ہوجاتی ہے تم نے ایک بار مجھے معاف کیا تھا۔ کیا دوسری بار معاف کرسکتی ہو؟"

وہ بولی۔ "انسان اپنے اعمال سے اپنے گناہ لکھتا ہے اور معافی دوسروں سے چاہتا ہے۔ وسیم تقدیر کا لکھا مٹ سکتا ہے لیکن نوشتۂ کردار نہیں مٹ سکتا۔ اللہ ہی معاف کرے تو کرے۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ اب تم میری زندگی میں نہیں آؤ گے۔ حتیٰ کہ میرے سامنے بھی کبھی نہیں آؤ گے۔"

"بشریٰ! میں تمہاری نفرت کو سمجھتا ہوں۔ کل تم نے ایک خوش خبری سنائی کہ میں تمہارے بچے کا باپ بننے والا ہوں۔ یقین کرو میں تمہیں آغوش میں لے کر چومنے کے لئے تڑپ گیا ترس گیا۔ میں نے آج صبح اور شام کیفے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر

تمہیں دفتر جاتے اور آتے دیکھا۔ آج تم میرے بچے کی ماں لگ رہی تھیں۔ سچ مچ ایک بھاری بھرکم پُروقار عورت لگ رہی تھیں۔ اسی لمحہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ تمہاری عظمت کے سامنے مجھے مرجانا چاہئے۔"

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کردیا۔ بشریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ "کیا وہ اپنی جان دے دے گا؟"

اس نے کبھی نہیں چاہا کہ سادات کی جان جائے۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وسیم خودکشی کرلے۔ وہ جیسا بھی تھا اس کا سہاگ تھا پہلے سہاگ کا قاتل تھا مگر پھٹے ہوئے آنچل کی طرح سرپر تھا۔ وہ ساری زندگی اس سے دور رہ کر اور کبھی اس کی صورت نہ دیکھ کر اپنے سہاگن ہونے کا بھرم رکھنا چاہتی تھی۔

دوسرے دن اس کا فون نہیں آیا۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ رات بھر فون کے انتظار میں سو نہ سکی۔ دوسرے دن دفتر میں بھی ہر فون............ پر اسی کا خیال آتا رہا۔ آخر دوسری رات فون پر اس کی آواز سنائی دی۔ "بشریٰ! میں بہت مصروف رہا۔ مجھے ایک ایسے مکان کی ضرورت تھی جہاں میں کسی کی مداخلت کے بغیر مرسکوں اور وہاں ٹیلی فون بھی ضروری تھا۔ کیونکہ آخری وقت میں تمہاری آواز سنتے سنتے جان دینا چاہتا ہوں اور اب ایسا مکان مل چکا ہے۔ میں اسی مکان کے ایک کمرے میں بیٹھا تم سے باتیں کررہا ہوں۔"

"وسیم! میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ تم اپنی جان دے دو۔ وہاں سے واپس آجاؤ۔"

"واپس کس دنیا میں جاؤں گا۔ میرے جرم کے دو شریکِ کار ہیں۔ وہ مجھے شرافت کی زندگی گزارنے نہیں دیں گے میں انہیں رشوت نہیں دینا چاہتا۔ ایک غلطی کے بعد میں نے کئی غلطیاں کیں' اور غلطیاں کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے سوچا تھا کہ ان دونوں کے ساتھ خود کو قانون کے حوالے کردوں۔ مگر میری بیوی کی حیثیت سے تمہیں بھی عدالت میں آنا پڑتا۔ میں گمنامی کی موت مرنا چاہتا ہوں۔"

"تم نہیں مروگے' واپس آجاؤ۔"

"بشریٰ میں نے سوچا ندیم بڑا ہوگا اور اسے معلوم ہوگا کہ تمہاری دوسری اولاد اس کے باپ کے قاتل کی اولاد ہے تو ایک ہی ماں کے بچوں کے درمیان نفرت بڑھے

گی۔ تم وعدہ کرو کہ ندیم کے سامنے کبھی اپنے دوسرے شوہر کو قاتل نہیں کہو گی۔"

"نہیں کہوں گی۔ اب آجاؤ۔ ہم یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔"

بشریٰ سسکیاں لینے لگی وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ میں تمہاری محبت میں دیوانہ ہوگیا تھا۔ مجھے سادات پر ترس نہ آیا۔ میں نے دو ساتھیوں کی مدد سے اسے پھانسی پر چڑھادیا تھا۔ آج اسی طرح اس کمرے کی چھت سے پھانسی کا پھندا لٹک رہا ہے۔ مجھے بلا رہا ہے آج مجھے اپنے آپ پر ترس نہیں آئے گا۔"

"نہیں وسیم تم اپنی جان نہیں دوگے۔"

"بشریٰ! تم وہاں سے نہ چلاؤ۔ ملازموں کو پتہ چلے گا تو پھر میں گمنامی سے مر نہ سکوں گا۔ میں نے یہ مکان فرضی نام سے لیا ہے۔ اب میں ریسیور اور کریڈل اٹھاکر اس تپائی پر چڑھ رہا ہوں' جو مجھے پھندے تک پہنچادے گی۔"

"میں تپائی پر چڑھ گیا ہوں اور اس پر کریڈل رکھ کر ریسیور ہاتھ میں پکڑے سیدھا کھڑا ہوگیا ہوں۔ اس طرح پھندا میرے چہرے کے سامنے آگیا ہے۔"

"وسیم نہیں۔ ایک منٹ کے لئے ٹھہر جاؤ۔ میں رابطہ ختم کرتی ہوں۔ پھر تم ایک منٹ کے بعد دوبارہ رابطہ قائم کرنا۔"

"نہیں بشریٰ! چالاک نہ بنو۔ تم ایکس چینج سے یہاں کا نمبر اور پتہ معلوم کرنا چاہتی ہو مگر اس وقت تک دیر ہوجائے گی میں اس دنیا سے جاچکا ہوں گا۔"

"وسیم تمہیں میری قسم ہے۔ اپنی بشریٰ کی قسم ہے دیکھو میں رو رو کر التجا کررہی ہوں۔"

"میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں آغوش میں لے کر تمہارے آنسو پونچھ دیتا۔ مگر میں نے اپنے ہونے والے بچے کے مستقبل کے لئے یہ فیصلہ کیا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے گلے میں پھندا ڈال کر اسے کس لیا ہے۔ اس کمرے میں جگہ جگہ میں نے پٹرول چھڑک دیا ہے۔ بس ماچس کی تیلی دکھاؤں گا اور آگ کے شعلے میرے مُردہ جسم کو جلا کر ناقابلِ شناخت بنا ڈالیں گے۔ تمہیں اپنے دونوں بچوں کی قسم ہے۔ میری موت پر ماتم نہ کرنا۔ کرو گی تو میری خودکشی کا بھید کھلے گا اور یہ بات دنیا والوں کی زبان سے بچوں تک پہنچے گی۔"

بشریٰ گڑگڑانے لگی لیکن وہ کہتا جارہا تھا۔ "دیکھو میں نے ماچس کی تیلی جلاکر

پھینک دی ہے۔ آگ بھڑک چکی ہے۔ آخری بار پپی دو۔ پپی لو بشریٰ لو میں جا رہا ہوں............"

چند لمحے کے بعد بشریٰ کو اپنے ریسیور پر کھٹاکے کی آواز سنائی دی۔ ادھر کا ریسیور گرا ہو گا۔ اس نے تپائی کو لات مار کر گرایا ہو گا۔ اس کے بعد ادھر کے ریسیور سے دنیا کی تمام آوازیں بند ہو گئیں تھیں۔ شاید تپائی کے ساتھ کریڈل کے گرنے سے رابطہ ختم ہو گیا تھا۔

اس کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ ماتم کرو گی تو بھید کھل جائے گا۔ بشریٰ نے چیخوں کا گلا گھونٹنے کے لئے دوپٹے کو منہ میں ٹھونس لیا۔

☆======☆======☆

تماشائے گندم

ایک آسیب زدہ کسان کی حیرتناک داستان
جو بدبختی سے زندگی کی کھیتی میں پہنچ گیا تھا
اور موت کی فصل کاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔
وہ جب تک زندہ رہتا، اسے موت کی فصل کاٹنی تھی۔

بیل گاڑی رک گئی۔ آگے راستہ نہیں تھا۔ وہ بیوی بچوں کے ساتھ جہاں پہنچ گیا تھا وہ راستہ ذرا آگے جاکر اچانک یوں ختم ہو رہا تھا جیسے کسی نے سہارے کے لئے ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا ہو۔

دھوپ کی شدت سے بدن جل رہے تھے۔ آفتاب گویا سوا نیزے پر تھا۔ دوپہر اتنی روشن، اتنی چمکیلی تھی کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ دور تک دیکھو تو آنکھوں میں پسینہ بھرا جاتا تھا۔ اس نے پاس بیٹھی ہوئی بشریٰ کو دیکھا۔ اس کی نظریں دھندلا گئیں۔ جیسے عینک کے شیشوں کو صاف کرنا پڑتا ہے، ویسے ہی اس نے کاندھوں پر رکھے ہوئے رومال سے پسینہ پونچھا پھر بشریٰ واضح طور پر نظر آنے لگی۔ اگر تمثیل پیش کی جائے تو وہ چندے آفتاب تھی گویا آفتاب سوا نیزے پر نہیں، اس کے ساتھ تھا۔

اگر وہ کسی ایئر کنڈیشنڈ بنگلے میں ہوتی تو وہ بنگلہ اس کی شادابیوں سے بھر جاتا مگر وہ ایک فاقہ زدہ کسان کی بیل گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پتا نہیں قدرت کیا سوچ کر کیچڑ میں کنول اور کانٹوں میں گلاب کھلاتی ہے۔ وہ بھوک، پیاس، مایوسی، گرمی اور تھکن کے باعث مرجھا رہی تھی۔ اگرچہ اس کے مرجھانے کے دن نہیں تھے۔ شادی کو صرف چھ برس ہوئے تھے۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کے باوجود امیدوں کی طرح جوان اور آرزوؤں کی طرح بھرپور تھی۔ شادی کے چھ برس میں عورت بوڑھی نہیں ہو جاتی۔ وہ لہلہاتی فصل کی طرح خوشۂ گندم کے ایک ایک دانے کو بڑے جتن سے سنبھال کر رکھتی ہے۔ وہ کسان کی زمین ہوتی ہے۔ کبھی بانجھ نہیں ہوتی۔ ہر فصل کے بعد پھر نئی فصل کے لئے تازہ دم ہی رہتی ہے۔

اس نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ کسان نے پوچھا۔ "بھوک لگ رہی ہے؟"

اس کے سینے سے ایک گہری سانس نکلی۔ شاید آہ نکلی پھر وہ بولی۔ "بھوک

برداشت ہو جاتی ہے، پیاس نہیں ہوتی، حلق میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں۔"

بیل گاڑی کے پچھلے حصے سے ایک ننھی سی کراہ سنائی دی۔ بشریٰ کا کلیجہ کانپ گیا۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "بچے اٹھیں گے تو روٹی مانگیں گے۔"

کسان نے سر کو جھکا لیا۔ جیسے اپنی محنت پر نادم ہو۔ وہ بچپن سے کھیتوں میں کام کرتا آیا تھا۔ اناج اگاتا آیا تھا لیکن آج بھی بھوکا تھا۔ آباؤ اجداد کے زمانے سے جن زمینوں پر کام کرتا رہا تھا۔ انہیں مایوسی سے چھوڑ کر اپنے چھوٹے سے کنبے کو بیل گاڑی میں لاد کر وہاں سے چل پڑا تھا۔ ملک میں ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں جاکر کمانے کھانے کے ذرائع حاصل کر لیتے ہیں۔ صرف زراعت کا شعبہ ایسا ہے کہ کسان کے لئے مشرق وسطیٰ کے ممالک کا دروازہ پورا نہیں کھلتا۔ وہ اپنے ہی ملک کے اندر کنویں کے مینڈک کی طرح اِدھر اُدھر اُس زمین سے اس زمین تک جا سکتا تھا۔ آگے کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ آگے جانے کے لئے نوٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نوٹوں کے لئے فصل کی ضرورت ہوتی ہے۔ فصل اس کی نہیں ہوتی۔

دھوپ تیز تھی سورج کی کرنیں برچھیوں کی طرح آنکھوں میں اتر رہی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر دیکھا۔ آگے راستہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے آگے ایک ڈھلان تھی۔ دور تک کھیت نظر آرہے تھے۔ فصل لہلہا رہی تھی۔ گندم کے سنہرے خوشے دور ہی سے پکار رہے تھے۔ بہت دور شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ میں ایک مکان نظر آرہا تھا۔ بشریٰ نے کہا۔ "وہاں کھانے کے لئے کچھ مل سکتا ہے۔"

کسان نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پھیلا کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ مضبوط تھے۔ انگلیوں میں آہنی پھلوں کی سی سختی تھی۔ دونوں ہتھیلیاں سخت زمین کی طرح کھردری تھیں۔ اتنی مضبوطی توانائی اور محنت کے باوجود کیا اس مکان میں جاکر وہ بھیک مانگے گا؟

مانو رونے لگی۔ وہ دونوں سر گھما کر پیچھے دیکھنے لگے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں ان خانہ بدوشوں کا مختصر سا سامان تھا۔ سامان کے اوپر پانچ برس کے منٹو اور دو برس کی ننھی مانو کو چھپر چھایا میں تھپک تھپک کر سلا دیا گیا تھا۔ بھوک سے بچوں کو نیند نہیں آرہی تھی مگر وہ روتے روتے نڈھال ہو کر سو گئے تھے۔ مانو رونے لگی تو بشریٰ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس لگا لیا، اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے۔ ماں کے سینے کی گرمی، ممتا کی پیاس بھری تھپکیاں اور صدیوں

پرانی لوریاں بھی اب کام نہیں آتی تھیں۔ بشریٰ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کسان کو دیکھا پھر اپنا ہاتھ التجا کے انداز میں اس کی طرف بڑھایا۔

عورت کے دو ہی سہارے ہوتے ہیں۔ جب وہ اللہ سے مانگتی ہے تو دعائیہ انداز میں دونوں ہاتھ بڑھاتی ہے۔ جب شوہر سے کچھ مانگنا ہوتا ہے تو ایک ہاتھ بڑھاتی ہے۔ یوں دوسرا ہاتھ اپنی طرف بڑھ آنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ اس نے اپنے سخت اور کھردرے ہاتھوں میں اس کے پھول جیسے ملائم ہاتھ کو تھام لیا وہ دودھ کی طرح اجلی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے درمیان آکر اجلی رنگت میں سرخی گھلنے لگی تھی جیسے دو پتھروں کے بیچ حنا رنگ لا رہی ہو۔

ایسے وقت کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف ہو' وہ اسے بھی مان لیتا تھا۔ وہ اس مکان سے کچھ مانگ کر لانے کے لئے گاڑی سے اتر گیا۔ بچوں پر ایک نظر ڈالی پھر سر جھکا کر ادھر جانے لگا۔ بشریٰ اسے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ اپنا آدمی جب اپنی بات مانتا ہے تو اس پر کتنا پیار آتا ہے۔ یہ میرے لئے آج تک محنت کرتا رہا۔ محنت نے پھل نہ دیا تو میرے کہنے سے بھیک مانگنے پر آمادہ ہوگیا۔ بھیک نہ ملے اور میں کہوں چھین لو تو یہ میری خاطر چھیننے اور جھپٹنے پر بھی راضی ہو جائے گا۔ میرے لئے یہ ساری دنیا کو الٹ پلٹ سکتا ہے۔ عورت بھوکی رہتی ہے' پیاسی رہتی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں آتی لیکن جب شوہر اس کی بات مانتا ہے تو وہ مسرتوں سے مالا مال ہو جاتی ہے۔

منو نے گاڑی کے پچھلے حصے سے سر اٹھا کر کہا۔ "امی! بھوک لگ رہی ہے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھپکی دی۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو تمہارے ابا روٹی لانے جا رہے ہیں۔ مانو کے لئے بھی دودھ سے بھرا ہوا برتن لے آئیں گے۔"

منو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی معصومیت تھی لیکن اس کم سنی میں بھوک نے اس کی معصومیت کو مجروح کر دیا تھا۔ وہ کھانے کے ذکر پر یوں چونک کر دیکھتا تھا جیسے اتنی سی عمر میں اسے کھانے پر جھپٹنا آگیا ہو۔

کسان کھیتوں کے درمیان سے گزرتا جا رہا تھا۔ آس پاس کی فصل جوان تھی۔ پک رہی تھی۔ کٹنے کے لئے تیار تھی۔ صرف ایک درانتی کی ضرورت تھی پھر سارا

اناج اپنا ہوتا۔ نہ جانے وہ کھیت کس کی ملکیت تھے۔ وہ اس چھوٹے سے نیم پختہ مکان میں پہنچ گیا۔ سامنے ہی مکان کا برآمدہ تھا۔ اس کی چوکھٹ کے ایک طرف سیندور سے ہندی زبان میں "اوم" لکھا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مکان' وہ کھیت' وہ کھلیان سب کچھ کسی ہندو کی ملکیت ہے۔

چوکھٹ کے دوسری طرف صلیب کا نشان بنا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا' جہاں وہ کھڑا ہوا ہے' وہ زمین' وہ مکان اس کے آس پاس کا علاقہ کسی عیسائی کی ملکیت ہے لیکن کھیت سے لے کر کھلیان تک کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ مکان بھی ایسا خاموش تھا جیسے مکین سو رہے ہوں یا پھر وہ مکان اپنے مکینوں کے انتظار میں سو رہا ہو۔

اس نے سر اٹھا کر بلند آواز میں پوچھا۔ "یہاں کوئی ہے؟ ہم مسافر ہیں۔ تھوڑی دیر ستانا چاہتے ہیں پھر راستہ پوچھ کر آگے بڑھ جائیں گے۔"

وہ خاموش ہو کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔ دوپہر کے سناٹے میں اس کی آواز ذرا دور تک گئی تھی پھر ہلکی سی بازگشت سنائی دی۔ اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ جواب پھر نہ ملا۔ وہ برآمدے میں آیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر دستک دی ذرا انتظار کیا پھر خیال آیا' زور سے دستک دینا چاہئے۔ اس نے دروازے کو زور سے پیٹنا چاہا۔ اس کے پٹ کھل گئے۔ وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ کھلے ہوئے دروازے سے ایک صاف ستھرا کمرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بیٹھک والا کمرہ تھا۔ کچھ پرانی کرسیاں اور درمیانی میز وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ اس نے دروازے کی کنڈی کو کھڑکاتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں کوئی ہے؟ ہم مسافر ہیں۔ اگر یہاں کوئی مرد نہیں ہے اور کوئی خاتون مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتی تو میں اپنی بیوی کو لے آتا ہوں مگر کوئی جواب تو ملے۔"

اس نے انتظار کیا پھر ہمت کر کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس کی آمد پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں تھا۔ وہ ہولے ہولے فرش پر پاؤں مارتا ہوا دوسرے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تاکہ اندر کوئی ہو تو اس کے قدموں کی آواز سن کر کچھ بولے۔ زبان کھولے لیکن جب کوئی بولنے والا نہ ہو' کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو تو حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ اس نے بیٹھک والے کمرے سے گزر کر دوسرے دروازے کو کھول دیا............ دروازہ کھلتے ہی اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ دوسرے کمرے میں سامنے ہی ایک صاف ستھرے بستر پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔

وہ بڑی دیر تک گم صم کھڑا اسے دیکھتا رہا وہ دوسرا کمرہ یقیناً بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہو گا۔ سامنے جو بستر بچھا ہوا تھا اس پر ایک سفید بے داغ چادر تھی۔ چادر پر وہ لاش نہایت اطمینان سے چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں اس نے چھوٹی سی صلیب کو تھام رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں گیہوں کا ایک خوشہ تھا۔ اس خوشۂ گندم کی تازگی اور سنہری رنگت بتا رہی تھی کہ آج ہی فصل کے کسی حصے کی کٹائی ہوئی ہے' جس کا ایک خوشہ اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے' رہ نہیں گیا بلکہ دانستہ اس نے موت سے پہلے اسے تھام رکھا تھا۔

وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس کے چہرے کی آسودگی بتا رہی تھی کہ ابھی ابھی اس نے اپنی آخری سانس کو الوداع کہا ہے۔ ابھی ابھی جب یہ کسان روٹی مانگنے اس گھر کی طرف آرہا تھا' تب ہی وہ اس دنیا سے جا رہا تھا۔ اب جا چکا تھا۔ ویسے اہتمام سے رخصت ہوا تھا جیسے پہلے ہی اسے اپنی موت کا علم ہو چکا ہو۔ تب ہی اس نے مرنے سے پہلے عیسائی رسوم کے مطابق ماتمی لباس پہن لیا تھا۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ سوٹ تھا۔ سفید قمیض پر سیاہ نکٹائی بندھی ہوئی تھی۔ لباس پر کہیں ذرا سی بھی شکن نہیں تھی۔ بستر کی چادر بھی شکن سے پاک تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ موت کے کرب میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ بڑی آسانی سے اس کا دم نکل گیا تھا۔

اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے سوال کیا۔ "یہاں کوئی ہے؟ یہاں کسی کو ہونا چاہئے۔ یہ اکیلا تو نہیں ہو سکتا تھا۔"

اکیلا کیوں نہیں ہو سکتا تھا۔ آدمی اکیلا آتا ہے اور اکیلا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے کوئی دوسرا آدمی پاس نہیں تھا۔ اسے اچانک احساس ہوا' کمرہ سرد ہے۔ موت کی طرح سرد۔ باہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور گرمی سے آنے کے بعد وہ بھول گیا تھا کہ اس مکان کے اندر ٹھنڈک ہے۔ خاموشی ہے اور ایسی بے حسی ہے جس کا تعلق زندگی سے نہیں ہوتا۔

اس نے اس کمرے میں قدم رکھا۔ دروازے سے گزر کر آس پاس دیکھا۔ واقعی کوئی نہیں تھا۔ اس کے قدم ماتمی انداز میں اٹھے اور بستر کے قریب ٹھہر گئے۔ اس نے ایک نظر مرنے والے پر ڈالی پھر سر جھکا کر دل ہی دل میں کہا۔ "اے میرے

مالک! میرے معبود! میرے خالق! یہ ساری دنیا فانی ہے' فنا ہوتی رہتی ہے۔ فنا ہوتی رہے گی۔ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

مرنے والے کا سر تکیے پر تھا۔ اس تکیے پر ایک کاغذ کھلا ہوا رکھا تھا۔ اس کاغذ پر جو کچھ لکھا ہوا تھا اسے پڑھنے کا تجسس پیدا ہوتا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔ اس تحریر کی پہلی سطر جلی حرفوں میں تھی۔ لکھا ہوا تھا۔ "یہ تحریر اس کے لئے ہے جو میرے بسترِ مرگ کے پاس موجود ہے۔"

اس کے بعد لکھا ہوا تھا۔ "میں مسی جان بوہر پورے ہوش و حواس میں رہ کر یہ لکھ رہا ہوں کہ میرا یہ مکان میرے کھیت اور کھلیان' میری بنجر اور زرخیز زمینیں سب کی سب اس شخص کے لئے ہیں جو سب سے پہلے میرے بسترِ مرگ تک پہنچے گا اور میری مذہبی رسومات کے مطابق مجھے سپردِ خاک کرے گا۔ میں جو جائیداد اس کے نام لکھ رہا ہوں' اس کا کوئی دعوے دار نہیں ہے۔

اب سے مدتوں پہلے میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ روزگار کی تلاش میں بھٹکتا ہوا یہاں پہنچ گیا تھا۔ جب میں اس مکان میں داخل ہوا تو بیرونی دروازے کی چوکھٹ کے ایک طرف سیندور سے ہندی زبان میں "ادم" لکھا ہوا تھا۔ میں مکان میں داخل ہوا۔ آوازیں دیں۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں نے قریب پہنچ کر دیکھا وہ ایک ہندو کسان کی لاش تھی۔ اس کے سرہانے ایک وصیت نامہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا اس میں لکھا ہوا تھا یہ اس شخص کے لئے ہے جو سب سے پہلے میرے بسترِ مرگ تک پہنچے گا۔

پھر اس وصیت نامے میں لکھا ہوا تھا کہ جو اس کی لاش کے پاس سب سے پہلے آئے گا اور اسے اس کی مذہبی رسومات کے مطابق چتا میں بھسم کرے گا اس کے لئے یہ مکان' یہ زمینیں' یہ کھیت اور کھلیان ہیں۔ اس کی رو سے میں یہاں کا ملک بن گیا۔

پھر وقت گزرنے لگا میں جوان سے بوڑھا ہو گیا۔ میرے بیوی بچے ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آج میرے رخصت ہونے کی باری ہے۔ اس سے پہلے میں یہ وصیت نامہ اس شخص کے لئے لکھ رہا ہوں جو اس وقت میرے بسترِ مرگ کے پاس موجود ہے۔ اسے پڑھ رہا ہے اور اب یہاں کا ملک و مختار بننے والا ہے۔

آہ۔ یہ سچ ہے کہ یہ دنیا ہماری ہے مگر اپنے بعد اسے دوسرے کے حوالے کرنا

پڑتا ہے۔ کسی نے اس دنیا کو میرے حوالے کیا۔ میں کسی اور کے حوالے کرکے جارہا ہوں۔ فقط۔"

نیچے جان بوہر کے دستخط تھے۔ وہ اس کاغذ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے گم صم کھڑا رہا۔ یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ وہ یقین نہیں کرسکتا تھا کہ آئے دن فاقے کرنے والے کو اتنی دولت اور جائیداد مل جائے گی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے ننھے معصوم بچے بھوک سے بلک رہے ہوں گے۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر کچن کی طرف گیا۔ وہاں کھانے کا سامان وافر مقدار میں تھا۔ تازہ دودھ دوہنے کے بعد ایک بڑے سے برتن میں گرم کرکے رکھا گیا تھا۔ اس نے برتن کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو دودھ اب بھی نیم گرم تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس بوڑھے شخص کو مرے ہوئے زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ ہوئے ہیں' موت سے پہلے اس نے گھر بھر کی صفائی کی ہوگی.......... صاف چادر بستر پر بچھائی ہوگی۔ جانے کیوں' دودھ بھی گرم کیا ہوگا پھر ماتمی لباس پہننے کے بعد بستر پر لیٹ گیا ہوگا۔

بہرحال وہ ایک بڑے سے جگ میں دودھ بھر کر کچن کے پچھلے دروازے سے باہر آیا۔ پیچھے کھلیان تھا۔ دو صحت مند بیل ناند کے پاس بیٹھے جگالی میں مصروف تھے۔ قریب ہی ایک باڑے میں مویشی نظر آرہے تھے۔ وہ ادھر سے گھوم کر مکان کے سامنے والے حصے میں آیا پھر تیزی سے چلتا ہوا اپنے بیوی بچوں کے پاس پہنچ گیا۔ "یہ لو۔ بچوں کو پہلے دودھ پلاؤ۔ بچے تو تم پی لینا۔ ویسے ہماری مصیبت کے دن ختم ہوچکے ہیں۔"

بشریٰ نے ایک چھوٹے سے مگ میں مانو کے لئے دودھ انڈیلا۔ بڑا سا مگ منٹو کو دیا پھر وہ مانو کو دودھ پلاتے ہوئے بولی۔ "کیا یہاں تمہیں کام مل جائے گا؟"

وہ خوشی سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "تم کام ملنے کی بات کررہی ہو ہم یہاں کی زمینوں کے مالک بن گئے ہیں۔ یہ دور تک لہلہاتے ہوئے کھیت ہمارے ہیں۔ اس کا اناج ہمارے لئے ہے' وہ مکان ہمارا ہے۔ اس کے مویشی ہمارے ہیں۔"

وہ کہہ رہا تھا اور بشریٰ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی' جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ وہ بیل گاڑی کو اس مکان کی طرف لے جاتے ہوئے بشریٰ کو بوڑھے کی لاش اور وصیت نامے کے متعلق بتانے لگا۔ مکان کے سامنے پہنچ کر بشریٰ نے کہا۔ "جب ہم فاقے کرتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ ایک روٹی کی خواہش کرتے ہیں۔ روٹی مل جاتی ہے

تو جیسے دنیا جہان کی دولت مل جاتی ہے۔ یہاں اتنی دولت اور جائیداد دیکھ کر ہمیں یقین نہیں آرہا ہے اور اچھا ہے کہ یقین نہیں آرہا ہے۔ آجائے تو شاید خوشی سے دم نکل جائے۔"

انہوں نے بچوں کو گاڑی سے اتار کر ایک گھنے درخت کے سائے میں بٹھا دیا۔ باپ نے کہا۔ "منٹو! تم چھوٹی بہن کا خیال رکھو مگر اس مکان کے اندر نہ آنا۔ ابھی ہم سامان لے جاکر رکھیں گے۔ اس کے بعد تمہیں لے جائیں گے۔"

وہ بشریٰ کے ساتھ مکان کے اندر بوڑھے کی لاش کے پاس آیا۔ وہ بولی۔ "تم اس کی آخری رسومات ادا کرو میں مکان کے فرش اور دیواروں کو پانی سے دھوؤں گی۔ اس کے بعد اپنے بچوں کو اندر لاؤں گی۔"

"رسم کے مطابق اسے تابوت میں بند کرنے کے بعد دفن کرنا ہوگا اور تابوت تیار کرنا میرے بس میں نہیں۔ میں بڑھئی نہیں ہوں۔ وہ جو لکڑی کا بڑا سا صندوق رکھا ہوا ہے اسے تابوت کے طور پر استعمال کروں گا۔"

ایسا کہنے کے دوران اس کی نظر سامنے والی دیوار پر پڑی۔ لاش کے سرہانے والی دیوار پر ایک درانتی لٹکی ہوئی تھی۔ مرنے والے کے ہاتھ میں خوشۂ گندم تھا۔ اس سے درانتی کا گہرا تعلق تھا۔ درانتی کے بغیر فصل کٹ سکتی ہے نہ اناج منہ تک پہنچ سکتا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر درانتی کو دیوار کی کیل سے الگ کیا پھر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا آہنی پھل نصف دائرے کی صورت میں تھا۔ اس پھل پر ایک فقرہ کندہ کیا گیا تھا وہ فقرہ تھا۔

"جو مجھے گرفت میں لیتا ہے' وہ دنیا کو گرفت میں لیتا ہے۔"

اس کا مطلب کیا تھا؟ وہ فقرہ کسی فلسفے کا حامل تھا۔ اس وقت اس کسان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ سیدھی سی بات لکھی ہو' ہوسکتا ہے' اس بات کے پیچھے رموز و معنی پوشیدہ ہوں' جو وقت کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ سمجھ میں آتے ہیں۔ اس نے ایک بار پھر اس فقرے کو پڑھا۔

"جو مجھے گرفت میں لیتا ہے وہ دنیا کو گرفت میں لیتا ہے۔"

☆======☆======☆

وہ اس مکان میں آباد ہو گئے۔ پہلے دن بڑی مصروفیت رہی۔ کسان اس لاش کو تابوت میں رکھ کر اس تابوت نما صندوق کو گھسیٹ کر مکان سے بہت دور لے گیا تھا پھر اس نے گڑھا کھود کر اسے دفن کردیا تھا۔ قبر کے سرھانے اس نے لکڑی کی ایک صلیب بنا دی تھی۔ ادھر بشریٰ تمام دن گھر کی صفائی میں لگی رہی۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو دروازے پر قدم رک گئے۔ چوکھٹ کے ایک طرف ہندی میں اوم لکھا ہوا تھا۔ اس کے دوسری طرف صلیب کا نشان بنا ہوا تھا۔ مکان کے پیچھے لکڑی کے جلے ہوئے کوئلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے ایک کوئلہ اٹھا کر لے آیا پھر چوکھٹ کے اوپر لکھنے لگا۔ "یا اللہ۔ یا محمد" پہلے دونوں نشان دھندلا چکے تھے۔

لکھنا ضروری ہوتا ہے ہم کون ہیں۔ ہمارا عقیدہ کیا ہے؟ ہمارے نظریات کیا ہیں؟ اور ہم اپنے نظریات کے پیچھے کیا چاہتے ہیں؟ ہمارا مطالبہ کیا ہے؟ یہ سب کچھ لکھا جاتا ہے تب تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ انسانی حیات اور واقعات کے متعلق دو طرح سے لکھا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد جو کچھ لکھا جائے' اسے تاریخ کہتے ہیں اور وقت سے پہلے جو لکھا جائے' اسے نوشتۂ دیوار کہا جاتا ہے۔

مکان کے پیچھے کھلیان کے ساتھ ہی ایک مٹی کا کوٹھا بنا ہوا تھا جس میں گیہوں اور جو کے دانوں کا ذخیرہ تھا۔ اتنا ذخیرہ کہ وہ بیوی بچوں کے ساتھ محنت کئے بغیر تین برس تک بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ دودھ پینے کے لئے گائے اور بکریاں تھیں۔ گوشت کے کھانے کے لئے مویشی تھے۔ ہل چلانے کے لئے بیل اور فصل کاٹنے کے لئے ایک درانتی تھی۔

اس درانتی کے دستے میں مضبوط ڈور بندھی ہوئی تھی۔ ڈور کے ذریعے درانتی کو کیل سے لٹکایا جاتا تھا۔ جب وہ بستر پر آکر لیٹتا تھا تو اس کے پیچھے سر کی طرف وہ دیوار ہوتی تھی جہاں وہ درانتی لٹکتی رہتی تھی۔ اسے یوں نظر نہیں آتی تھی لیکن جب وہ سامنے والی دیوار کو دیکھتا تھا تو وہاں چھوٹے سے آئینے میں وہ درانتی نظر آجاتی تھی۔ تب اسے احساس ہوتا تھا جیسے وہ سر کے اوپر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہی ہے اور فصل کی طرح اس کے سر کو قلم کرنے والی ہے۔

یہ احساس تنہائی میں ہوتا تھا۔ تنہائی بری بلا ہے۔ ایسے میں آسیب گھیر لیتے ہیں۔ تنہا آدمی شاہی محل میں ہو تو وہ بھی مقبرہ لگتا ہے لیکن جب بشریٰ اس کے سامنے آجاتی تو اور کچھ سوچنے کی مہلت نہیں ملتی تھی۔ وہ اس کی ساری توجہ اپنی طرف سمیٹ لیتی

تھی۔ وہ خیالات کی دھوپ میں جلتا تو زلفوں کی چھاؤں کر دیتی تھی۔ وہ خاموش رہتی تھی مگر گنگناتی ہوئی سی لگتی تھی۔ وہ ایک ہوتی تھی مگر اپنے جلوؤں میں ہزار ہوتی تھی۔ اس کی تنہائی کو اپنے وجود سے بھر دیتی تھی۔ اُدھر کوئی سوچ اسے تار تار کرتی تھی' ادھر وہ محبت سے لوٹ مار کرتی تھی۔ اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔

کھانے پینے کی فکر نہ ہو۔ زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہوں اور ہر طرح کی فراغت حاصل ہو تو عورت ایسا ہی روپ نکالتی ہے' جیسا بشریٰ نے نکالا تھا۔ دو ہی دن میں چہرے پر رونق آگئی تھی۔ پہلے وہ اپنے شوہر کی خاطر مسکراتی تھی تو آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ جب آدمی محض فرض کی خاطر مسکرائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بھی آتا تھا تو اس کی آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ ان حالات میں یہ گمان ہوتا ہے کہ محبت ہو تو انسان ہونٹوں سے مسکراتا ہے۔ فراغت ہو تو آنکھیں دل کی گہرائیوں سے مسکراتی ہیں۔ وہ دانۂ گندم ہے جو کبھی خوشی دیتا ہے اور کبھی آنسو پونچھ دیتا ہے۔

باہر کھیتوں میں دور تک گندم کے خوشے لہلہا رہے تھے۔ فصل پک گئی تھی اور اسے پکار رہی تھی۔ آؤ' اپنی درانتی لے کر آؤ اور مجھے محنت کے بازوؤں میں سمیٹ لو۔

وہ ابھی آرام کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے فراغت نصیب ہوئی تھی۔ وہ چند روز آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے اس کے دونوں معصوم بچے خوش نوا پرندوں کی طرح بولتے رہتے تھے۔ معصوم شرارتیں کرتے رہتے تھے۔ بشریٰ ایک نئی کتاب کی طرح کھل گئی تھی۔ پہلے وہ محض ایک کسان کی بیوی تھی' اب چغتائی کی تصویر ہوتی جارہی تھی۔ ایک شام اس نے کہا۔ "اناج آتا رہے اور خرچ ہوتا رہے تو کم نہیں پڑتا مگر آمد نہ ہو' صرف خرچ ہو تو ہم بیٹھے بیٹھے یہاں کا سارا اناج کھالیں گے۔ ادھر فصل پک چکی ہے۔ کیا کھیتوں میں نہیں جاؤ گے؟"

اس نے دور لہلہاتی ہوئی فصل کو دیکھا پھر کہا۔ "کسان کا بچہ ہوں۔ محنت کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ تو بس یونہی ذرا آرام کرنے کو دل چاہتا رہتا ہے۔ کل سے کھیتوں میں جاؤں گا۔"

دوسری صبح وہ منہ اندھیرے اٹھا۔ بشریٰ نے اس کے لئے گرما گرم پراٹھے تیار کئے۔ رات کا بچا ہوا سالن اس کے آگے رکھ دیا۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد اس نے

چائے پی۔ بچوں کو دیکھا' وہ دونوں سو رہے تھے۔ انہیں محبت سے چوم کر وہ بشریٰ سے رخصت ہوا۔ ہاتھوں میں درانتی تھام کر کھیتوں کی طرف جانے لگا۔ پہلے اس نے ایک اونچے سے ٹیلے پر کھڑے ہو کر دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کے کھیت تین میل دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ چوڑائی میں تقریباً دو ایکڑ تھے۔ جان بوہر کی آخری تحریر کے مطابق وہ کھیت کسی ہندو کی ملکیت تھے پھر ایک عیسائی کے نام منتقل ہوئے۔ وہ دونوں تنہا کسان اپنے اپنے وقت میں اتنے بڑے کھیت کو کیسے سنبھالتے ہوں گے۔ وہ تنہا ہل چلاتے رہے تھے۔ بیج بوتے رہے تھے۔ فصل کاٹتے رہے تھے۔ آج وہ اپنے ہاتھ میں درانتی کو تھامے ان کھیتوں کو دور تک دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اب اسے بھی تنہا یہ فصل کاٹنا ہوگی۔ اس کے بعد تنہا نئی فصل کی تیاری کرنا ہوگی۔

وہ ٹیلے سے اتر کر کھیتوں میں آیا۔ دانے پوری طرح پک گئے تھے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ قریب سے اس فصل کو دیکھنے پر حیرانی ہوئی' گندم کے خوشے اپنی اپنی جگہ الگ الگ حیثیت رکھتے تھے۔ یعنی کوئی گندم کا خوشہ پوری طرح پکا ہوا تھا۔ کٹنے کے لئے تیار تھا۔ کوئی خوشہ نیم پختہ تھا۔ ابھی اس کے لئے ایک آدھ دن انتظار کرنا ہوتا اور کوئی خوشہ تو بالکل ہی کچا تھا۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ایک کھیت میں فصل ایک ساتھ پکتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی گندم کے خوشے کچھ پک گئے ہوں اور کچھ کچے رہ گئے ہوں۔

وہ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا اور گندم کے خوشوں کو دیکھتا رہا۔ ہر جگہ وہی بات تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے چن چن کر خوشۂ گندم کو کاٹنا تھا اور جو نیم پختہ تھے' انہیں دوسرے دن کے لئے چھوڑ دینا تھا۔

بہرحال اس نے یہی کیا۔ درانتی سنبھالی پھر پکے ہوئے خوشۂ گندم کو کاٹ کر ایک طرف رکھا۔ پھر دوسرے کو' پھر تیسرے کو کاٹ کر رکھنے لگا تھوڑی دیر بعد اس نے کٹے ہوئے خوشوں کو دیکھا۔ وہ زمین پر پڑے ہوئے تھے لیکن گندم کے دانے مرجھا گئے تھے کچھ سڑ گئے تھے۔ کچھ میں گھن لگ گئے تھے۔

وہ ایک دم سے زمین پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ سے درانتی چھوٹ گئی۔ یہ کیا تماشا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کٹی ہوئی فصل کو کاٹ کر ایک طرف رکھا

گیا ہو اور وہ فصل پلک جھپکتے ہی سڑ گئی ہو۔ گل گئی ہو۔ گھن زدہ ہو گئی ہو۔ جیسے وہ برسوں سے ذخیرہ کر کے رکھی گئی ہو۔ اس نے ایک خوشۂ گندم کو اٹھا کر دیکھا۔ گندم کی سنہری چمک مر گئی تھی۔ اس میں تازگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ دیکھتے ہی دیکھتے سڑ گئے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہو کسی مُردے کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہا ہو۔ اس نے فوراً ہی اس خوشے کو زمین پر ڈال دیا۔

ہوا چل رہی تھی۔ لہلہاتے ہوئے گندم کے خوشے آپس میں ٹکراتے تو ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے وہ ماتم کر رہے ہوں۔ کسان کے دل میں جانے کیوں یہ بات پیدا ہو رہی تھی کہ اس نے قتل کیا ہے اور اس کے سامنے لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ درانتی کو تھام کر اٹھ گیا۔ دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا' وہ دوسری جگہ پہنچا۔ وہاں بھی گندم کے خوشے کہیں پکے ہوئے تھے' کہیں کچے تھے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا پھر پکے ہوئے خوشوں والی جڑوں کو کاٹنے لگا۔ اس لمحے اسے اپنی سماعت پر شبہ ہوا۔ وہ کان لگا کر سننے لگا۔ پھر اس نے خوشۂ گندم کی ایک جڑ کو کاٹا پھر ایسے ہی محسوس ہوا جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ کسی کا دم نکل رہا ہو۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے درانتی پھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ جو کٹا ہوا حصہ زمین پر پڑا ہوا تھا وہ مرجھا رہا تھا۔ دانے سڑ رہے تھے گھن زدہ ہو رہے تھے۔

کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا۔ اپنی آنکھوں پر شبہ ہوتا ہے۔ وہ درانتی لے کر اٹھ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ تھکے ہوئے قدموں سے ادھر جانے لگا جہاں اس نے پہلے کٹائی کی تھی۔ جب وہاں پہنچا تو کٹے ہوئے گندم کے خوشے اسی طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے لیکن جہاں سے وہ جڑیں کاٹی گئی تھیں وہاں سے نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ شدید حیرانی سے دیکھتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ "نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ محنت کے بغیر زمین پھل نہیں دیتی۔ یہاں تو کاٹنے کے بعد ہی نئی کونپل پھوٹ رہی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

وہ پلٹ کر تیزی سے بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے ایک درخت کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ سامنے ہی مکان نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ "بشریٰ پوچھے گی' اتنی جلدی کیسے آ گئے؟ میں کیا بتاؤں گا؟ اگر بتاؤں گا تو کیا وہ یقین کر لے گی۔ خود چل کر کھیتوں میں دیکھے گی اور دیکھنے کے بعد شاید خوف زدہ ہو جائے۔ نہیں' ابھی اسے نہیں بتانا

چاہئے۔ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں' پہلے اسے اپنے طور پر اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔ آخر یہ کیا طلسم ہے' ایسا آج تک نہیں ہوا پھر آج ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا مکان میں داخل ہوا............ بشریٰ نے حیرانی سے پوچھا۔ "اتنی جلدی آ گئے؟"

"آں......... ہاں۔ وہ بات یہ ہے کہ........." وہ ذرا ہچکچایا' پھر بولا۔ "وہ بات یہ ہے کہ دور سے دیکھنے پر فصل پکی ہوئی لگتی ہے مگر ابھی تیار نہیں ہے۔ کل جا کر دیکھوں گا؟"

وہ پھر حیرانی سے بولی۔ "کسان تو دور ہی سے پکی ہوئی فصل کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں۔ تم دھوکا کیسے کھا گئے؟"

"کہانا' کل جاؤں گا۔ مجھ سے بحث نہ کرو۔"

اس نے درانتی کو کمرے میں ایک طرف پھینک دیا پھر آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ بشریٰ نے سوچا۔ "میرا کسان آرام طلب ہو گیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آج کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ دیکھتی ہوں' یہ کل کھیتوں پر جاتے ہیں یا نہیں؟"

وہ گھر کے کام میں لگ گئی۔

وہ بستر پر لیٹا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ اس کے تصور میں وہ خوشۂ گندم تھے جو اپنی جڑ سے الگ ہونے کے بعد مرجھا گئے تھے یا مر گئے تھے۔ اس نے ان کے کراہنے اور دم توڑنے کی آواز سنی تھی۔ یہ اس کا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ بعض اوقات یونہی کان بجنے لگتے ہیں۔ خواہ مخواہ ہی سنسناہٹ سی سنائی دیتی ہے یا کسی کی بھولی بسری کراہیں جو دماغ کے کسی گوشے میں چھپی رہتی ہیں وہ دماغ کے گنبد میں گونجتی ہیں تو کان جو کچھ سنتے ہیں مگر سمجھ نہیں پاتے۔ آج بھی فصل کاٹتے وقت اس کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

اس نے جو کچھ سنا وہ وہم ہو سکتا تھا لیکن جو کچھ دیکھا' اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ وہ گندم کے دانے اب بھی اس کھیت میں مُردہ پڑے ہوں گے۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اسے کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ تمام دن وہ کبھی لیٹتا رہا کبھی اٹھتا رہا۔ کبھی ٹہلتا رہا' کبھی باہر آ کر دور کھیتوں کو تکتا رہا۔ شام ہو گئی۔ رات ہو گئی۔ دوپہر اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ رات کو بشریٰ کے اصرار پر کھانا کھا لیا مگر رات کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بشریٰ دیر تک اس کے پاؤں دابتی رہی۔ پھر اس کے

سر کو سہلاتی رہی۔ عورت نیند اڑانا بھی جانتی ہے اور نیند لانا بھی جانتی ہے۔ ذرا دیر بعد ہی وہ سو گیا۔

نیند آتی ہے تو خواب بھی آتے ہیں۔ اس نے دیکھا' کچھ لوگ کراہ رہے ہیں۔ دم توڑ رہے ہیں۔ کسی کا گلا کٹا ہوا ہے۔ کسی کے سینے پر گہرے زخم نظر آ رہے ہیں اور وہ درانتی جو اس کے پیچھے والی دیوار پر سرہانے لٹک رہی ہے' اس درانتی کے آہنی پھل سے لہو ٹپک رہا ہے۔ انسانوں کا لہو۔

یکلخت آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پاس والے بستر پر بشریٰ نہیں تھی۔ صبح ہونے والی تھی۔ کسان کی بیوی دن چڑھے تک کبھی نہیں سوتی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر مکان کے پیچھے آیا۔ بشریٰ گائے کو دوہنے کے دوران ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ اس نے شاید پہلی بار اسے گنگناتے سنا تھا اور پہلی بار کیوں نہ سنتا۔ اب سے پہلے اتنی خوشی اور ایسی آسودگی کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ گیت اسی وقت لبوں پر مچلتے ہیں جب دل اللہ کی دین سے سرشار ہوتا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ناشتہ کرنے کے بعد بشریٰ نے پوچھا۔ "آج کھیتوں پر جاؤ گے؟"

وہ لقمہ چباتے چباتے چونک گیا۔ سر اٹھا کر بشریٰ کو دیکھا جیسے وہ کھیتوں پر جانے کی بات بھول گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہاں۔ میں جا رہا ہوں۔"

اس نے ناشتہ کرنے کے بعد بے دلی سے درانتی کو ہاتھ میں لیا پھر مکان کے باہر آ گیا۔ اس نے بچوں کو پیار نہیں کیا۔ بیوی کو محبت سے خدا حافظ نہیں کہا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ آدمی فتح و کامرانی کا عزم لے کر جائے۔ محنت کا پھل حاصل ہونے کا یقین ہو تو وہ بچوں کو جاتے وقت چومتا ہے۔ بیوی کو محبت سے الوداع کہتا ہے لیکن اندر کہیں یہ احساس ستا رہا ہو کہ وہ قتل کرنے جا رہا ہے۔ ایک کا نہیں' دو کا نہیں' جانے کتنے لوگوں کا قاتل بننے والا ہے۔ درانتی سے لہو ٹپکنے والا ہے تو ایسے میں پیار و محبت کی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ وہ سر جھکا کر بیوی کی طرف دیکھے بغیر کھیتوں کی طرف بوجھل قدموں سے جانے لگا۔ یہ بھول گیا کہ وہ دروازے پر کھڑی ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ رہی ہو گی اور توقع کر رہی ہو گی کہ جانے والا دور تک پلٹ پلٹ کر دیکھے گا۔ وہ جانتی ہے کہ جانے والا شام کو واپس آئے گا۔ پھر بھی چاہتی ہے کہ وہ حدِ نظر تک پلٹ پلٹ کر دیکھے۔ حدِ نظر میں اوجھل ہونے سے پہلے جو آخری نگاہ ہوتی ہے' وہ عورت کے دل میں اٹک

جاتی ہے۔ اسے یقین دلاتی رہتی ہے کہ مرد اپنی تمام تر محنتوں اور دنیاوی مصروفیات کے باوجود اسے اب تک دیکھ رہا ہے۔

وہ کھیت کے اسی حصے میں آکر رک گیا جہاں پچھلے دن اس نے تھوڑی سی کٹائی کی تھی۔ جو گندم کے خوشے زمین پر پڑے تھے‘ وہ اب خاک ہو رہے تھے جیسے دنیا کی ہر چیز فنا ہونے کے بعد خاک ہو جاتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک انہیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ دل میں خیال پیدا ہوا۔ شاید کھیت کے اس حصے میں کوئی آسیب ہے۔ بلا ہے اسی لئے یہاں کی فصل ناقابلِ فہم ہو گئی ہے۔ یہاں سے آگے جاکر کٹائی کرنا چاہئے۔

وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دور تک چلا گیا۔ بہت دور جانے کے بعد اس نے ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ وہاں گندم کے دانے پکے ہوئے تھے کٹائی کے لئے بالکل تیار تھے۔

اس نے درانتی کے ہتھے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہاں اکڑوں بیٹھ گیا۔ کھلی فضا میں ہوا کا زور تھا۔ فصل لہلہا رہی تھی۔ گندم کے خوشے ایک دوسرے سے ٹکرا کر جیسے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ آنے والے کسی ماتمی لمحے کا ذکر کر رہے تھے۔ وہاں کی فضا بڑی ہی سوگوار سی لگ رہی تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

اور کچھ ہو گیا۔ اس نے جیسے ہی ایک خوشے کو ہاتھ میں لے کر اسے جڑ سے کاٹا‘ تب ہی اس کا ہاتھ لرز گیا۔ دل کانپ گیا۔ اس بار اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آنے کے باوجود ماں کی آواز سنائی دی۔ اس کی ماں کراہ رہی تھی پھر وہ آواز یکلخت رک گئی جیسے عین کراہنے کے دوران دم گھٹ گیا ہو۔

وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ دو قدم پیچھے چلا گیا۔ دہشت ناک نظروں سے اس کٹے ہوئے خوشے کو یوں دیکھنے لگا جیسے محنت نہ کی ہو‘ بہت بڑا جرم کیا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور جو کچھ ابھی ہو چکا تھا وہ بھی ایک وہم سا لگ رہا تھا‘ دماغ سمجھا رہا تھا۔ نہیں نہیں‘ وہ ماں کی کراہیں نہیں تھیں۔ بس یونہی یاد آگئی تھی کہ ماں نے اسے کیسے چھوڑ دیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ تب سے ماں بیٹے کے درمیان کوئی رابطہ نہیں رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے اجنبی بن گئے تھے لیکن ہزار اجنبیت کے باوجود خون کا رشتہ کٹ نہیں سکتا۔ آج ایک خوشۂ گندم کو کاٹتے ہی جانے ماں کی یاد کیسے آگئی تھی۔

اب اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ پھر کٹائی کا تجربہ کرتا۔ یوں بھی ایسی فصل کو کاٹنا سراسر حماقت ہے جو کٹنے کے بعد کسی کام کی نہ رہتی ہو۔ جس کے دانے اپنی تازگی کھو دیتے ہوں اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑنے گلنے لگتے ہوں۔ ایسے دانوں کا وہ کیا کرے گا۔ اس اناج کو نہ تو وہ کھا سکتا ہے اور نہ ہی منڈی میں لے جاکر فروخت کر سکتا ہے۔

وہ درانتی کو تھامے ہوئے گھر میں آیا پھر اپنے کمرے میں پہنچ کر اسے ایک طرف غصے سے پھینک دیا۔ آواز سن کر بشریٰ باورچی خانے سے دوڑتی ہوئی آئی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ ”کیا ہوا؟ تم پھر چلے آئے؟“

”ہاں‘ فوراً سامان باندھو۔ میں اپنے بیلوں کو گاڑی میں جوت رہا ہوں۔ ہم یہاں سے جائیں گے؟“

وہ حیران اور پریشان ہو کر بولی۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”جو کہہ رہا ہوں۔ وہ کرو۔“

بشریٰ نے اچانک ہی مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی پھر رک گئی۔ دوڑ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ جب واپس آئی تو اس کے ایک بازو میں منو تھا اور دوسرے میں مانو۔ وہ دونوں ہی کو اٹھائے ہوئے تھی۔ اس نے کسان کے سامنے پہنچ کر کہا۔ ”ان بچوں کو دیکھ رہے ہو۔ میں تمہارا حکم مان سکتی ہوں لیکن ان معصوموں کے نصیب کی روٹی نہیں چھین سکتی۔ ہم نے بہت فاقے کئے ہیں۔ ہم فاقے کرتے کرتے مرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو بھوک سے بلکتے دیکھنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں۔ میں ماں ہوں۔ میں ان کا برا نہیں چاہوں گی۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔“

وہ شکست خوردہ انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بشریٰ نے بچوں کو گود سے اتار کر انہیں تھپکتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ باہر کھیلو۔“

منو چھوٹی مانو کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لے گیا‘ ان کے جانے کے بعد وہ اپنے کسان کے پاس آئی۔ محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”آخر بات کیا ہے؟“

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے بشریٰ کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اسی طرح سر جھکائے بڑبڑانے لگا۔ ”میں تمہیں کل ہی بتا دیتا مگر میں نے سوچا‘ شاید میرا وہم ہے۔ شاید اس

کھیت کے مخصوص حصے میں کوئی بلا ہے یا ایسی کوئی بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ آج میں بہت دور کھیت کے دوسرے حصے میں گیا۔ وہاں وہی ہوا جو.........."

بشریٰ اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے' تم کیا کہہ رہے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وہ جھلا کر بولا۔ "کیا تم سمجھتی ہو مجھے بخار ہوگیا ہے۔ سرسام ہوگیا ہے۔ میں ہذیان بک رہا ہوں' جاکر کھیتوں میں دیکھ لو۔ میں جس فصل کے حصے کو کاٹتا ہوں وہ فصل کٹنے کے بعد مرجھا جاتی ہے۔ اس کے دانے سڑ جاتے ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

وہ غصے سے بولا۔ "کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں' میرے ساتھ کھیتوں میں چل کر خود دیکھ لو۔"

"نن' نہیں' میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتی۔ جو کہہ رہے ہو' وہ سچ ہی ہوگا مگر حیرانی ہو رہی ہے۔"

"حیرانی مجھے بھی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' کیا ہو رہا ہے۔ جب میں کسی بھی خوشے کو ہاتھ میں تھام کر اس کی جڑ کو کاٹتا ہوں تو ایک ماتمی سی صدا سنائی دیتی ہے۔ جیسے میں نے کسی کو قتل کیا ہے۔ کسی کو جیتے جی مار ڈالا ہے۔"

"دیکھو تم بہت حساس ہو۔ ایک ذرا سی بات کو بہت دور تک لے جاکر سوچنے کے عادی ہو۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم ماتمی آواز کیسے سن لیتے ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آج جب میں نے ایک خوشۂ گندم کو ہاتھ میں لے کر اسے جڑ سے کاٹا تو مجھے امی کی آواز سنائی دی۔ وہ کراہ رہی تھیں پھر مجھے یوں لگا جیسے ان کا دم نکل گیا ہو۔"

بشریٰ پریشان ہو کر بولی۔ "اللہ انہیں سلامت رکھے۔ ہم سے اب کوئی ناتا نہیں رہا ہے پھر بھی وہ آپ کی امی ہیں۔ انہوں نے آپ کو جنم دیا ہے۔ ہم ان کی سلامتی کی دعائیں مانگیں گے۔ آپ خاموش بیٹھیں۔ میں کچھ پڑھنا چاہتی ہوں۔"

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بشریٰ نے اپنی ساس کے لئے ایک مختصر سی دعا مانگی۔ اسے اپنے شوہر کی فکر زیادہ تھی۔ اس کے دماغی سکون اور سلامتی کے لئے اس نے آیتہ

الکرسی پڑھنا شروع کی۔ وہ دیر تک پڑھتی رہی اور اس پر پھونکیں مارتی رہی۔

دوپہر کو کھانے کے بعد وہ بستر پر آکر لیٹ گیا۔ کبھی دن کو آرام کرنے یا سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ دوپہر سے شام ہوگئی۔ شام سے رات ہوئی۔ کھانے کے بعد بھی وہ بستر پر جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ صبح آنکھ کھلنے کے بعد یقین ے نہیں کہہ سکتا تھا کہ سوتا رہا تھا کہ سوچتا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر باہر جانے لگا بشریٰ کو یقین نہیں تھا کہ آج وہ کھیتوں میں جائے گا۔ شاید وہ عادت کے مطابق بیدار ہوگیا تھا۔ وہ اس کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگی۔ باہر بیل گاڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس گاڑی میں جو بیل جوتے جاتے تھے' ان کے گلے میں گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ گھنٹیوں کی آواز سن کر وہ لپکتی ہوئی باہر آئی پھر حیرانی ے بولی۔ "یہ بیل گاڑی تم نے کیوں تیار کی ہے؟"

"میں قریبی بستی میں جارہا ہوں۔ یہاں کی قریب ترین بستی بھی اٹھارہ کوس ر ہے۔"

"کیوں جارہے ہو؟"

"ڈاک خانے کے ذریعے امی کو خط لکھوں گا۔ خیریت معلوم کروں گا۔ ایک ہفتے بعد پھر ڈاک خانے جاؤں گا تو ان کا جواب آچکا ہوگا۔"

بشریٰ مطمئن ہوگئی۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے دوپہر کے لئے کھانا باندھ دیا اور یل گاڑی میں رکھ دیا۔ تاکید کی کہ شام ہونے سے پہلے ہی واپس آجائے۔ وہ اس سے عدہ کر کے رخصت ہوگیا۔

یہاں آنے کے بعد وہ پہلی بار تمام دن کے لئے رخصت ہوا تھا۔ بشریٰ کو محسوس ا جیسے وہ کسی اجنبی جگہ ہے۔ وہ اس کا اپنا مکان نہیں ہے۔ گھر والا نہ ہو تو گھر اپنا یں لگتا پھر اتنے دور دراز علاقے میں جہاں ایک سے دوسرا گھر نہ ہو' ایک سے سرا آدمی نہ ہو تو اپنے شوہر کی ذات میں ہی ساری دنیا مل جاتی ہے۔

وہ بچوں کی دنیا میں تمام دن خود کو بہلاتی رہی۔ دوپہر کے بعد کام چھوڑ چھاڑ کر ر سے باہر نکلتی تھی اور دور تک نظریں دوڑاتی تھی پھر دل کو تسلی دیتی تھی۔ اٹھارہ س جانا ہے' اٹھارہ کوس آنا ہے پھر ڈاک خانے میں مصروفیت رہے گی۔ اتنی جلدی ے آسکتے ہیں۔ شام تک ضرور آجائیں گے۔

شام کے وقت اسے بیل گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ پیچھے مویشیوں کے باڑے میں چارہ ڈال رہی تھی۔ اس لئے فوراً ہی نہ آسکی۔ جب وہاں سے مکان کے سامنے والے حصے میں آئی تو بیل گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ کسان مکان کے اندر چلا گیا تھا۔ اس نے بیلوں کو گاڑی سے کھولا۔ انہیں چارے سے لگایا پھر مکان کے اندر آئی۔ وہ کرسی پر بیٹھا سامنے والی دیوار کو تک رہا تھا۔ اس کے آنے پر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی' سامنے ہی ایک درمیانی میز پر بچوں کے لئے کھلونے' بسکٹ کے ڈبے' ٹافیاں اور کچھ پھل رکھے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا ریڈیو بھی تھا۔ بیوی اور بچوں کے لئے کچھ ریڈی میڈ کپڑے بھی لے کر آیا تھا۔ بشریٰ خوش ہو کر انہیں دیکھنے لگی اور پوچھنے لگی۔

"یہ کتنے میں لائے ہو؟ ریڈیو بہت اچھا ہے۔ یہاں سناٹا رہتا تھا۔ اب گانے کی آواز آیا کرے گی۔" وہ بولتی رہی۔ اس دوران اسے احساس ہوا کہ خود بول رہی ہے مگر وہ نہیں بول رہا ہے۔

اس نے گھوم کر اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح گم صم کرسی پر بیٹھا ہوا سامنے والی دیوار کو یوں تک رہا تھا جیسے دیوار کی اجلی سطح پر کوئی تصویر نظر آرہی ہو۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا۔ خاموش کیوں ہو۔ امی کو خط لکھ دیا؟"

اس نے انکار میں سرہلایا۔ ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ "میں بستی گیا تھا۔ سوچا تھا' خط لکھوں گا لیکن ڈاک خانے میں پوسٹ کارڈ ختم ہو گئے تھے۔ ٹکٹیں تھیں مگر لفافے نہیں تھے۔ چھوٹے چھوٹے سے علاقوں کے ڈاک خانوں میں یہی ہوتا ہے۔ میں نے ٹکٹیں خرید لیں۔ پھر خط لکھا۔ اس کے بعد لفافہ خریدنے کے لئے بازار میں پہنچا تو بچوں کے لئے یہ سامان خرید لیا۔ ایک دکان میں ریڈیو دیکھ کر خیال آیا' ہم تمام دنیا سے کٹ گئے ہیں۔ ایسے علاقے میں پہنچ گئے ہیں جہاں ہمارے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ہم کسی کی آواز نہیں سن سکتے ہیں۔ ہم نے مدتوں سے کوئی گیت بھی نہیں سنا ہے۔ اس لئے میں یہ ریڈیو خرید کر لے آیا۔"

"اچھا کیا۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کی بہت ضرورت تھی۔ میرے پاس کپڑے بھی نہیں تھے۔ میں ابھی پہن کر دیکھوں گی۔ بچوں کو بھی پہناؤں گی۔ میرا خیال ہے۔ ناپ صحیح ہو گا۔"

وہ جیسے اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر بولا۔ "جب میں

بازار سے سامان خرید رہا تھا تو ہمارے گاؤں کا ایک آدمی مل گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ بھائی! تم کہاں ہو۔ اپنا گاؤں چھوڑ کر ایسے گئے کہ اپنا نیا پتا ٹھکانہ بھی نہیں دیا۔ تمہارے لئے ایک بری خبر ہے۔ میں نے پوچھا۔ بھئی کیا خبر ہے۔ اس نے آہستگی سے جواب دیا تمہاری امی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

میں اس کی یہ بات سن کر چند لمحوں تک چپ رہا جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کب انتقال ہوا۔ کیسے انتقال ہوا لیکن میری زبان نہیں ہل رہی تھی یا پھر مجھے کوئی لفظ یاد نہیں آرہا تھا کہ کوئی بات کن الفاظ میں دریافت کی جاتی ہے۔ اس نے خود ہی بتایا۔ تمہاری امی سخت بیمار تھیں۔ علاج ہوتا رہا تھا مگر فائدہ نہیں ہوا۔ کل صبح سات بجے کے قریب آخر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔"

وہ یکبارگی کرسی سے اٹھ کر چیختے ہوئے بولا۔ "سنا تم نے؟"

بشریٰ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کل صبح تقریباً سات بجے امی کی موت واقع ہوئی۔ ٹھیک اسی وقت میں نے ایک خوشۂ گندم کو کاٹا تھا اور امی کی کراہ سنی تھی۔"

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اپنی ماں کو مار ڈالا ہے۔ اگر میں اس خوشۂ گندم کو نہ کاٹتا تو وہ زندہ رہتیں۔ شاید علاج سے افاقہ ہوتا پھر وہ صحت یاب ہو جاتیں؟"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم نے فصل کاٹی ہے۔ کسی کی جان نہیں لی ہے۔ یہ محض تمہارا وہم ہے۔"

"وہم نہیں ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔ "یہ وہم نہیں ہے۔ میں آج دو دن سے سوچ رہا ہوں۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب میری سمجھ میں آرہا ہے۔ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے' دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ جب اس کے نام کا دانہ اٹھ جاتا ہے تو کھانے والا بھی اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔"

وہ ابھی تک اس کا منہ تک رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟"

اس نے انکار میں ہولے سے سرہلایا۔ وہ بولا۔ "ہم جس مکان میں پہنچ گئے ہیں' یہ دنیا کا آخری اسٹیشن ہے۔ جن کھیتوں میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ زندگی کی آخری کھیتی

ہے۔ یہاں ہر شخص کے نام کے دانے اُگے ہیں۔ جن کے دن پورے ہونے والے ہیں' ان کے نام کے دانے ذرا کچے رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے میں نے ان کھیتوں میں دیکھا ہے' اگر ایک خوشۂ گندم پوری طرح پکا ہوا ہے تو دوسرے خوشے کے دانے ابھی کچے نظر آتے ہیں۔ میں نے ایسے خوشوں کو کاٹا ہے جو پکے ہوئے تھے۔ وہ دانے اس دنیا سے اٹھنے والے تھے۔ میری امی کی طرح جانے کتنے لوگ ان خوشوں کے کٹنے کی وجہ سے مرچکے ہیں۔ میں قاتل ہوں۔ بشریٰ میں ان سب کا قاتل ہوں۔ اپنی ماں کا بھی قاتل ہوں۔"

"چپ ہوجایئے۔ آپ خواہ مخواہ اپنے آپ کو الزام دے رہے ہیں۔ آپ یہی تو کہنا چاہتے ہیں کہ جن کے نام کے دانے اٹھنے والے ہوتے ہیں وہ پک جاتے ہیں اور پکی ہوئی فصل ہمیشہ کاٹی جاتی ہے۔ اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟"

"میں جانتا ہوں' یہ تقدیر کے کھیل ہیں۔ جنہیں مرنا ہے' وہ مریں گے جس کا دانہ اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے وہ بھی ضرور اٹھ جاتا ہے۔ ہم کسی کو روک نہیں سکتے لیکن میری امی کے حصے کا دانہ میرے ہاتھوں سے اٹھا۔ میں نے اس خوشے کو اپنے ہاتھوں سے کاٹا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا اور وہ مرجاتیں تو مجھے ان کی موت کا صدمہ تو ہوتا مگر مجھے اپنے مجرم ہونے کا احساس نہ ہوتا۔"

"آپ نے فصل کاٹی ہے۔ کسی کی جان نہیں لی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ آپ نے کل صبح اپنی امی کی کراہ سنی اور آپ کو اطلاع ملی کہ اسی وقت آپ کی امی کا انتقال ہوا تھا۔ آپ یقین کریں۔ یہ محض اتفاق ہے۔"

وہ چیخ کر بولا۔ "یہ اتفاق نہیں ہے۔ میں نے جب بھی فصل کاٹی ہے' کسی نہ کسی کی کراہ ضرور سنی ہے۔ یوں محسوس ہوا ہے' جیسے میرے سامنے اس کا دم نکل گیا ہے لیکن وہ مرنے والا مجھے نظر نہیں آیا۔ اب میری سمجھ میں آرہا ہے' اس دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں وہ شخص مارا گیا' جس کے نام کا دانہ میرے ہاتھوں یہاں سے کٹ گیا ہے۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ بشریٰ اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ اس نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس درانتی کو دیکھ رہی ہو۔"

وہ درانتی بستر کے سرہانے دیوار کی ایک کیل سے لٹک رہی تھی۔ وہ اپنے دونوں

بازو آگے کی طرف پھیلا کر بولا۔ "بشریٰ! کسان کے دو ہاتھ نہیں ہوتے۔ کسان کے ہمیشہ تین ہاتھ ہوتے ہیں۔ اس کا تیسرا ہاتھ درانتی ہے۔ وہ اپنے دو ہاتھوں سے محنت کرتا ہے' اور تیسرے ہاتھ سے ساری دنیا کو تین وقت کی روٹیاں کھلاتا ہے۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا پھر بے اختیار انکار میں سر ہلانے لگا۔ جیسے موجودہ زندگی سے انکار کررہا ہو پھر اس نے کہا۔ "ہائے تقدیر ہمیں کس مقام پر لے آئی ہے۔ میں تیسرے ہاتھ سے موت کی فصل کاٹ رہا ہوں۔"

وہ گم صم کھڑی ہوئی اپنے شوہر کا منہ تک رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' جواب میں کیا کہے۔ اچانک وہ گھوم کر بولا۔ "ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔ سامان باندھو اور گاڑی میں رکھو۔"

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "میں نے بیلوں کو کھول دیا ہے۔"

"تم سامان باندھو۔ میں گاڑی تیار کرتا ہوں۔"

"ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"بشریٰ ضد نہ کرو۔ یہاں موت ہے۔"

"موت کہاں نہیں ہے؟" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "ہم جہاں بھی جائیں گے وہاں ہمارے حصے کا دانہ ہوگا اور ہمارے حصے کی موت بھی ہوگی۔"

وہ فوراً ہی جواب نہ دے سکا۔ سوچنے لگا۔ بشریٰ نے کہا۔ "یہاں ہمیں تین وقت کی روٹیاں مل رہی ہیں۔ دوسری جگہ جائیں گے تو پتا نہیں کیا ہوگا۔ ہمارے بچے پھر بھوکے مرنے لگیں گے۔ میں انہیں بھوکا نہیں دیکھ سکتی۔ یہاں یہ کتنے خوش ہیں۔ چند ہی دنوں میں کھلے ہوئے پھول کی طرح شاداب ہوگئے ہیں۔ ان کی ہنسی سن کر دل مسرتوں سے بھر جاتا ہے۔ میں یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ بشریٰ نے اس کے پاس بیٹھ کر شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرو۔"

ریڈیو سے کوئی عالم تقریر کررہے تھے۔

"اور اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا جنت کے تمام میوے تمہارے لئے ہیں۔ خوب کھاؤ پیو اور عیش و آرام سے رہو۔ اپنی حوا کے ساتھ یادِ الٰہی میں مصروف رہا کرو لیکن وہ ایک دانہ ممنوع ہے۔ اس کی طلب نہ

کرنا لیکن آدم بہک گیا۔ حوا نے اسے ورغلایا اس کی طلب کے لئے بھڑکایا اور ہم نے اسے جنت سے نکال کر زمین کی پستیوں میں اتار دیا۔"

وہ سن رہا تھا لیکن سمجھ میں نہیں رہا تھا۔ اپنے تجربات سے اس حد تک سمجھ گیا تھا کہ وہ دانہ حضرت آدم کے ساتھ جنت سے یہاں آیا ہے۔ تب سے آدمی اس دانے کے سبب جی رہا ہے اور اس دانے کی وجہ سے مر رہا ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر بشریٰ کو دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بولی۔ "میں اپنے بچوں سے ان کی مسرتیں نہیں چھین سکتی۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ اللہ کے لئے یہ فیصلہ کبھی نہ کرنا۔"

اس نے بے بسی سے اپنی شریکِ حیات کو دیکھا۔ مکان کے باہر بچوں کے ہنسنے کی مترنم آواز سنائی دے رہی تھی اور وہ آواز کہہ رہی تھی۔ تم جہاں بھی جاؤ' وہاں صرف موت کی سنگدلی نہیں ہوگی بلکہ زندگی کے معصوم قہقہے بھی ہوں گے۔

وہ ہاتھ بڑھا کر بشریٰ کے آنسو پونچھنے لگا۔

اس رات گھر میں ماتمی سکون چھایا رہا۔ بچے سو گئے تھے' اس کے ساتھ ان کے ہنسنے بولنے کی صدائیں بھی سو گئی تھیں۔ بشریٰ دیر تک اس کے ساتھ جاگتی رہی پھر اسے سلانے کی کوشش کرتے کرتے خود سو گئی۔ آدھی رات کے بعد وہ بستر سے اٹھا۔ لالٹین کی لو تیز کی۔ تیز روشنی آئینے پر پڑی۔ آئینے کا عکس سامنے والی دیوار پر درانتی تک پہنچا' وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے تیسرے ہاتھ تک پہنچا۔ پھر اسے کیل سے الگ کر کے دیکھنے لگا۔ اس کے آہنی پھل پر لکھا ہوا تھا۔

"جو مجھے گرفت میں لیتا ہے' وہ دنیا کو گرفت میں لیتا ہے۔"

اب اس فقرے کے معنی کسی حد تک سمجھ میں آ رہے تھے۔ اس کا مطلب یوں بھی ہوتا تھا کہ جو اس درانتی کو اپنی مٹھی میں لیتا ہے' دنیا اس کی مٹھی میں رہتی ہے اور یہ سچ ہے۔ ابتدا ہی سے یہ دنیا کسانوں کی محنت پر انحصار کرتی ہے۔ گویا کسانوں کی مٹھی میں رہتی ہے۔ وہ محنت کرتے ہیں تو کھانا ملتا ہے۔ محنت نہ کریں تو؟

تو پھر موت کی فصل کاٹتے ہیں' جیسے وہ کاٹ رہا تھا۔

☆======☆======☆

سورج چمک رہا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ دور تک کھیتوں میں پکی ہوئی فصل لہلہا رہی تھی۔ وہ جان بوہر کی قبر کے پاس کھڑا ہوا تھا اور زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔ "میں سمجھ گیا۔ جب تم زندہ تھے تو تمام زندگی ان کھیتوں میں کام کرتے رہے تھے۔ کیوں کہ ہمارا کام ہی کھیتوں میں کام کرنا ہے۔ جب تم فصل کاٹتے کاٹتے اس خوشۂ گندم تک پہنچے جو تمہارے نام کا تھا اور جب تم نے اسے کاٹا تو تمہیں معلوم ہوگیا کہ اب تم مرنے والے ہو۔ تم نے اس خوشے کو اپنی مٹھی میں تھامے رکھا۔ کھیت سے نکل کر اس مکان میں آئے۔ وہاں تم نے ماتمی لباس پہنا۔ آئندہ آنے والے کے نام ایک وصیت نامہ لکھا اور اپنے بستر پر جا کر آرام سے لیٹ گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں وہاں پہنچتا تم دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کیوں میرے کسان دوست' یہی بات ہے نا؟"

وہ ایک ذرا توقف کے بعد بولا۔ "ہاں یہی بات ہے۔ تم سے پہلے یہاں ہندو کسان تھا۔ اس نے تمہارے نام یہ سب کچھ کیا۔ تم نے میرے نام کیا ہے اور ایک دن میں بھی یہ فصل کاٹتے کاٹتے اس خوشۂ گندم تک پہنچوں گا جو میرے نام کا ہوگا اور میں بھی شاید اسی طرح کسی آنے والے کے نام وصیت لکھ کر رخصت ہو جاؤں گا۔ یہاں کا کاروبار اسی طرح چلتا ہے۔ یہاں سے رخصت ہونے والا اتنی بڑی دنیا کو آنے والے کے نام کر جاتا ہے تاکہ آنے والا جب تک زندہ رہے' موت کی فصل کاٹتا رہے۔"

اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی درانتی کو دیکھا پھر کہا۔ "میں نے سوچا تھا' میں فصل نہیں کاٹوں گا۔ کسی کی موت کا الزام نہیں لوں گا لیکن موت تو برحق ہے' وہ آتی ہے۔ کبھی وقت پر آتی ہے اور کبھی بے وقت آتی ہے اور کبھی خود آتی ہے اور کبھی کسی اور کو موت کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔ میں جو زندگی کی فصل اگاتا تھا' آج موت کی فصل کاٹ رہا ہوں۔ تقدیر کو یہی منظور ہے تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔"

وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا کھیتوں میں آیا۔ گندم کے سنہرے چمکیلے خوشے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے' میں اپنا تیسرا ہاتھ نہ بھی استعمال کروں' تب بھی یہ حقیقت ہے کہ پھل پکنے کے بعد اپنی شاخ سے ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔"

ہر چیز کے پکنے اور جھڑنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آدمی کی عمر بھی جب آخری حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ اس دنیا سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ پھل خود

پک کر ٹوٹ جاتے ہیں اور کچھ توڑ لئے جاتے ہیں۔ موت وقت پر ہو یا بے وقت آخر موت ہوتی ہے۔

وہ درانتی کو مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گیا پھر پکی ہوئی فصل کو کاٹنے لگا۔ سپاہی تلوار چلانے کا اور کسان درانتی چلانے کا ماہر ہوتا ہے۔ دن بھر اس کا تیسرا ہاتھ چلتا رہا۔ فصلیں کٹتی رہیں اور کٹتی چلی گئیں۔ رات کو ریڈیو نے اس کا انجام سنایا۔ "فلسطین میں ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے۔ ہزاروں بے گھر ہو گئے اور پناہ کی تلاش میں دوسرے ملکوں کی سرحدیں پار کرنے لگے۔ مہاجرین کے قافلوں پر حملے ہوئے۔ سینکڑوں مسلمان مارے گئے۔"

اب اس کسان کے لئے دن تھا اور رات تھی۔ دن کے وقت وہ فصل کاٹتا تھا۔ رات کو ریڈیو سے صدا سنائی دیتی تھی۔ "سابقہ مشرقی پاکستان میں بہاریوں نے بنگالیوں کو قتل کیا۔ بنگالیوں نے ہزاروں بہاریوں کو انتقاماً مار ڈالا"۔

دن کے وقت فصل کاٹی جارہی تھی۔ رات کے وقت صدائیں آتی جارہی تھیں۔ "لبنان میں ہزاروں انسان بے موت مارے جارہے ہیں۔"

دن کو درانتی چلتی تھی۔ رات کو ریڈیو چیختا رہتا تھا۔ ایران' عراق جنگ میں ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے۔ عجیب بات تھی۔ دونوں طرف سے جہاد کا دعویٰ تھا۔ اِدھر سے جہاد کرنے والے بھی شہید ہو رہے تھے اور اُدھر کے جہاد کرنے والے بھی شہادت کا درجہ پارہے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کو مار کر شہادت کا اعزاز حاصل کر رہے تھے۔

وہ فصل کاٹ رہا تھا لیکن کسی سے یہ تو نہیں کہہ رہا تھا کہ حرام موت مر جاؤ۔ وہ تو ایک انسانی تاریخ مرتب کر رہا تھا بتا رہا تھا کہ انسان کس طرح غیر انسانی طریقوں سے ایک دوسرے کو ہلاک کر رہا ہے۔ موت ضرور آئے گی لیکن انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ فلسطین' لبنان' بنگلہ دیش' ایران اور عراق کے بہانے موت کا بازار گرم کرے۔ موت کے برحق ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ موت کے ٹھیکے دار بن جائیں۔

وہ تیسرا ہاتھ یقیناً موت کی فصل کاٹے گا۔ اس میں اس کا قصور اس لئے نہیں ہے کہ جن کا دانہ اٹھنے والا ہے' ان کے دانے وقت سے پہلے ہی بے وقت پک جاتے

ہیں۔ فصل کٹنے کو تیار رہتی ہے۔ اس لئے تیسرا ہاتھ کاٹ دیتا ہے۔ اگر امن اور سلامتی رہے اور جنگ کے بہانے تلاش نہ کئے جائیں تو وہ خوشۂ گندم بے وقت پک کر کٹنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوں۔

وہ کاٹتے کاٹتے ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ یکبارگی اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر کھیتوں سے ذرا دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گھبرا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ "آہ' یہ کیا کر رہا ہوں۔ اتنے دنوں تک یہ فصل کاٹنے کے دوران یہ بھول ہی گیا تھا کہ ان میں میری بشریٰ کے نام کے' میرے منّو کے نام کے' میری مانو کے نام کے دانے ہوں گے اور میں انہیں اپنے ہاتھوں سے کاٹ ڈالوں گا۔ نہیں نہیں' میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

وہ کھیتوں سے دور بھاگنے لگا۔ "نہیں نہیں' میرے بچے ابھی جوان ہوں گے۔ ابھی دنیا دیکھیں گے۔ ابھی بہت سی مسرتیں حاصل کریں گے۔"

وہ گھر کی طرف بھاگ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ میری بشریٰ میری زندگی' میری محبت' میری کھیتی' میں اسے نہیں مار سکتا۔ وہ مر جائے گی تو میرا سب کچھ مر جائے گا۔ میرے خدایا! میرے تیسرے ہاتھ کو موت کا ہاتھ نہ بنا۔ محنت کا ہاتھ بنا دے۔"

وہ گھر کی دہلیز پر آ کر گر پڑا۔ بشریٰ دوڑتی ہوئی آئی پھر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟ خیرت تو ہے؟"

وہ ہانپ رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔ اس کا بدن گرم ہو رہا تھا بشریٰ نے کہا۔ "تمہیں تو بخار ہے۔ آؤ اندر آ کر بستر پر لیٹ جاؤ۔"

وہ چیخ کر بولا۔ "مجھے بخار نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں مگر اندر سے بیمار ہوں۔ مجھے انسانیت کی بیماری لگ گئی ہے۔ مرنے والوں کو موت کی خبر نہیں ہوتی مگر میں ان کی موت سے پہلے روتا ہوں۔ میں جلاد ہوں مگر میں انسان ہوں۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ عام طور پر جلاد کے متعلق یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ وہ سنگدل ہوتا ہے۔ ایک مشہور جلاد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک نہایت ہی رحمدل اور نرم دل انسان تھا۔ اپنے پیشے پر کڑھتا تھا کسی کو مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن مقدر میں وہی پیشہ لکھا ہوا تھا اور وہ کسان بھی اپنے مقدر کا لکھا پورا کر رہا تھا۔

بشریٰ اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آئی۔ وہ بستر پر لیٹ گیا۔ رات کو کھانے کے بعد اس نے کہا۔ "میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھتی ہوں۔ یہ کھیت جو میلوں دور تک

پھیلا ہوا ہے' اسے کب تک کاٹتے رہو گے۔ ایک طرف سے کاٹتے جاتے ہو دوسری طرف سے نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ جب تک تم کٹائی کرتے ہوئے کھیت کے آخری سرے تک پہنچو گے' تب تک ادھر نئی فصل تیار ہو جائے گی۔ تمہارا کام کبھی ختم نہیں ہو گا۔ تمہاری پریشانی ہمیشہ رہے گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "یہی میں سوچ رہا ہوں۔ میرے مقدر میں کیا لکھا ہے۔ میں یہاں کیوں آیا؟"

"ہم اپنے بچوں کے لئے آئے ہیں۔ یہاں انہیں روٹی مل رہی ہے۔ کچھ لوگوں کو اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے دوسروں کو مارنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' جب سے انسان اس دنیا میں آباد ہوا ہے تب سے ایک کی لاش پر بیٹھ کر دوسرا کھاتا ہے' خواہ وہ سوئم اور چالیسویں کا ہی کھانا کیوں نہ ہو۔"

"اب میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ تم سرکار کو اطلاع دو۔ زراعتی شعبے سے لوگ آئیں گے۔ اس کھیت میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹریکٹر چلائیں گے۔ دو ہی دن میں ساری فصل کاٹ کر رکھ دیں گے۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا پھر وحشت سے دیکھتا ہوا بولا۔ "نہیں نہیں' میں کسی کو اطلاع نہیں دوں گا۔ میں اس کھیت میں کسی کو جانے نہیں دوں گا۔ کوئی اپنے ہاتھ میں درانتی لے کر اس فصل کو نہیں کاٹے گا۔"

"کیوں نہیں کاٹے گا؟ تم خود کاٹنا نہیں چاہتے۔ دوسروں کو کاٹنے نہیں دو گے۔ آخر کیوں؟"

"اوہ بشریٰ! یہ کیوں بھولتی ہو کہ وہ زندگی کی کھیتی ہے۔ وہاں تمہارے نام کے اور میرے بچوں کے نام کے خوشے بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے' ابھی کچے ہوں۔ کسی دن کٹائی کے لئے ایک دم پک کر تیار ہو جائیں۔ کسی نے انہیں کاٹ ڈالا تو کیا ہو گا۔ نہیں ہرگز نہیں' میں کسی کو اس کھیت میں قدم رکھنے نہیں دوں گا اور خود بھی یہ تیسرا ہاتھ استعمال نہیں کروں گا۔"

"تم جو چاہو' وہی کرو مگر زیادہ نہ بولو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سونے کی کوشش کرو۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے دن وہ کھیت میں گیا لیکن اس کے ہاتھ میں درانتی نہیں تھی۔ وہ ایک طرف سے چلتا ہوا اس کھیت کے ایک ایک خوشۂ گندم کو یوں تکنے لگا جیسے ان میں اپنی بشریٰ اپنے بچوں کا چہرہ ڈھونڈ رہا ہو۔ معلوم کر رہا ہو کہ کون سا خوشۂ گندم اس کی محبت اور اس کے خون کے رشتوں کے نام ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر بڑی دیر تک گھومتا رہا۔ یہاں سے وہاں تک گندم کی سنہری بالیوں کو تکتا رہا لیکن سراغ نہ لگا سکا۔ تھک ہار کر واپس آگیا۔

وہ چاہتا تھا' کسی طرح سراغ مل جائے۔ ان تینوں کے نام کے خوشۂ گندم کا پتا چل جائے۔ پھر وہ ان کی حفاظت کرے گا۔ درانتی اس طرف نہیں لے جائے گا۔ دوسری طرف فصل کاٹتا چلا جائے گا لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ کون سا خوشۂ گندم کس کے نام ہے؟

وہ دو دن تک کھیتوں میں نہیں گیا۔ دو دن تک اس نے کٹائی نہیں کی۔ دو دن تک اس دنیا میں موت اور زیست کا فیصلہ کس طرح ہو رہا ہو گا؟ شاید اس طرح کہ لبنان میں خونریزی تھم گئی۔ فلسطین کے مسلمان صرف بھٹک رہے ہیں۔ موت ابھی ان کے قریب نہیں آ رہی ہے۔ بنگلہ دیش میں امن قائم ہو گیا۔ فلسطینی کیمپوں میں چلے گئے ہیں اور شاید ایران اور عراق کے درمیان عارضی جنگ بندی ہوئی ہے۔ شاید وہ کسی فیصلے تک پہنچنا چاہتے ہیں اور وہ کسان بھی کسی فیصلے تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ دور ہی دور سے کھیتوں کو دیکھتا رہتا ہے اور سوچتا رہتا ہے۔

دنیا کا کام کبھی نہیں رکتا۔ اگر رکتا ہے تو قدرت کسی نہ کسی بہانے پھر اسے جاری کر دیتی ہے۔ اس کسان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ کھیتوں کی طرف ٹہلنے کے لئے گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ پھر کسی خوشے میں اپنی بیوی بچوں کا نام تلاش کرے۔ ایسے وقت خیال آیا' شاید اللہ تعالیٰ نے انہیں لمبی عمر دی ہے۔ لمبی عمر پانے والوں کے خوشۂ گندم کھیت کے آخری سرے میں ہیں۔ وہاں پہنچتے پہنچتے کافی دن لگ جائیں گے۔ کیوں نہ وہاں جا کر ان خوشوں کا سراغ لگایا جائے۔

وہ تیزی سے ادھر جانے لگا۔ خیال یہ تھا کہ وہ ایک ایک خوشے کو مٹھی میں جکڑ کر زور زور سے ہلائے گا۔ جو خوشے اس کی بشریٰ' منٹو اور مانو کے نام کے ہوں گے۔ انہیں مضبوطی سے تھام کر جھنجوڑنے کا اثر ان پر بھی ضرور ہو گا۔ پھر وہ گھر جا کر پوچھے

گا۔ بتاؤ' آج کوئی تکلیف یا پریشانی ہوئی تھی؟

مگر یہ حماقت ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ وہ روز بشریٰ' منٹو اور مانو کو لے کر کھیت کے آخری حصے میں آیا کرے اور ایک ایک خوشۂ گندم کو آزمایا کرے۔ اس طرح وہ قریب ہوں گے تو اس آزمائش کا ردِ عمل ان پر ضرور ہوگا۔

آدمی جب اپنوں کی محبت میں ڈوب کر ان کی سلامتی کے لئے جتن کرتا ہے تو اسی طرح سوچتا چلا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہوا کھیت کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ اسی وقت اس نے پلٹ کر دیکھا' اسے شعلے نظر آئے۔ دور بہت دور آگ لگی ہوئی تھی۔

وہ پریشان ہو کر دوڑنے لگا۔ جدھر آگ نظر آ رہی تھی' ادھر مکان تھا۔ اگرچہ وہ درختوں کے جھنڈ میں وہاں سے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن بہت دور تک بھاگتے رہنے کے بعد اس نے دیکھا' واقعی مکان میں آگ لگ گئی تھی شعلوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے چیخنے لگا۔ بشریٰ! میری بشریٰ' میرے بیٹے منٹو! میری گڑیا مانو! میں آ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں۔"

وہ تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ شعلے بلند سے بلند تر ہو رہے تھے۔ وہ بہت دور تھا اور شعلے مکان سے بہت قریب تھے۔ مکان سے لگے ہوئے تھے بلکہ مکان کے اندر پہنچے ہوئے تھے۔ جب وہ قریب پہنچا تو کہیں سے مکان کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیں تھا۔ وہ چاروں طرف دوڑنے لگا۔ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو آوازیں دینے لگا۔ کہیں سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

وہ اپنی بشریٰ اور اپنے بچوں کی خاطر آخری سانس تک جدوجہد کر سکتا تھا۔ انہیں سلامت رکھنے کے لئے دکھ بیماریوں کے باوجود دن رات کھیتوں میں کام کر سکتا تھا لیکن شعلوں سے گزر کر جلتے ہوئے مکان کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ جان بوجھ کر جان دینا سب سے بڑی حماقت ہوتی ہے۔ وہ جان دے کر بھی انہیں نہیں بچا سکتا تھا۔ ہاں' اگر مکان کے اندر سے جواباً ان کی آواز سنائی دیتی۔ زندگی کے آثار پائے جاتے تو وہ شعلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاتا۔ ان کے ساتھ جل مرتا یا پھر انہیں وہاں سے نکال لاتا۔

لیکن جلتے ہوئے مکان کے اندر زندگی کے آثار نہیں تھے۔ کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ جب مکان شعلوں کی لپیٹ میں آیا ہوگا تو جلنے والوں نے اپنے بچاؤ کے

لئے چیخ وپکار کی ہوگی لیکن اس وقت وہ کسان ان سے بہت دور تھا۔ اتنی دور کہ ان کی چیخ وپکار بھی سنائی نہیں دی تھی اور اب وہاں سناٹا تھا۔ صرف مکان کے جلنے' شعلوں کے لپکنے اور ہواؤں کے تیز تیز سانس لینے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک دیوانہ وار چاروں طرف دوڑتا رہا۔ پیچھے کھلیان تک آگ نہیں پہنچی تھی مگر گھر کو تو پوری طرح لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پھر وہ غصے سے دوڑتا ہوا کھیتوں کی طرف جانے لگا۔ بہت دور تک دوڑنے کے بعد ایک جگہ رک گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ درانتی کے ایک ہی وار سے تمام فصل کاٹ کر پھینک دے۔ اس نے ایک خوشۂ گندم کو کاٹنا چاہا تھا۔ اچانک ہی خدشہ پیدا ہوا کہ جس خوشۂ کو اس نے مٹھی میں جکڑ رکھا ہے' وہ شاید بشریٰ کے نام کا ہو' منٹو کے نام کا ہو یا گڑیا جیسی پیاری پیاری مانو کے نام کا ہو۔ اس کے ہاتھ سے وہ چھوٹ گیا۔ ایک نئے خیال نے تیزی سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے پلٹ کر جلے ہوئے مکان کی طرف دیکھا۔

"ہاں' میں نے پچھلے دو دنوں سے کٹائی نہیں کی ہے ایک خوشے کو بھی یہاں سے کاٹ کر الگ نہیں کیا ہے۔ پھر میری بشریٰ' میرے بچے کیسے مر سکتے ہیں۔ اس دنیا سے ابھی ان کا دانہ نہیں اٹھا ہے۔ وہ زندہ ہیں یقیناً زندہ ہیں۔"

پھر وہ آہستہ آہستہ مکان کی طرف جانے لگا۔ اب شعلے دھیمے پڑ رہے تھے۔ پہلے جیسی تیزی اور پھیلاؤ نہیں رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا' بشریٰ اور بچے اس جلتے ہوئے مکان کے اندر نہیں ہیں۔ مکان میں آگ لگتے ہی وہ بچوں کو لے کر دور کہیں چلی گئی ہے۔ تاکہ وہ سب آگ سے محفوظ رہیں۔ یقیناً مکان کے پچھواڑے گئی ہوگی۔

وہ تیزی سے دوڑتا ہوا مکان کے پاس آیا۔ پھر وہاں سے گزرتا ہوا پچھلے حصے میں گیا۔ کھلیان کو پار کرنے کے بعد اس نے دور گھنے جنگل کو دیکھا۔ شاہ بلوط کے بے شمار درخت دور دور تک نظر آ رہے تھے۔ وہ چیختا ہوا' اپنے بچوں کو پکارتا ہوا' بشریٰ کو صدائیں دیتا ہوا تیزی سے دوڑنے لگا۔ درختوں کے جھنڈ میں اِدھر سے اُدھر بھٹکنے لگا۔ بشریٰ ایک ماں ہے۔ اپنے بچوں کو آگ کے شعلوں سے بہت دور لا کر کسی درخت کے سائے میں بیٹھی ہوگی۔

لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ بار بار صدائیں دینے کے باوجود کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ تھک ہار کر واپس آنے لگا۔ اس وقت تک شعلے سرد پڑ چکے تھے۔ جلا ہوا مکان

نظر آرہا تھا۔ پختہ چھت اور دیواریں اپنی جگہ موجود تھیں مگر جل کر سیاہ ہوگئی تھیں۔ جہاں لکڑی کے ستون اور برآمدے میں کھپریل کی چھت تھی' وہ ستون جل گئے تھے۔ چھت جلنے کے بعد ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ کھپریل اِدھر سے اُدھر بکھر گئے تھے۔

وہ بالٹی میں پانی بھر کر رہی سہی آگ کو بجھانے لگا۔ بیرونی دروازے سے داخل ہونے کا راستہ بنانے لگا۔ آگ بجھ رہی تھی۔ وہ بالٹی بھر بھر کر پانی پھینکتا ہوا بیٹھک میں پہنچا پھر وہاں سے گزرتا ہوا اس کمرے میں آیا جہاں وہ ہر رات اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سویا کرتا تھا۔

اس کی بیوی' اس کے بچے بستر پر سو رہے تھے۔ دونوں بچے اپنے الگ بستر پر آنکھیں بند کئے پڑے ہوئے تھے۔ جیسے گہری نیند میں ہوں۔ بشریٰ اپنے بستر پر نیم دراز تھی۔ پیچھے دیوار سے ٹیک لگائے نصف بیٹھی ہوئی تھی' نصف لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے آنے والے کا انتظار کررہی ہو اور آنے والا آگیا تھا۔

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "بشریٰ! مکان جلتا رہا اور تم بچوں کے ساتھ یہاں پڑی رہیں۔ تم باہر کیوں نہیں آئیں؟ تم خیریت سے تو ہو؟"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے عجیب و غریب منظر دکھائی دے رہا تھا۔ پہلی نظر میں اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ اب توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس مکان کی ہر چیز جل کر راکھ ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ وہ بستر بھی جل گئے تھے۔ بشریٰ اور بچوں نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ بھی جل گئے تھے' سیاہ پڑ گئے تھے۔ ہر چیز سیاہ پڑ گئی تھی۔ آگ لگنے سے پہلے لباس کا جو ڈیزائن تھا اور لباس میں جو شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ڈیزائن اور شکنیں تمام کی تمام اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اب ان کے جسموں پر سوتی یا ریشمی لباس نہیں رہا تھا بلکہ لباس کی صورت میں راکھ رہ گئی تھی۔

وہاں کی ہر چیز جل کر راکھ ہوگئی تھی۔ صرف چھت اور دیواریں سلامت تھیں کیونکہ وہ ٹھوس اور سخت تھیں۔ بشریٰ' منو اور مانو کے جسم محفوظ تھے کیونکہ ان میں مقدر کی سختی تھی۔ ان کے نام کے دانے ابھی اس دنیا سے نہیں اٹھے تھے۔ جسے قدرت رکھتی ہے' اسے آگ بھی نہیں جلاتی ہے۔ جلانا چاہو تو آگ گلزار بن جاتی ہے۔ وہاں آگ گلزار تو نہیں بنی تھی' راکھ ہوگئی تھی مگر جسم اسی طرح محفوظ تھے جیسے آتشِ نمرود

میں محفوظ رہا تھا۔

وہ کمرے میں آیا۔ بشریٰ کے قریب پہنچا۔ پھر اس نے آواز دی۔ "تم چپ کیوں ہو۔ یہ سب کیا ہے کچھ تو بولو؟"

وہ اسی طرح ساکت تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں دروازے کو تک رہی تھیں۔ شاید وہ مرچکی تھی۔

مگر نہیں' اس کے سینے میں ہلکی ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔ چہرے پر بھی وہی زندگی کی تازگی تھی۔ وہ مری نہیں تھی زندہ تھی۔

وہ دوڑتا ہوا بچوں کے بستر کے پاس گیا۔ وہاں بھی بچوں کی سانس چل رہی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کئے پڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی زندہ تھے۔ اس نے آواز دی۔ "میری گڑیا! میری جان مانو! دیکھو تمہارے ابا آئے ہیں۔ آنکھیں کھولو۔ میں تمہارے لئے ٹافی لایا ہوں' بسکٹ لایا ہوں' کھلونے لایا ہوں۔ منو! میرے بیٹے! تم چپ کیوں ہو؟ تم سانس لے رہے ہو۔ تم زندہ ہو' بولو' بیٹے؟"

وہ دیر تک آوازیں دیتا رہا۔ پھر وہاں سے دوڑتا ہوا بشریٰ کے پاس آیا۔ اس نے اس کی کلائی تھام لی نبض بہت سست چل رہی تھی۔ جیسے وہ زندگی اور موت کے درمیان ہو' لڑ رہی ہو' زندگی کی طرف واپس آنا چاہتی ہو۔ موت اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ اس نے ہولے سے ہاتھ کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "بشریٰ! کچھ تو کہو۔"

ہولے سے جھنجھوڑنے کے باعث ذرا سا جھٹکا لگا۔ ہاتھ بستر میں ذرا سا دھنس گیا۔ کیونکہ وہ بستر اور اس پر بچھی ہوئی چادر رکھ ہی راکھ تھی اس لئے ہاتھ ذرا دھنس گیا تھا۔ اس کے لباس سے بھی ذرا سی راکھ جھڑ گئی تھی۔ وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے دماغ نے سمجھایا۔ اگر وہ اسے جھنجھوڑے گا' اسے زیادہ حرکت دے گا تو راکھ جھڑنے لگے گی۔ نہیں' اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہئے دور ہی سے مخاطب کرنا چاہئے' دور ہی سے انہیں زندگی کی طرف واپس لانے کی کوئی تدبیر کرنی چاہئے۔

وہ بے بسی سے کبھی بشریٰ کو' کبھی بچوں کو تکنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "تم سب جنم کی اس آگ میں جلتے رہے ہو۔ تمہارے حلق خشک ہوگئے ہوں گے۔ تم لوگوں کو پیاس لگ رہی ہوگی کیا میں پانی پلاؤں؟"

وہ وہاں سے کچن کی طرف گیا۔ وہاں بھی ہر چیز خاک ہو چکی تھی۔ مٹکا محفوظ تھا۔ اسے کھول کر دیکھا تو پانی گرم ہو رہا تھا۔ وہ باہر آیا۔ پیچھے کھلیان کے پاس کنواں تھا۔ اس نے کنویں سے ٹھنڈا پانی نکالا۔ پھر ایک گلاس میں لے کر بشریٰ کے پاس آیا۔ اس کے ہونٹ ذرا سے کھلے ہوئے تھے۔ اس نے گلاس کو ہونٹوں سے لگا کر کہا۔ "پانی پیو۔"

وہ چپ تھی۔ حرکت نہیں کر رہی تھی۔ زبان تک نہیں ہل رہی تھی۔ پھر وہ پانی کیسے پیتی؟

وہ کچن سے ایک چمچ لے آیا۔ اس چمچ سے پانی لے کر اس کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالنے لگا۔ اس کے بعد ذرا قریب جھک کر دیکھنے لگا۔ پانی منہ سے گزر کر حلق سے اتر رہا تھا اس وقت زبان نے بھی ذرا سی حرکت کی تھی۔ وہ پانی کو نگلنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن تعجب تھا کہ جسم ساکت تھا۔ صرف وہ حصے حرکت کر رہے تھے جو زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کافی ہوتے ہیں مثلاً دل دھڑک رہا تھا۔ سینہ سانس کی وجہ سے ہولے ہولے لرزیدہ تھا۔ جب پانی پینے کا وقت آیا تو زبان نے بھی ساتھ دیا تاکہ زندگی برقرار رہے۔

وہ بول نہیں سکتی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے بولنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ کتنے ہی کیڑے مکوڑے زندہ رہتے ہیں مگر کبھی منہ سے آواز نہیں نکالتے۔

اس کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہاں سے وہ آنکھیں گھوم کر کسی دوسری طرف نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ زندہ رہنے کے لئے دیکھنا ضروری نہیں ہے چمگادڑ کی آنکھیں نہیں ہوتیں مگر وہ زندہ رہتی ہے۔

وہ حرکت نہیں کر رہی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے حرکت کرنا ضروری نہیں ہے۔ درختوں میں بھی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے لیکن زمین سے' ہوا سے' بارش سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ ان میں نمو کی قوت ہوتی ہے۔ اسی طرح بشریٰ اور بچوں کے جسم میں نمو کی قوت تو تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے تھے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ "خدایا یہ کیسی زندگی ہے۔ یہ کب تک ایسے رہیں گے۔ میں ان کے لئے کیا کروں۔"

فی الحال وہ اتنا ہی کر سکتا تھا کہ انہیں زندہ رکھنے کی کوشش جاری رکھتا۔ ان کے جسم میں خوراک پہنچاتا۔ خوراک پہنچانے کے سلسلے میں اس نے روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا بشریٰ کے منہ میں رکھا لیکن وہ اسے چبا نہ سکی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جبڑے حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ درخت کی طرح ساکت تھی اور صرف ہوا اور پانی یا رقیق غذا خوراک کے طور پر حاصل کر سکتی تھی۔

اس نے ان کے لئے رقیق غذا تیار کی چمچ کے ذریعے ان تینوں کے جسموں میں خوراک پہنچائی۔ وہ اسی طرح انہیں خوراک پہنچاتا۔ جب تک زندہ رہتا' انہیں زندہ رکھنے کی کوشش کرتا رہتا۔ جس طرح کسی اپاہج کو ایک جگہ بٹھا کر ساری عمر کھلایا پلایا جاتا ہے اور اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے' اسی طرح وہ بھی کرتا رہتا لیکن وہ تینوں کب تک اس حالت میں رہتے۔ کیا ان پر سکتہ طاری تھا یا وہ سکرات کے عالم میں تھے؟

وہ جیسے بھی تھے' زندگی اور موت کی درمیانی حالت میں تھے اور ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ کوئی حادثے کا شکار ہو کر تڑپتا ہے۔ زندگی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ موت اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کوئی آگ کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ جل جاتا ہے۔ چہرہ جھلس جاتا ہے بدن پر آبلے پڑ جاتے ہیں۔ وہ کرب میں مبتلا رہتا ہے۔ علاج جاری رہتا ہے لیکن وہ نہ تو زندگی کی طرف جا سکتا ہے اور نہ ہی موت اسے قبول کرتی ہے کیونکہ اس دنیا میں اس کا آب و دانہ رہتا ہے۔ کوئی مہلک اور موذی مرض میں مبتلا ہو کر ایڑیاں رگڑتا رہتا ہے' کوئی سیاسی حالات کا شکار ہو کر جاں کنی کی حالت میں رہتا ہے سب انتظار کرتے رہتے ہیں۔ سب نیم خوابیدہ رہتے ہیں نہ جاگتے ہیں نہ سوتے ہیں۔ نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔ ہماری دنیا میں ہزاروں' لاکھوں اور کروڑوں افراد اسی طرح جاں کنی کی حالت میں رہتے ہیں۔ جانے اس دنیا سے کب ان کا دانہ اٹھے گا؟

وہ اس رات جاگتا رہا' سوچتا رہا' اپنے نصف زندہ اور نصف مُردہ بچوں کو دیکھتا رہا۔ اپنی اس محبت کو دیکھتا رہا جو سامنے موجود ہونے کے باوجود ایک تصویر کی طرح تھی' تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی۔ میں بات کروں گا تو یہ خاموش رہے گی۔

دوسری صبح وہ اچانک درانتی کو تھام کر تن گیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ بشریٰ کے سامنے لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "میری جان! میری محبت! میں سمجھ گیا ہوں۔ تم لوگوں کو زندگی کی طرف نہیں

لاسکتا۔ تم سب جاں کنی کی حالت میں ہو۔ ایسے میں جان نہیں آتی' جان نکل جاتی ہے۔"

اس نے بچوں کی طرف حسرت سے دیکھا پھر بشریٰ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔ مجھ کو تیرے نام سے اور بچوں کے نام سے موت کی فصل کاٹنی ہوگی۔ میں نے انکار کیا تھا اب تیسرا ہاتھ استعمال نہیں کروں گا لیکن قدرت نے مجھے مجبور کردیا۔ یہ دیکھ میں نے تیسرا ہاتھ اپنا لیا ہے۔ میں جارہا ہوں۔"

وہ وہاں سے پلٹ تیزی سے چلتا ہوا مکان کے باہر آیا۔ پھر دوڑتے ہوئے کھیتوں میں پہنچ گیا۔ آسمان پر کالے بادل چھا رہے تھے۔ سورج منہ چھپا رہا تھا۔ اس نے درانتی والے ہاتھ کو بلند کیا پھر ایک خوشۂ گندم کو مٹھی میں دبوچ کر چیختے ہوئے کہا۔ "بشریٰ میری بشریٰ یہ تیرے نام ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے اس کی جڑ کو کاٹ دیا۔ ایک کراہ سنائی دی لیکن اس نے پلٹ کر جلتے ہوئے مکان کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اپنوں میں سے کسی کی کراہ نہیں تھی۔ وہ جس طرح بشریٰ اور بچوں کی ہنسی کو جانتا تھا' اس طرح ان کے آنسوؤں اور کراہوں کو بھی پہچانتا تھا۔

اس نے دوسرے خوشۂ گندم کو مٹھی میں پکڑ کر درانتی کو بلند کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "منٹو بیٹے! یہ تیرے نام ہے۔"

اس نے اسے بھی کاٹ ڈالا۔ کراہ سنائی دی لیکن وہ جانے کس کی کراہ ہوگی جانے کس کا دانہ اس دنیا سے اٹھ گیا ہوگا۔

اس نے ایک اور خوشۂ گندم کو مٹھی میں جکڑ کر درانتی کو بلند کیا۔ پھر لرزتی ہوئی' آنسو بھری آواز میں کہا۔ "میری گڑیا! میری مانو! میں کیا کروں' میں جلاد ہوں' ایسا جلاد جس نے نادانستگی میں اپنی ماں کو ہلاک کرڈالا۔ ایسا جلاد جو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیوی اور بچوں کو موت کی آغوش میں پہنچانا چاہتا ہے۔ میری گڑیا جیسی بیٹی مجھے معاف کردے۔"

یہ کہتے ہی اس نے اس خوشۂ گندم کو بھی جڑ سے کاٹ دیا۔ کراہ سنائی دی لیکن وہ اس کی اپنی مانو کی کراہ نہیں تھی۔ پھر تو اس پر جنون سوار ہوگیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ درانتی دو دھاری تلوار کی طرح اِدھر سے اُدھر ہونے لگی۔ فصلیں

کٹنے لگیں' گرنے لگیں۔ اس کے کانوں میں جانے کیسی کیسی کراہیں شور مچا رہی تھیں۔ عارضی جنگ بندی ختم ہوچکی تھی۔ ایرانی اور عراقی لڑ رہے تھے مر رہے تھے۔ بارود کے دھماکوں سے ان کے چیتھڑے اڑ رہے تھے۔

وہ درانتی چلا رہا تھا۔ اسے یقین تھا' اسی طرح اس کی درانتی اس کا تیسرا ہاتھ ان خوشوں تک پہنچ جائے گا جو بشریٰ' منٹو اور مانو کے نام ہوں گے۔ پھر وہ اس کرب ناک زندگی سے نجات پالیں گے۔ جاں کنی سے آزاد ہوجائیں گے اور موت کی گہری ابدی آرام دہ نیند میں ڈوب جائیں گے۔ اس کے بعد وہ خود سکون سے مرسکے گا۔

اس کا تیسرا ہاتھ چل رہا تھا۔ جیسے سپاہی کی تلوار چلتی ہے۔ اِدھر سے اُدھر فصلوں کو کاٹتا جارہا تھا۔ گراتا جارہا تھا۔ وہ تھکنا نہیں جانتا تھا خود گرنا نہیں جانتا تھا۔ کسان کے ہاتھ شل نہیں ہوتے۔ محنت کے بازو ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔ ایک برس گزر گیا دو برس گزر گئے' دس برس گھر گئے۔ بنگلہ دیش کے کیمپوں میں بہاری جاں کنی کی حالت میں مبتلا ہیں۔ تیرہ برس گزر چکے ہیں انہیں بلاؤ یا ان کے لئے زہر بھیج دو۔ نہ انہیں زندہ رکھو گے نہ انہیں مارو گے تو وہ تیسرا ہاتھ چلتا جائے گا۔ فصل کاٹتا ہوا ان خوشوں تک پہنچ جائے گا جو ان بہاریوں کے نام ہیں پھر ان کے دانے اس دنیا سے اٹھ جائیں گے۔ ابھی تو وہ فصل کاٹ رہا ہے۔ کاٹ رہا ہے اور کاٹتا ہی جارہا ہے۔

اچانک ایک خوشۂ گندم کو جڑ سے کاٹتے ہی اس کے اندر سے کراہ نکلی۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ اس نے اپنے ہی نام کے خوشۂ گندم کو کاٹ ڈالا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس گندم کے خوشے کو دیکھنے لگا جو اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ اس کا دل کانپ رہا تھا اور وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے مکان کی طرف جانے لگا۔ اس مکان کے کمرے میں بشریٰ اپنے بچوں کے ساتھ اسی طرح سکتے کے عالم میں تھی۔ نہ زندہ تھی نہ مُردہ تھی۔ اس نے ان کے سامنے پہنچ کر آنسو بھری آواز میں کہا۔ "میری جان الوداع! میرے بچو! اپنے باپ کو معاف کرنا۔ میں نے دن رات محنت کی۔ دن' مہینے' سال گزار دیئے۔ جانے تم لوگوں کے نام کے خوشے کس جگہ ہیں میں اس جگہ تک نہ پہنچ سکا۔ اپنی ہی موت کی فصل کاٹ کر لے آیا۔ یہ دیکھو' میں رخصت ہورہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ جس طرح ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا اس مکان میں آیا' میرے بعد بھی کوئی آئے اور اس

تیسرے ہاتھ کے ذریعے تم لوگوں کے نام سے موت کی فصل کاٹے۔"

وہ ایک میز کے پاس گیا۔ وہاں اس نے کاغذ اور قلم لے کر وصیت نامہ لکھا۔ وہاں لیٹنے کے لئے بستر نہیں تھا۔ وہ فرش پر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ سرہانے درانتی رکھ دی۔ ایک ہاتھ میں وہی خوشۂ گندم تھا۔ دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا وصیت نامہ۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے پھر کہا۔ "میرے مالک! میرے خالق! میری دنیا کے مجبور کب تک جاں کنی کی حالت میں رہیں گے۔ خدایا انہیں نجات دے۔"

وہ چپ ہو گیا مگر اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کلمہ شہادت کا ورد کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ہونٹ بالکل خاموش ہو گئے۔ اس خانۂ خموشاں میں پھر کوئی آواز نہ رہی۔

باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ سنہرے، چمکیلے گندم کے خوشے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور ماتمی صدائیں سنا رہے تھے اور ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ مگر تین لاشیں سانس لے رہی تھیں۔ اب کوئی تیسرا ہاتھ کب آئے گا؟

☆======☆======☆